قرآن حکیم

فلسفہ حُسن وحیات

اقبال سید حُسین

غلاظتوں کی دنیا میں عظمتوں کی تلاش

Marfat.com

غلاظتوں کی دنیا میں
عظمتوں کی تلاش

قرآن حکیم

فلسفہ حُسن وحیات

اقبال سید حُسین

297.11
ع 51 ق
91242
۲

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

تاریخ اشاعت: جولائی ۲۰۱۰

ناشر: ہیومینیٹی انٹرنیشنل پبلشرز اینڈ پروموٹرز

ای میل Iqbalsyed2000@yahoo.co.uk

طابع: اظہار سنز پرنٹرز، لاہور فون:7220761

Marfat.com

فہرست

حرف اول

روح کی بالیدگی اور عقل کی پاکیزگی — 7

۱) قرآن کا فلسفہ حسن وحیات — 15

۲) قرآن حکیم: سائنس اور فلسفہ سے پہلے
سائنس اور فلسفہ سے آگے — 23

۳) قرآن کی حسن کاری اور تخلیق کاری — 33

۴) پیمائش زمان ومکان: مقام ذکر مقام فکر — 49

۵) تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب — 61

۶) قرآن الفرقان: عظمتوں اور رفعتوں کا دیباچہ — 75

۷) قرآن کی شیرینی اور سحر آفرینی — 81

۸) مقام ربوبیت اور حسن عبودیت — 91

۹) مذہب، سائنس اور فلسفہ کا مشترکہ سفر — 103

۱۰) قرآنی نظریہ کون ومکان — 121

۱۱) سائنس کے انکشافات اور قرآن — 135

۱۲) قرآن اور سائنس کی روشنی میں دماغ کا تخلیقی عمل۔
کامیابی کے لئے قرآنی لائحہ عمل — 153

۱۳) قرآن کا فلسفہ اخلاقیات
اعلیٰ اخلاق ہی جہاد اکبر ہے۔ — 165

۱۴)	اسلام اور جدیدیت	185
۱۵)	حسن اور امن دین اسلام کی اساس ہیں	
	تفرقات اور اختلافات کے خطرات	205
۱۶)	قرآن اور سائنس کی روشنی میں	
	دل ودماغ کے ارتقائی مراحل	219
۱۷)	عقل سلیم اور عقل طاغوتی	
	قرآن کریم کی تخلیقی خصوصیات	229
۱۸)	روحانی تجربات اور مکاشفات	
	ذکر الٰہی انسانی زندگی کا سرمایہ	243
۱۹)	قرآن فہمی سے قرآن فروشی تک	255
۲۰)	مسلمانوں میں علم وعمل کا فقدان	
	جہالت اور پسماندگی کے خلاف جہاد	271
۲۱)	مغرب کی نظر میں اسلامی تہذیب وفلسفہ	283
۲۲)	غلاظتوں سے عظمتوں کی جانب	
	حیات وحسن کی کہانی: ایک درویش کی زبانی	297
۲۳)	مسلمانوں کا تنزل وانحطاط اور عالمگیریت کی تلاش	315
۲۴)	تخلیق اور اسکی منزل مقصود	335

Marfat.com

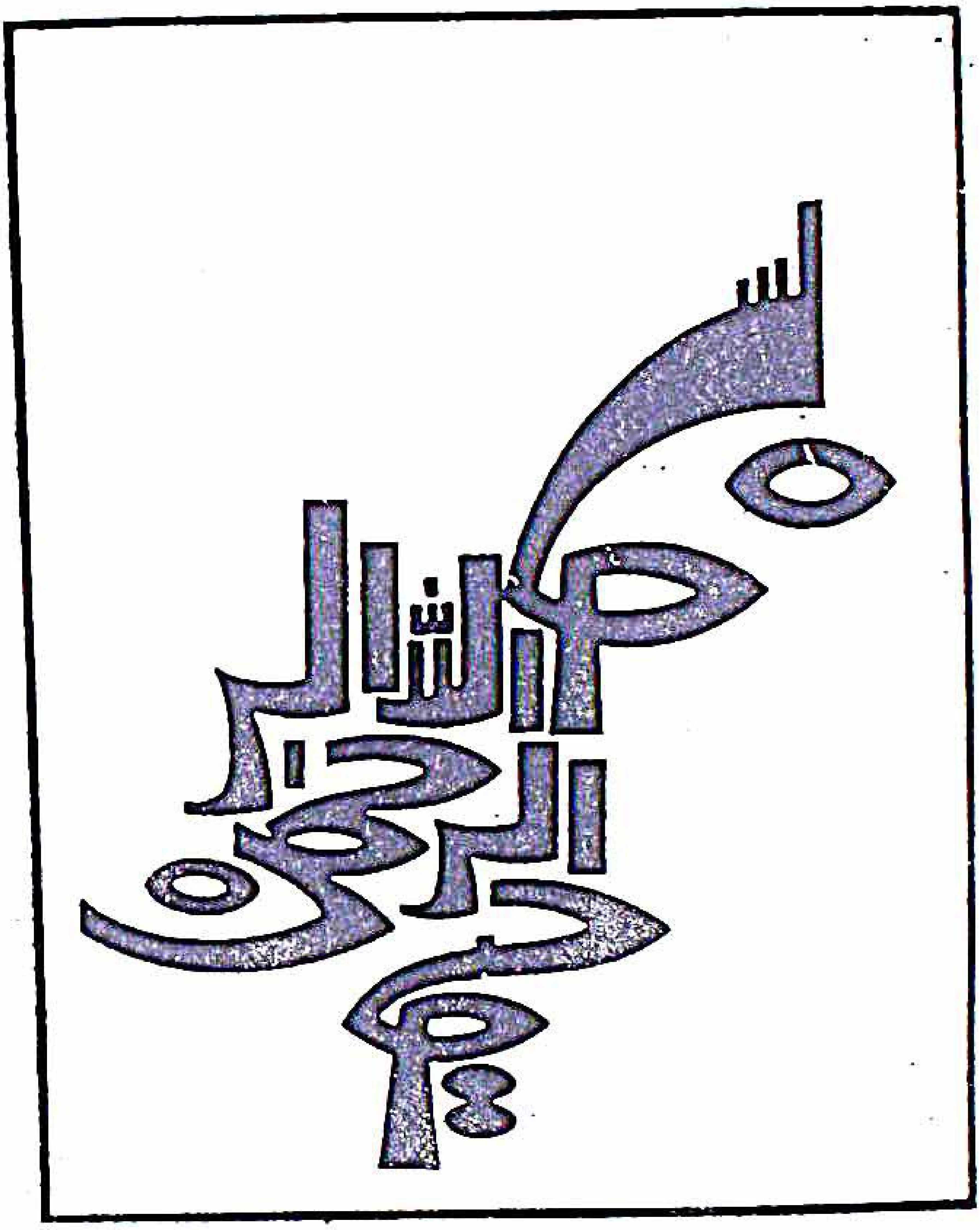

Marfat.com

Marfat.com

روح کی بالیدگی

اور

عقل کی پاکیزگی

سائنس اور فلسفہ کے جدید دور میں جہاں نئی ایجادات اور نظریات تیزی سے جنم لے رہے ہیں ایک پندرہ سو سال پرانی کتاب پر قلم اٹھانا اور اس کا جدید سائنسی، عقلی اور حسی تقاضوں کی روشنی میں احاطہ کرنا ایک ایسی کاوش ہے جس کے لئے رب علم و حکیم کا جتنا بھی شکریہ کیا جائے کم ہے۔ مجھ جیسے ناتواں انسان کے کاندھوں پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈالنا اور اسے بھرپور انداز سے پایہ تکمیل تک پہنچانا صرف اللہ تعالیٰ کی ہی دین ہے۔ اسی کا ہی عطیہ ہے۔ یہ امر اس لیے بھی باعث تشکر ہے کہ قرآن حکیم حکمت آموز اور خیال آخرین کتاب کو ایک ایسے حسن مقصدیت کے ساتھ پیش کرنا ہے جو اس کے نزول کا باعث بنا ہو بذات خود ایک بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔

میں حیران ہوں کہ اتنی بھری دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یہ کام مجھ جیسے ادنیٰ انسان سے لیا اور مجھے آرزوئے حکمت و حیات کو زندہ و فعال بنانے کا ذریعہ بنایا۔ یہ کتاب اگرچہ شروع میں انگریزی میں لکھی گئی تھی لیکن چونکہ ہمارے ملک کی اکثریت اس زبان سے نابلد ہے اس لیے ان کا اسرار تھا کہ اسے اردو

میں منتقل کیا جائے یہ بذات خود ایک بہت بڑا کام تھا جس کے لیے مجھے کوئی موزوں ذریعہ نہ ملا اور آخر کار یہ بیڑا میں نے خود اپنے ذمہ لیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔

علم و فکر کی دنیا میں اس قسم کی کاوشیں کم ہی ہوتی ہیں لیکن جب مصمم ارادہ کر لیا جائے اور عزم و ہمت سے بیڑا اٹھا لیا جائے تو رب کریم کی رحمت جوش میں آجاتی ہے اور آدمی کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم پر اگرچہ بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن کم و بیش ہی جدید علوم کی ان میں عکاسی کی گئی ہے اور وہ موجودہ دور کے تقاضوں اور معاشرے کی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

قرآن کی تعبیر اور تشریح اس انداز سے نہیں کی گئی ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی نظر و فکر سے ان کا مطالعہ کر سکے۔ جدیدیت کو حرمت ممنوعہ تصور کیا جاتا ہے اور خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس سے الہامی کتاب کی پاکیزگی متاثر نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت اس سے برعکس ہے اور اللہ تعالیٰ نے کئی ابواب میں ان امور کا ذکر کیا ہے جن سے جدیدیت نے جنم لیا ہے، قرآن نے خود علم کی روشنی پھیلائی اور آنحضورؐ نے کہا کہ اگر علم حاصل کرنے کی غرض سے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ لیکن ہمارے نام نہاد مذہبی حلقے اس حقیقت سے بے بہرہ ہیں اور اندھیرے اور جہالت کے انہی غاروں میں مقید ہیں جن میں وہ آج سے کئی صدیوں پہلے تھے۔

قرآن حکیم کی تعلیم جو کہ خود فکر انگیز ہے اسی وقت انسانی ذہن پر اثر انداز ہو سکتی ہے جب اسے جدید علوم اور معاشرتی ضروریات کی روشنی میں پرکھا جائے قرآن کریم فرسودہ نظام کی بات نہیں کرتا بلکہ ان حکمت آموز حقائق کی نشاندہی کرتا ہے جو موجودہ دور میں سائنس اور دیگر علوم کی کاوشوں سے ہم تک پہنچتے ہیں یا آئندہ آنے والے ایام میں ہمارے علم میں آئیں گے مغرب کی پھیلتی ہوئی روشنی خاصی حد تک قرآن ہی کی مرہون منت ہے یہ قرآن ہی کی تعلیمات ہیں جنہوں نے انسان کو علم و فنون حاصل کرنے کی ترغیب دی اور یہ قرآن ہی ہے کہ جس نے انسان کو ستاروں پہ کمند ڈالنے کے لیے آمادہ کیا۔ اور یہ قرآن ہی ہے کہ جس نے نظام حیات اور نظام کائنات کے رموز کو آشکارہ کیا اور مزید ان کی گہرائیوں میں جھانکنے کے لیے راہ ہموار کی۔ لیکن یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ ان راہوں سے بھٹک

Marfat.com

گئے اور خرافات میں الجھ کے رہ گئے۔

موجودہ دور میں قرآن حکیم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ایک فکر انگیز تقاضا ہے۔ یہ تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم قرآنی تعلیمات کو جدید علوم کی روشنی میں اچھی طرح نہ پرکھیں اور حقائق کی روشنی میں انکا جائزہ نہ لیں جن کی نشاندہی قرآن وقتاً فوقتاً کرتا ہے۔

یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایک مفکر کی حیثیت سے اس کی حکمت اور افادیت کا جائزہ لیں اہل قلم کی حقیقت سے انہیں تحریر میں لائیں تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں ان سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔ یہی اس کتاب کے لکھنے کا مقصد ہے اور اسی ضرورت کے پیش نظر کچھ ان حقائق کا جائزہ لیا گیا ہے جو ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

فکر و نظر اور ادراک کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے ہر صورت جاری رہنا چاہیے۔ تب ہی ہم دین اور دنیا اسکے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اور تب ہی ہماری زندگی معنوی اور صوری اعتبار سے بامعنی اور حسین ہوسکتی ہے۔ جس کی مثال ہمیں قرآن حکیم کی سورہ یوسف میں ملتی ہے کہ عام جانگاہ لمحات کے باوجود کس طرح انسانی زندگی کو احسن و اکمل طریق سے تشکیل کیا جا سکتا ہے۔

نظام کائنات اور تخلیقی عمل جس کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے ایک فکر انگیز عبارت ہے جو عبرت اور بصیرت سے بھرپور ہے۔ یہ قرآن عقلی، علمی اور دینی شعور پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے اور حسن و حکمت رنگ ابدیت کو مزین بنانے کے لیے نعمت عظمٰی قرآنی شعور اور صدیوں کی سوچ کے بعد اب یہ راز کھلا ہے کہ زندگی بے مقصد نہیں ہے اور اس کو بامعنی بنانے کے لیے قدرت نے انسان میں وہ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جو اس کی زندگی کو بے شمار نعمتوں سے مزین کرتی ہیں اور وہ حسن و سرور بخشتی ہیں جو انسان کا مقصود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر لحظہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے قرآن کے پرتو میں ہر لحظہ ہماری زندگیوں پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ بشرطیکہ ہم ان تمام صلاحیتوں اور نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے رہیں جو ہماری بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

جن قوموں نے قرآن کا پیغام سنا اور اس کے مضمرات کو سمجھا وہ ارتقائی مراحل کامیابی سے طے

Marfat.com

کرتی رہیں اور وہ اعلیٰ میار حاصل کیے جن کے لیے وہ آج جانی پہچانی جاتی ہیں۔ قرآن ایک تخلیقی فکر کی آماجگاہ ہے اور جستجو و عمل کا ایک درس دیتا ہے جن قوموں نے اس درس کو بھلا دیا وہ خود صفحہ ہستی سے مٹ گئیں اور قصہ پارینہ بن گئیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں وہ قومیں جو اس نظر و فکر سے مسحور ہوئیں وہ ترقی و قوت سے ہمکنار رہیں۔

اگر منظر غور اور تعصبات سے بالاتر ہو کر تکمیل و تشکیل کے عمل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مغرب کی تمام تر ترقی کا راز اسی جستجو اور تلاش میں ہے جس کا درس قرآن کریم نے دیا ہے۔ اسی سے علمی، تحقیقی اور فنی ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

اس سے ایک اور سبق جو ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ قومیں اس عمل میں شریک نہیں ہوتیں وہ تنزل کا شکار ہو جاتی ہیں اور پسماندگی ان کا مقدر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل مسلمانوں کی حالت ہے۔ علم، عمل اور ترقی میں ہی حرکت دوام ہے اور اسی سے دنیا اور آخرت میں تسکین و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کا اعادہ میں نے اپنی کتابوں میں بارہا کیا ہے۔

تنزل اور پسماندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان نہ صرف فکر و نظر میں مغرب سے پیچھے رہ گئے بلکہ غلام بھی ہو گئے۔ اس غلامی کی وجہ سے قرآن کا نقطہ نظر ان سے پوشیدہ ہوتا گیا اور وہ مغرب کی فکری یلغار کی زد میں آتے رہے۔ شعبہ ہائے زندگی جو سب سے زیادہ متاثر ہیں ان کا تعلق زیادہ تر سیاسی، ثقافتی، اقتصادی، علمی اور ادبی امور سے ہے۔ جب یہ شعبہ ہائے حیات متاثر ہوئے تو زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ دل و دماغ کی کیفیت بدل گئی اور روح کی بالیدگی اور عقل کی پاکیزگی روبہ تنزل ہو گئی۔ اخلاقی اقدار کا دیوالیہ نکل گیا اور تخلیقی قوتیں بری طرح مفلوج ہو گئیں حسن و جمال اور نشوونما کا تصور جو قرآن حکیم نے مسلمان کو دیا تھا وہ تقریباً ناپید ہو گیا۔

ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر پڑنے والے وہ منفی اور کرب انگیز اثرات تھے جنہوں نے مجھے جھنجھوڑا اور پچھلے دس سالوں میں میں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی غرض سے کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کا مقصد بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ حیات کو مثبت انداز فکر دینا اور علمی و عملی میدان میں ان

Marfat.com

قوتوں کو فعال کرنا تھا جو زنگ آلود ہو چکی تھیں۔قرآن کا شعور اور تخلیقی قوتوں کا احیاء بہت ضروری ہے جن کے بغیر ہم وہ مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتے جو ہمارا مطمع نظر ہے۔

اس شعور اور فلسفہ حیات نے مجھے زیادہ فعال بنایا اور علمی و عملی میدان میں اتنی کاوشوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کیا۔اگر یہ عوامل کارفرما نہ ہوتے اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو میں بھی حُسن زندگی سے محروم ہوتا اور یہ کتاب لکھنے اور آپ تک پہنچانے کی سعادت حاصل نہ کر پاتا۔

زندگی ایک مسلسل جستجو اور طلب ہے جو متواتر جدوجہد اور تخلیقی غایت وفکر سے مترشح ہے۔میرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ ارتقاء انسان کی تدریجی ترقی وشعور اور تخلیقی کاوشوں کا مرہون منت ہوتا ہے اور کتابیں اس ضمن میں ایک بہت اہم رول ادا کرتی ہیں اسی لیے ہمارا نعرہ (slogan) ہے کہ جو قومیں کتابوں سے دور ہوتی ہیں وہ ترقی وکامرانی سے دور ہوتی ہیں اور تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہیں۔

کمال و جمال کا انحصار اسی شعور پر ہے جو میں نے اس کتاب کے ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی شعور کے ذریعہ ہم ان غلاظتوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر ہماری روح کو آلودہ کرنے کے لیے برسرپیکار رہتی ہیں۔اسی شعور کے ذریعہ روح کی بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور اس کی ہی وساطت سے ہم اپنی عقل کو پاکیزہ کرتے ہیں وگرنہ وہ عقل طاغوتی بن جاتی ہے۔

غلاظتوں کو دور کر کے عظمتوں کی تلاش میں ہم یہاں مصروف عمل ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

تیرے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و سازِ زندگی کہہ دے

Marfat.com

Marfat.com

دانش و حکمت کے روشن دریچے ﴿باب اول﴾

قرآن کا فلسفہ حُسن وحیات

قرآن اور اس کی اعلیٰ روایات

قرآن دنیا کی ایک ایسی عظیم کتاب ہے جو دائمی حقائق، سچائی اور ہدایات سے بھرپور ہے۔ اس کتاب میں متواتر ہونے والی تبدیلیوں، فطری تقاضوں اور انسانی ضروریات کے بارے میں ضروری معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علم انسان کی فلاح و بہبود اور حقیقت میں اس کی بقاء کے لیے لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف مذہبی ہدایات کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ ذہنی، قلبی اور دنیاوی خواہشات پر بھی اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہاں ہمیں یہ علم دیا جاتا ہے کہ تخلیق کا کیا مقصد ہے اور یہ اپنے زاویہ نگاہ سے کس طرح وجود میں آئی اور کیونکر اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ اگر اس کے پیچھے ایک مقصد نہ ہوتا تو اس میں وہ ترتیب نہ پائی جاتی جو خالق کی تخلیق میں پائی جاتی ہے۔ وہ قوانین اور اصول نہ ہوتے جو اس کے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

حیات انسانی کا یہ ایک مسلسل سفر ہے جسکا ہر مقام اگلے مقام سے آگے ہے۔ یہ اس منزل کی برابر نشاندہی کرتی ہے جو انسان کا مقدر سنوارتی ہے۔ اس کا ادراک اور آگہی ہمیں اسی کتاب کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور اس کی روشنی میں ہم مختلف مراحل اور حالات سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ یہی اس کتاب کا تصور ہے اور یہی اس کا مطمع نظر اس کتاب میں ایک عجب سا ذوق وشوق دیکھنے میں آتا ہے جو فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ شعور ہماری زندگی میں ایک انقلاب برپا

Marfat.com

کر دیتا ہے اور تقدیر کے اصل دہانے تک پہنچا دیتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ایسا واقع ہے جو نہ پہلے دیکھنے میں آیا ہے اور نہ آئندہ کوئی اور واقع ایسی عظمت اور توقیر کا حامل ہو سکے گا۔

قرآن کو ان تمام پیغامات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی بھلائی کے لیے اتارے گئے سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ یہ ایک ایسا نقیب یزداں ہے جس کی چابی صرف خالق حقیقی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی کے ذریعہ اس صراط مستقیم کا تعین کیا گیا جو تخلیق انسانی سے لیکر اب تک صحیح صورت میں قائم ہے اگر چہ انسان کی سوچ کا دھارا بدلتا رہتا ہے اور وہ اس راہ میں حائل ہوتا رہتا ہے لیکن ارتقاء کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے اگر یوں نہ ہوتا تو شر پسند عناصر اور شیطانی قوتیں کبھی کی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں اور بقا کے لیے سخت خطرہ ثابت ہوتیں۔ چونکہ قرآن حکیم کے احکامات اصل ہیں اس لیے یہ سلسلہ برابر جاری وساری ہے اور کوئی خطرہ اس کے دھارے کو نہیں بدل سکتا۔ صدیوں کے گزرنے کے باوجود قدرت کا نظام، سچائی اور حقانیت کا بول بالا اور فطری اصولوں کی پابندی اسی طرح جاری ہے جس طرح کہ وہ دنیا کی تخلیق کے وقت کی گئی تھی۔

قرآن مجید کی حکمت اور دانائی ہمیں خود اپنی نشو ونما اور فلاح و بہبود کی راہیں متعین کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے لیکن ہم قرآن مجید پر دھیان دینے کی بجائے اسے ایک خوبصورت غلاف میں بند کر رکھ دیتے ہیں تا کہ اس کی دعوت ہم تک نہ پہنچ سکے اور ہم اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار نہ لا سکیں۔ ابتدائی دور میں آنحضورؐ اور ان کے صحابہ کی رہنمائی میں جب مسلمانوں نے بھی دعوت کو قبول کیا اور اس پر غور کیا تو وہ دنیا کی ایک عظیم قوت بن گئے انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا اور ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کو جنم دیا۔

اگر چہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا لیکن اس کا پیغام سب پر عیاں ہو گیا اور باشعور عناصر نے

اس کی ہدایات پر عمل کر کے نہ صرف اپنی زندگی بلکہ آنے والی نسلوں کی تقدیر بھی بدل دی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام جلد ہی دنیا کے چاروں کونوں میں پھیل گیا اور اس کا پیغام دعوت عام بن گیا۔

ام الکتاب ہونے کی حیثیت سے اس کا پیغام یوں عالمگیر بنا کہ اس نے کونے کونے کے لوگوں کے دل و دماغ کو سحر کر لیا اور انہیں زندگی کے حقائق پر سچے دل سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمانہ جہالیت سے نکل کر روشنی کے دور میں داخل ہونے لگے اور فرسودہ روایات کو چھوڑ کر اعلیٰ ظرف کے انسان بننے لگے۔ قرآن نے انہیں بتایا کہ وہ ایک اعلیٰ پیمانے سے ایک خوبصورت شکل میں پیدا کئے گئے ہیں اور انہیں اسی شکل میں بڑھنا پھولنا ہوگا ورنہ وہ جانوروں کی سطح سے بھی نیچے گر جائیں گے۔

دائمی پیغام:

اس دائمی پیغام کی بنا پر قرآن ایک عالمگیر حقیقت کا حامل بن گیا اور مختلف افراد خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا معاشرے سے ہو اس کی حقانیت کے قائل ہونے لگے۔ اس طرح ایک ایسا انقلاب برپا ہوا جس سے دنیا ایک نئے دور میں دخل ہونے لگی۔

یہ دعوت انقلابی اور ارتقائی منازل طے کرنے میں ایسی کامیاب ہوئی کہ اس نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھ دی۔ نئے روشن خیال مفکرین جنہیں موجودہ دور کے مُلا تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس تہذیب و تمدن کے پیش رو ثابت ہوئے اس کا ذکر ہم نے اپنی کئی کتابوں میں مختلف جگہوں پر کیا ہے۔

قرآن کے مثبت اور تخلیقی پہلوؤں سے کنارہ کشی مسلمانوں کو بہت مہنگی پڑی اور یہ انہیں اعلیٰ معیار سے گرا کر نچلی سطح پر لے آئی۔

بہر کیف نہ صرف ماضی کے محققین بلکہ موجودہ دور کے دانشور، سائنسدان اور علم و دانش کے گہوارے قرآن کی حکمت اور دانائی کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

یہ دانشور حیران ہیں کہ قرآن کس آسانی سے مختلف حالات کا جائزہ لیکر ارتقائی مراحل کی نشاندہی کرتا ہے۔ انہیں اس میں شک نہیں کہ یہ کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہو سکتی کیونکہ آئندہ حالات کا

Marfat.com

اس انداز سے جائزہ لینا انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف ایک مافوق اُلطبعی قوت ہی کر سکتی ہے اور مختلف ادوار اور تہذیبوں کا مشاہدہ اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے۔

یہاں یہ کہنا بھی غیر ضروری نہ ہوگا کہ علم و دانش کے روشن ابواب جو ہمیں موجودہ دور میں نظر آتے ہیں ممکن نہ ہوتے اگر ہمارے پاس یہ سرچشمہ نہ ہوتا۔

یہاں یورپ کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ علم و دانش اور نشاۃ ثانیہ کے ابواب جو وہاں پچھلے پانچ چھ سو برس بیشتر کھلے۔ وہ بیشتر مسلم دانشوروں اور محققین کا علمی ادبی اور تحقیقی کاوشوں کے باعث ہی ممکن ہوئے اور یہ سلسلہ اب ہر دور میں دیکھنے کو مل رہا ہے مسلمانوں نے جب علم و ادب اور قرآنی شعور سے منہ پھیرا تو ان کے لیے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور دوسری قوموں کے لیے دروازے کھل گئے۔

قرآن مجید کی معجزانہ خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امام غزالی کہتے ہیں کہ قرآنی آیات سورج کی کرنوں کے مانند ہیں۔ دنیا کے ہر کونے کو روشن و منور کرتی ہیں اور اسی روشنی کے سبب ہم قدرت کے پوشیدہ رازوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک سکتے ہیں۔[۱]

قرآن کی آیات انسان میں ضروری شعور پیدا کرتی ہیں اور اس شعور کے باعث انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی تخلیق کے رموز سے آگاہ ہوتا ہے اگر آدمی کے پاس یہ روشنی نہ ہوتی تو انسانیت آج بھی گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھٹکتی ہوتی۔

قرآنی آیات کا شعور براہ راست انسان کے ان ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو نکھارتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں ودیعت کی ہیں۔ قرآن سورۃ ۱۵۔۱:۹۱ میں انسان کی بدکاری اور سرکشی کا ذکر کرتا ہے اور متنبہ کرتا ہے کہ یہ منفی حرکات انسان کو تباہی کے دہانے پر لے جاتی ہیں اور کامیابی صرف انہیں لوگوں کو ملتی ہے جو نیکی کی دعوت قبول کرتے ہیں اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

اس سورۃ سے صراط المستقیم کی وضاحت ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہوتے ہیں اور یہ انعامات کی صورتوں میں

Marfat.com

ا۔عبدالحمید غزالی ''مشکاۃ الانوار''

ظاہر ہوتے ہیں۔ان کا ظہور اس دنیا میں اور آخرت میں برابر ہوتا رہتا ہے۔

ایک کامیاب معاشرہ انعام یافتہ لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جس شخص اور معاشرے پر یہ انعامات ہو جائیں وہی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

غور و فکر:

یہاں قرآن کو سمجھنا اور اس کی دعوت کو قبول کرنا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کو سمجھے بغیر انسان انفرادی اور معاشرتی زندگی میں آرام و سکون اور کامیابی کے تصور سے نافہم رہتا ہے۔قدرت کا ایک نظام ہے اور اس کے بنیادی اصول ہیں ان پر چلنا بہت ضروری ہے۔اگر تضادات اور اختلافات بدکاری اور سرکشی کو غالب آنے دیا جائے تو زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔اور ایسے افراد اور معاشرے تباہ ہو جاتے ہیں۔اس لیے یہ سوچ و فکر کا مقام ہے اور ہمیں اس موڑ پر رک کر سنجیدہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن حکیم اپنی سورۃ (۱۸۹:۳) میں ایک مرتبہ پھر اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کونسی خوبیوں پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔

ان میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت رحمت کی کیا خصوصیات ہیں اور سوچ و فکر کے لیے ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق جس میں زمین و آسمان کا پیدا کرنا اور بدلتے ہوئے دن اور رات کا ظہور البتہ ایسی نشانیاں ہیں جن پر غور و فکر کر کے انسان رعنائی افکار کے مراحل طے کرتا ہوا صراط مستقیم تک پہنچ جاتا ہے۔قرآنی شعور جہاں انسان کو صراط مستقیم کے قریب لانے میں رہنمائی کرتا ہے وہاں وہ اس کو غور و فکر کی گہرائیوں کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیاں ہی انسان میں فہم و فراست پیدا کرتی ہیں۔اگر انسان ان پر غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو وہ نچلی سطح کی مخلوق میں شمار ہوگا اور اس سے کسی ذہنی، قلبی یا روحانی بالیدگی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔کامیابی کے مراحل وہی لوگ طے کرتے ہیں جو ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔جب

Marfat.com

سے مسلمانوں نے غور و فکر کرنا چھوڑ دیا وہ پسماندگی کی گہرائیوں میں دھنس گئے اور اب کئی صدیاں گزرنے کے باوجود ان کا دوبارہ کامیابی کی راہ پر لوٹ آنا مشکل نظر آتا ہے غور و فکر کی اہمیت نہ صرف تاریخ کی روشنی میں بلکہ موجودہ دور کی جدیدیت میں بھی بہت زیادہ عیاں ہے۔ وہ قومیں جو اللہ کی نشانیوں پر غور و فکر کر رہی ہیں وہ ستاروں پر کمند ڈال رہی ہیں اور جو بیکار مشغلوں میں مشغول ہیں وہ کامیابی کی راہ سے دور دھکیل دی گئی ہیں۔ اس لیے ارتقاء کا یہ تقاضا ہے کہ انسان تخلیقی کاوشوں کے لیے غور و فکر اور جدوجہد کرے۔

قرآن کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے سے ہمیں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ساتھ ہی اپنی پیدائش اور اس کے مقصد کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان کیوں پیدا کیا گیا اور اس کی پیدائش کی کیا غرض و غایت تھی۔

اس طرح قرآن ان پیچیدگیوں کو سلجھاتا ہے جو ہمارے لیے الجھن کا باعث بنی رہتی ہیں۔ اس طرح قرآن ہمارے لیے الہدیٰ کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے ذریعہ یہ دانش و حکمت کے ابواب کھولتا ہے۔

۱۔ مولانا فضل الرحمٰن "اسلام"

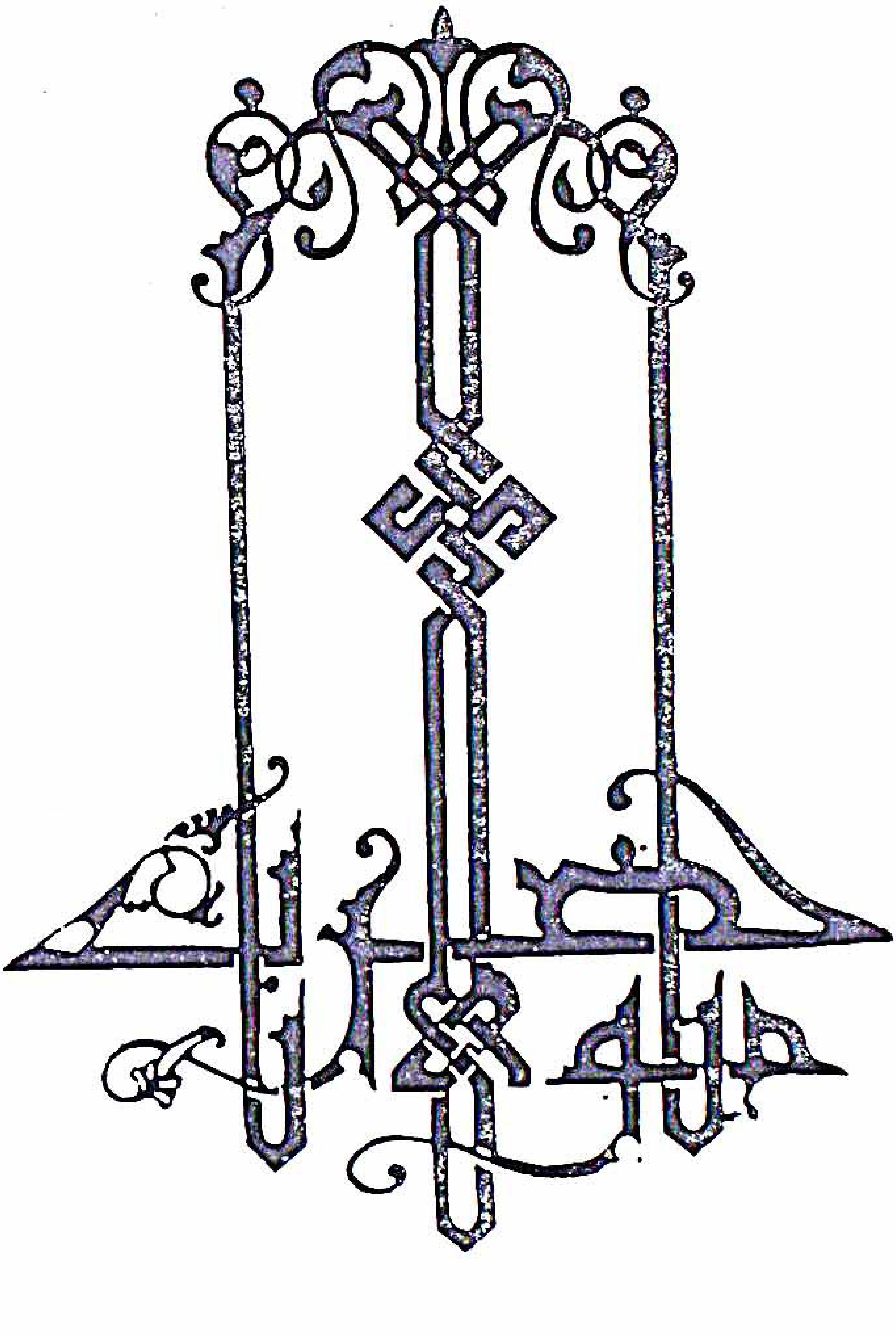

Marfat.com

قرآن حکیم

﴿باب دوم﴾

سائنس اور فلسفہ سے پہلے
سائنس اور فلسفہ سے آگے

اللہ تعالیٰ کی رضا اور منشاء نے ہی اس دنیا کا نظام قائم کیا ہے اور یہی ہماری زندگی کی راہیں متعین کرتی ہیں۔

اس کا اندازہ اور تعین ان حقائق سے ہوتا ہے جو ہمیں دنیا میں دکھائی دیتے ہیں۔ نظام حیات کی نشانیاں یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں اور ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مائل کرتی ہیں کہ اس تخلیق کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور موجود ہے جسے ہم اللہ یا خدا، گاڈ یا پرماتما کا نام دیتے ہیں۔

ان حقائق کا اندازہ ہمیں اپنی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے بھی ہوتا ہے جو ہمیں ان مظاہر کا مشاہدہ اور تجزیہ کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ تخلیقی مظاہرہ ان قوانین کے تحت منظر عام پر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے متعین کئے ہیں اور انہی کے تحت ارتقائی مراحل طے کر رہے ہیں۔ ان کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کے نظام حیات کی ارتقائی صورت میں کر دی ہے۔

اس لیے قرآن ہمیں محض ایک مذہبی کتاب کی صورت میں ہی نہیں ملی بلکہ اس کی غرض و غائت میں وہ معلومات اور اشارے فراہم کرنا بھی ہے جو ہمیں قدرتی نظام کو سمجھنے اور اس سے مستفید ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ ان قوانین کے ذریعے نہ صرف نظام حیات کو ملنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ہماری اپنی زندگی بھی

Marfat.com

اس سے نشو ونما پاتی ہے۔

ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تعارف کرایا جاتا ہے اور ان صفات کا مظاہرہ کرایا جاتا ہے جو اس نظام حیات میں ہر سو نظر آتی ہیں۔ اُس نظام کے فعل و عمل میں کوئی عیب نظر نہیں آتا اور فن کار عمل اپنی اعلیٰ سطح پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن ان قوانین کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے (۳۶:۴۰) کہ ''سورج کی یہ طاقت نہیں کہ وہ چاند کو آدبوچے اور نہ ہی رات اس قدر دراز ہونے والی ہے کہ وہ دن پر حاوی ہو جائے اور سب ستارے اپنی مقدار اور رفتار کے مطابق آسمان میں گردش کر رہے ہیں۔ یہ تمام طاقت صلاحیت ہم نے انہیں عطا کی۔ اور اگر ہم چاہیں تو اس سے انہیں محروم کر دیں اور تباہ کر دیں۔ بہر کیف یہ تمام نظام ایک قانون کے مطابق چل رہا ہے اور اس کے بقاء کی ضمانت دیتا ہے۔

قرآن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ یہ حقائق اس وقت بیان کئے گئے جبکہ سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم انتہائی ابتدائی دور میں تھے اور عرب جیسے پسماندہ علاقے میں کسی ایسے سائنسدان مفکر کا تصور کرنا بھی محال تھا جو سورج اور چاند، ستاروں اور دن رات کی گردش کا ذکر اس خوبصورتی اور جامعیت سے کر سکتا ہو۔

قرآن ان تمام حقائق کا ذکر اس طریقے سے کرتا ہے جو کہ بنیادی ہے اور جہاں سے ان تمام امور نے جنم لیا۔

حقیقت میں ان تمام امور پر جو قرآن نے روشنی ڈالی وہی آئندہ آنے والی تحقیقات اور معلومات کا سبب بنی جو سائنس نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ کیں۔ اگر قرآن ان امور کی طرف اشارہ نہ کرتا تو غور و فکر کا یہ عمل غالباً ظہور پذیر نہ ہوتا۔

فکر و نظر کے اس عمل نے موجودہ دور کی ماڈرن سائنس میں ہونے والی ترقی کی راہیں ہموار کیں اور انہیں نئی راہیں پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اس لیے جو لوگ قرآن اور سائنس میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں وہ دراصل قرآن کی سائنٹیفک اور انقلابی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

نظام حیات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم اس مقصد سے بخوبی آگاہ

Marfat.com

ہوں جو اس تشکیل اور تکمیل کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ یہ راز تب ہی سمجھا جا سکتا ہے جب کہ ہم اپنی عقلی، علمی اور روحانی صلاحیتوں کو جمع کریں اور ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کریں۔ موجودہ دور کے علوم اور خصوصاً سائنس یہ کوشش کر رہا ہے کہ تمام قوتوں کو جمع کیا جائے اور قدرت کے نظام سے بخوبی آگاہ ہونے کے لیے عملی کوشش کی جائے یہ کوشش چند لمحوں یا سالوں پر محیط نہیں بلکہ اس کے لیے ایک عرصہ دراز درکار ہے اور ہر لمحہ علوم کے پھیلاؤ میں پیش رفت ہونی چاہیے اگرچہ قرآنی علم کے پھیلاؤ میں بعض اوقات لادینی اور مادہ پرستی کے رجحانات حائل ہوتے ہیں۔ لیکن انکا سچے جذبے، گہرے دباؤ اور صحیح سمت میں ابھرنے والی قوتوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ علم و دانش کا دھارا اس طرح وضع کیا جا سکتا ہے جس سے جدید دور کے علوم قرآن علم سے مطابقت پیدا کر سکیں۔ یہی طریق کار ہماری دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کا باعث بنے گا۔ کسی فکری انقلاب کو اسی طرح کامیاب کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے ماننے والوں میں بلند نظر اور گہری فکر پیدا کی جائے۔ تخلیقی شعور کا سلسلہ جو قرآن نے 1400 سال پہلے شروع کیا وہ اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ آئندہ آنے والے دور میں جو کہ جدیت کا زیادہ طاقتور دور ہوگا اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں مزید کامیاب ہوگا ہمیں اس کا یقین یوں ہے کہ یہ شعور حقانیت پر مبنی ہے اور اس کا منبع دائمی حقائق سے بھرپور ہے۔

قرآن مجید کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ فکر و تدبر کو خوبصورت زبان اور علم و ادب سے بھرپور انداز بیان میں پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا اثر مثبت ہوتا ہے اور اس سے متاثر ہونے والے حلقوں میں اضافہ ہوتا ہے یہ قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والوں کی نظر کو نہ صرف وسعت دیتا ہے بلکہ ان میں نکھار بھی پیدا کرتا ہے آنسوؤں کے ذریعے یہ نور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اس کے انداز بیان اور علم و ادب سے متاثر ہوتا ہے اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں سمو لیتا ہے۔

اگر قرآن کی یہ خصوصیت نہ ہوتی تو آج ایک ارب سے زائد مسلمان اور بہت سے غیر مسلم قرآن کا مطالعہ نہ کرتے اور اس کے اثرات سے متاثر نہ ہوتے۔

ہر سچی چیز کا ایک اثر ہوتا ہے اور وہ دیرپا ہوتا ہے مزید برآں قرآن حکیم کی یہ بھی ایک نمایاں خوبی

ہے کہ وہ محض امراض کی نشاندہی ہی نہیں کرتا بلکہ انکا موثر اور دیرپا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے کئی انفرادی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں سے صورت حال کا مطالعہ کیا ہے اور تجاویز دی ہیں جن کے ذریعہ امراض کا علاج ہوا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

یہ مسلمانوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ وہ غفلت کے دبیز پردوں میں دبے ہوئے ہیں اور قرآن کی دانش وحکمت سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کرتے جن قوموں نے اس سے فائدہ اٹھایا وہ آج ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔

علم و دانش کے جھرو نکے سب کے لیے کھلے ہیں اوران پر کسی کا مکمل اختیار نہیں کہ دوسرا اس سے مستفیض نہ ہوسکے۔ غیر مسلم قوموں نے جب قرآن کی حکمت سے استفادہ کیا تو وہ سائنس اور علم وادب کے میدان میں اعلیٰ مراتب کے مالک بن گئے۔

جن مسائل کا ذکر قرآن کرتا ہے وہ کسی خاص قوم کے مسائل نہیں ہیں بلکہ وہ ہر فرد اور انسانیت کے اجتماعی مسائل ہیں اور ہر قوم انہیں اپنے حالات کے مطابق حل کرنے کی اہل ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ انکا مطالعہ گہری نظر سے کرے اور انکا تجزیہ قرآنی اور جدید علوم کی روشنی میں کرے۔

اس بنیادی فلسفے کو سمجھنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ شعور اور نظریہ کی روح کو مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہوتا ہے اور تب اس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن کا پیغام اسی روح سے منسلک ہے اور ہم سے اسی جذبے کا متقاضی ہے۔

قرآن کے مطالب وحقائق کو سمجھنے اور ان تجاویز سے مستفید ہونے کے لیے ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جو ذہنی، علمی اور روحانی سطح پر ضروری ردوبدل سے ہوسکتی ہے۔ قرآن کی خوبیاں اسی وقت بروئے کار آسکتی ہیں جب کہ ہمیں اپنی کمزوریوں اور بیماریوں سے آگاہی ہو اور ہم ایک بہتر اور مثبت اندازفکر اپنائیں۔

انفرادی اور اجتماعی ارتقاء کے لیے یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ جس سے روگرداں ہونا ممکن نہیں۔ عصر حاضر میں جہاں اور بہت سے تقاضے ہیں وہاں ہر ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

Marfat.com

عصر حاضر کے تقاضوں سے قرآن گھبراتا نہیں اور اس لیے وہ لوگ جو جدیدیت سے بدکتے ہیں قرآن کی جامعیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہاں یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ قرآن کسی ایک خاص دور یا قوم کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اس کا اطلاق تمام ادوار میں دائمی اور قائمی ہے۔ اگر ہم خود اپنے حلقہ فکر سے اسے نکال دیں تو قصور ہمارا ہوا نہ کہ قرآن کا۔

قرآن میں یہ قدرتی صلاحیت موجود ہے کہ وہ تمام چیلنجز کا مقابلہ کر سکے اور ان کا حل پیش کر سکے۔ بہر حال یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں ہم جدیدیت کو ربوبیت اور روحانیت سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔

موجودہ دور کے دگرگوں حالات (اخلاقی مذہبی اور معاشرتی) کے پیش نظر ایک انقلابی شعور پیدا کرنے کے لیے علوم کا حصول، تحقیق کا عمل اور بلند پایہ فکر کی ضرورت ہے۔ یہ تمام چیزیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب کہ ہم اپنی توجہ اور بہترین صلاحیتیں قرآن اور متعلقہ علوم کی طرف مبذول کریں۔

مغرب کی روشن خیالی اور سائنس کی پیش رفت کے باوجود ہم ایک با مقصد زندگی گزارنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہے اور انفرادی اور معاشرتی سطح پر ہم گراوٹ اور تذلیل کی گہرائیوں میں دھنس چکے ہیں۔ اس سطح سے بلند ہونے کے لیے ہمیں قرآنی شعور کی ضرورت ہے اور زندگی کا مثبت انداز میں رخ بدلنے کے لیے جدید دور کے علوم کا حصول ضروری ہے۔ تعصب اور تنگ نظری کے دبیز پردوں کو پار کرنا ہوگا اور آگے بڑھنا ہوگا۔

یہاں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تعصب اور تنگ نظری میں صرف دقیانوسی مسلم حلقے ہی مبتلا نہیں بلکہ مغرب کے نام نہاد روشن خیال عناصر جنہیں اب (Neocons) کا القاب دیا جاتا ہے برابر کے شریک ہیں۔ وہ اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے طلباء اور پڑھے لکھے افراد کو ان کے فکری چنگل سے نکالیں اور قرآن کا صحیح شعور پیدا کریں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ قرآن نہ ہی جدیدیت کے خلاف ہے اور نہ ہی دنیاوی علوم کے اس لیے ان دونوں پہلوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے ہم قرآن اور دین اسلام سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ حقیقت میں قرآنی حکمت کو آج کے معروضی حقائق میں جدید دور کی زبان میں پیش کرنے کی

ضرورت ہے۔ آج کے سوچنے والوں کو صحیح انداز میں دین اور دنیا کی طرف لانے کی ضرورت ہے۔

''قرآنی حکمت کو آج کی زبان میں اس طرح پیش کیا جائے کہ ہر پڑھا لکھا نوجوان اس کا شعور اور ادراک حاصل کر کے دین بیزار سامراجی حلقوں کی حکمت عملی کے سحر سے با آسانی نکل سکے۔ آنحضورؐ کی زندگی سے بھی ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کا محور اور مقصد بھی یہ شعور اور آگہی پیدا کرنا تھا اور انہوں نے دین کا زبردست داعیع ہونے کے باوجود دنیا سے کنارہ کشی نہیں کی بلکہ اس کے برعکس وہ اس میں اپنی پوری قوت اور صلاحیتوں کے ساتھ شریک رہتے تھے''۔

ان حقائق کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے سے ہی ہماری زندگی کا رخ تبدیل ہوگا۔ اسی عمل سے ہمارا جسم اور ہماری روح فیضان حاصل کریں گے۔ یہ زندگی کا مرکزی نقطہ ہے جسے ہمارے فکر و تدبر کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

دائمی سچائی

قرآن ایک ایسی سچائی کا سرچشمہ ہے جس سے زندگی کی دینی اور دنیاوی کونپلیں کھلتی اور پھولتی ہیں یہاں سے ہمیں زندگی کو کامیاب اور پرسرور انداز میں گزارنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے اور یہیں سے ہمیں ایک جامع اور متوازن حکمت عملی حاصل ہوتی ہے۔

یہ قرآن کا ایک دائمی معجزہ ہے جسے آنحضورؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اسی معجزے سے روشنی کی شعائیں پیدا ہوئیں جنہوں نے نہ صرف حجاز بلکہ یورپ اور دیگر ممالک کے اندھیروں کو ختم کر دیا۔ دنیا میں جتنی ترقی ہوئی اس میں بیشتر اسی کا مرہون منت ہے۔ اس ترقی کا ذکر ہم نے اپنی کتابوں میں مختلف اوقات پر تفصیلاً کیا ہے۔ اور اسی لیے ہم یہ دعویٰ سے کہتے ہیں کہ قرآن مجید سب سے پہلے اور سب سے آگے ہے۔

اگرچہ حجاز کے اکثر مشرکین اس معجزے کی روشنی سے محروم رہے لیکن دنیا کی بہت سے اقوام اس سے مستفیض ہوئیں۔ زندگی کے آغاز سے دستور یہی رہا ہے کہ یہ شعور انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو

ا۔ مولانا عبداللہ سندھی۔ قرآن کا شعور صفحہ ۳۶

Marfat.com

یقین وایمان کے ساتھ اسے سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ [۱]

قرآن خود کہتا ہے (سورۃ ۱۱۱۔۱۰۹:۶) کہ جولوگ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد پر قائم رہتے ہیں وہ صحیح انداز فکر اور شور سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیات کا دھارا انہیں فکری تضادات اور بناوٹی ڈھکونسلوں سے نکلنے نہیں دیتا۔

اس لیے قرآن کا شعور ہی ہماری زندگی میں توازن اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا سبب ہوسکتا ہے۔ اور اسی کی روشنی میں اس دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔

کامیابی کا لائحہ عمل

ان حقائق سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ قرآن کا لائحہ عمل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور یہی وہ لائحہ عمل ہے جو یہ کامیابی کی ضمانت دیتا ہے اور ہمیں اپنی اخروی منزل کی جانب لے جانے کے لیے یقینی صراط مستقیم ہے۔

جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں قرآن میں ایک بہت بڑا خزینہ پوشیدہ ہے جو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے فوائد تمام انسانوں کے لیے برابر ہیں۔ ہر وہ شخص جو اس کے اسرار و رموز کو سمجھ جائے اس کے فوائد سے برابر مستفید ہوسکتا ہے، لیکن بات یقین اور عمل کی ہے۔

جدید دور کے رجحانات اگرچہ ہمیں کسی اور رخ پر اکساتے ہیں لیکن ایک یقینی صورت حال ہمیں اسی تصور میں ملتی ہے جو قرآن اور اس کے پیامبر نے ہمیں ۱۴۰۰ برس قبل دیا۔ بہر حال ایک لائحہ عمل دے دیا گیا ہے جو موجودہ دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے میں بھرپور مدد دے سکتا ہے اور مزید علوم، اجتہاد اور دیگر تحقیقی کاوشوں کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے اور اس طرح معاشرے کو صحت مند خطوط پر استوار کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ دور لادینیت کے علاوہ ایک ترقی یافتہ اور سائنٹیفک دور ہے جس میں قرآن اور دین کے نظریات کو مناسب علمی دلائل اور راور فکر و

۱۔ اقبال سید حسین۔ کتابوں کی فہرست

Marfat.com

عمل کے بغیر ذہن نشین نہیں کرایا جاسکتا۔ اس لیے ان تمام امور کا جائزہ لینا ضروری ہے جو کھرے کھوٹے کو اچھی طرح پرکھ سکیں اور ہمیں قرآن اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرسکیں۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اب تک جو علمی کاوشیں ہو چکی ہیں ان میں کون سی زیادہ اقرب الاضراب ہے اور ہم کس طرح ان کا تجزیہ کر کے انہیں اپنے لیے اسوہ عمل بنا سکتے ہیں۔

یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو عرصہ سے چل رہا ہے اور عرصہ دراز پر محیط ہے۔ اس کو ہم اسی وقت ایک پختہ شکل دے سکتے ہیں جبکہ ہم وہ تمام مناسب ذرائع اپنی علمی اور فکری کاوشوں میں شامل کرسکیں جن کی وقتاً فوقتاً ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا مشن ہے جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چل رہا ہے اور آنحضورؐ سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ اور اس کی روشنی میں ہمیں اسے آگے پہنچانا ہے۔ علم و دانش کے اس عظیم ذخیرہ سے ہم بخوبی مستفید ہوسکتے ہیں اگر سنجیدگی سے ہم اسے تحقیق و ترویج کی نظر سے دیکھیں اور معروضی حقائق کے حوالے سے آشکارہ کریں۔ تب ہی ہم جدید دور کے چیلنج سے موثر انداز میں نبرد آزما ہوسکیں گے اور یہ ثابت کرسکیں گے کہ قرآنی شعور سائنس اور فلسفے سے بھی پہلے وجود میں آیا اور اس کی وسعت اور رفعت ہمارے لیے ایک بہت بڑے اعجاز کی بات ہے۔ یہ شعور ان منازل کی نشاندہی کرتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے نقطہ عروج ہیں اور ہمیں ان تک پہنچنا ہے۔

Marfat.com

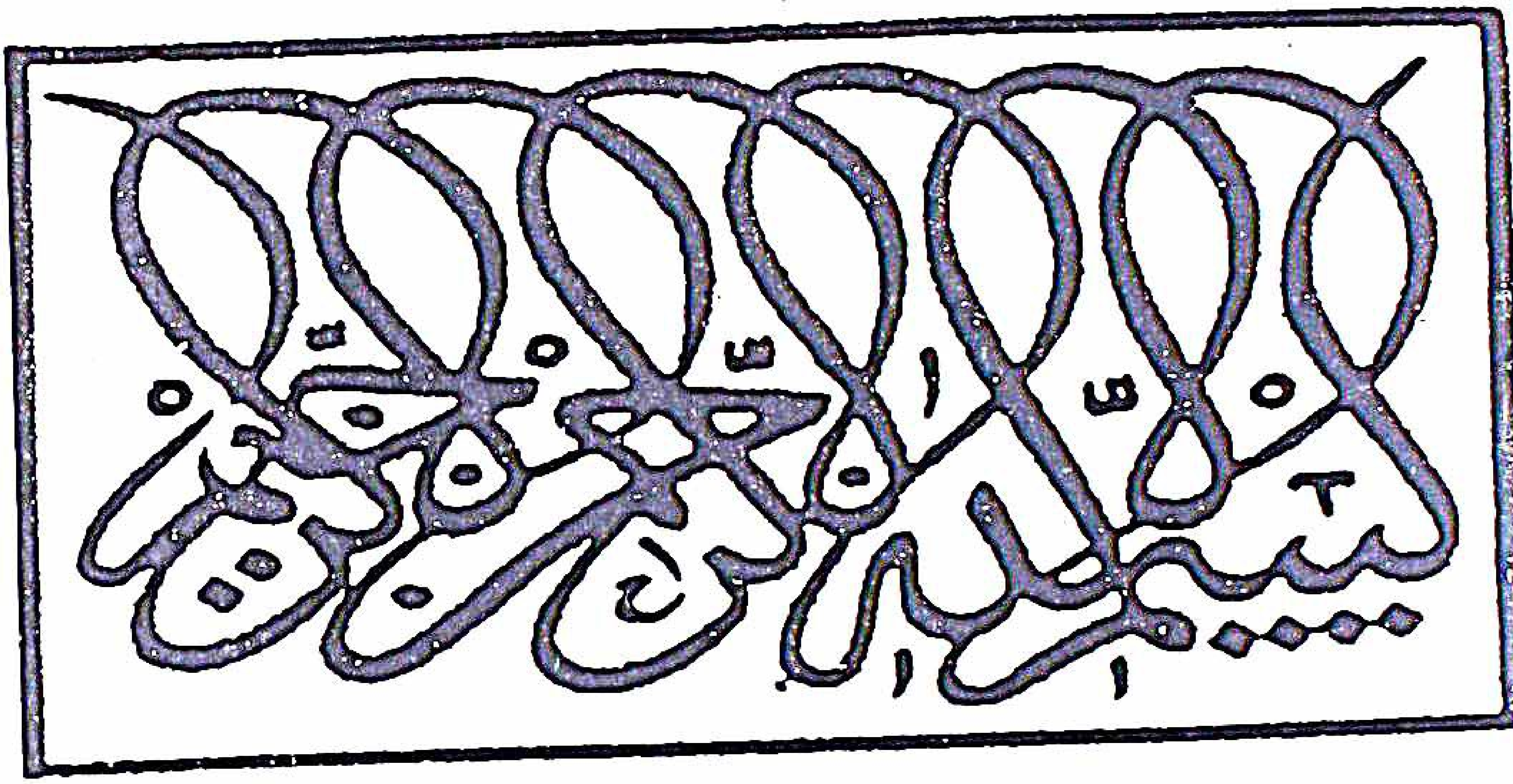

قرآن کی حسن کاری اور تخلیق کاری

قرآن ہمیں ایک ایسا معجزہ دیتا ہے جو کہ نہ صرف گزشتہ ادوار میں حقانیت آشکارہ کر چکا ہے بلکہ جدید دور میں بھی اپنی فکر و نظر سے عالم اقوام کو متاثر کرتا آ رہا ہے۔

قرآن میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر دور میں سوچ و فکر رکھنے والوں کو ایک نظر دے سکے اور انہیں انفرادی اور سماجی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم آج اس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اسے موجودہ دور کی تحقیقات و دریافت کی روشنی میں پرکھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اس کو پرکھنے کی پوری طرح اہلیت نہیں رکھتے اور اس کے تمام پہلوؤں کا بخوبی احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ موجودہ سائنس بھی انہی تمام ایجادات اور تحقیقات کے باوجود اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکی ہے کہ کچھ وہ ان تمام حقائق کو عمیق نگاہ سے دیکھ سکے جن کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے۔ نظام کائنات کو قائم کرنے کے لیے اس نے جو قوانین وضع کئے ہیں ان کا احاطہ کرنا بھی خاصا مشکل کام ہے۔ ذہانت و فراست، حکمت و دانش ایسی خوبیاں ہیں جو قرآن کی آیات میں ہمیں ایک تواتر کے ساتھ نظر آتی ہیں ان خوبیوں سے ہم اپنے حالات کے مطابق استفادہ کر سکتے ہیں اور خوبیاں مزید عیاں ہوتی جائیں گی جوں جوں ہم اپنے تعصبات اور دینی پیچیدگیوں کے چنگل سے اپنے آپ کو آزاد کریں گے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جیسا کہ سائنس کے میدان میں نئی تحقیقات معرض وجود میں آ رہی ہیں توں توں یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ قرآن نے پہلے ہی ان کی طرف اگر تفصیلاً نہیں تو اشارۃً ہماری توجہ دلا دی ہے۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی علمی اور ذہنی قوتوں کو بروئے کار لا کر قدرت کے مناظر کو مزید

Marfat.com

گہری نگاہ سے دیکھ سکیں اورانہیں اپنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لا سکیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ جبکہ سائنس اپنی تحقیقات کے دوران کچھ ایسے مسائل سے دوچار ہوتا ہے جو کہ اس کی تحقیقات کے ایک حصہ کی تردید کررہے ہیں۔لیکن قرآن کا علم ان تضادات سے مبرا ہے اوراس کے حقائق اٹل ہیں۔

اس لیے قرآن کو کسی ایسی سائنٹیفک دریافت کی ضرورت نہیں جو اس کے پیش کئے گئے حقائق کی تصدیق کریں سائنس کی تصدیق یا تردید کے باوجود قدرتی حقائق جوں کے توں رہیں گے اور اپنی حقانیت ثابت کرتے رہیں گے۔انسانی ذہن اگرچہ بہت سے علوم کو جنم دیتا ہے لیکن وہ تمام رموز کا حامل نہیں ہے۔اس کے لیے ہمیں الہامی کتابوں کی مدد لینا پڑتی ہے۔یونانی فلسفی افلاطون کا بھی یہی خیال ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے۔

انسانی صلاحیتیں اگرچہ بہت ضروری ہیں لیکن انہیں دائمی سچائی کا سرچشمہ نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی ان پر اس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔جس طرح ہم قرآن مجید پر کرسکتے ہیں۔

ایک مغربی مفکر [1] اپنی کتاب ''تاریخ فلسفہ'' میں اسی بات کا اعادہ کرتا ہے۔وہ کہتا ہے

''خیالات ہم تک پہنچنے والے حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔لیکن وہ بذات خود ان اصولوں کو جنم نہیں دیتے جو ان کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں یہ ایسے اصول ہیں جو ہمیشہ سے قائم ہیں اور ہمیشہ آنے والے حالات کا احاطہ کرتے رہیں گے۔یہ اس دائمی حقیقت پر مبنی ہیں جو خالق حقیقی کی عظیم ذہانت سے مترشح ہوتی ہے۔''

اس لیے قدرتی نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن اور دیگر الہامی کتابوں کا سہارا لینا پڑے گا۔اور جو اس دائمی علم سے وجود میں آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کردی جائے کہ تمام علم اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔اور انسان کا دماغ صرف وہی کچھ اخذ کرسکتا ہے جو دائمی ذرائع سے انسان تک پہنچے۔انسان کا دماغ اگرچہ بہت اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کی استعداد کار بھی بہت وسیع ہے۔لیکن تاہم اس دائرہ لامحدود نہیں اور یہ

۱۔فریڈرک کاپلبسٹون ''تاریخ فلسفہ''

Marfat.com

بذات خود وہ علم نہیں رکھتا جو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ انسان کا دماغ صرف وہی کچھ اخذ کر سکتا ہے جو دائمی ذرائع سے انسان تک پہنچتا ہے۔

بہر حال دماغ سوچ و فکر کا منبع ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ نا قابل تردید ہے۔ سوچ و فکر کے ذریعہ یہ وہ دھارے پیدا کرتا ہے جو کہ کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔

اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آنحضورؐ نے فرمایا کہ انسان کا ذہن اور اس کی ذہانت سب سے عظیم تخلیق ہے جو اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام اور اس کے احکامات کو سمجھنے کی اہلیت میں ہی پیدا ہوتی ہے جو ہم ذہنی صلاحیتیں اس طرف مبذول کرتے ہیں۔

اس لیے قرآن کے معنی انہی لوگوں پر آشکارہ ہوتے ہیں جو اپنے ذہن کو اس کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور قرآن کے اوراق اور آیتوں پر غور و فکر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جوں جوں ہم قرآن میں دلچسپی لیتے ہیں تو بتدریج اس کے معنی و مطالب ہم پر واضح ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

اس کا ادراک اور تصور انسان کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتا ہے۔

تب وہ راز و رموز ظاہر ہوتے یں جن کا متلاشی ایک محقق ہوتا ہے اس طرح صرف وہی لوگ اس سے زیادہ مستفیض ہوتے ہیں جو اس کے اوراق کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

اس کا اثر الولید المغیرہ جیسے شخص پر بھی ہوتا ہے جو کہ آنحضورؐ اور قرآن سے نہایت نفرت کرتا تھا لیکن جونہی اس نے کچھ توجہ اس کی آیات کو دیں تو اس کے مضمرات اس پر آشکارا ہونے شروع ہوئے اور وہ ان سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ابوجہل سے کہا کہ جو آیات آنحضورؐ پڑھتے ہیں وہ اپنے معنی و مطالب کے اعتبار سے بلند پایہ اور گہری اہمیت کی حامل ہیں ان کی خوبصورتی اور حقانیت ان الفاظ سے عیاں ہے جو ان کی بناوٹ میں استعمال کیے گئے ہیں۔

اس لیے ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید ایک ایسا معجزہ ہے جو حقائق اور مطالب کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو ذہنی بلوغت، فراست اور حکمت سے بھرپور ہے۔

Marfat.com

اس کی گہرائیاں سمندر سے عمیق اور اس کی بالیدگی آسمان سے بلند ہے اس کی سچائی دائمی ہے اور یہ ہمیشہ رہنے والا کرشمہ ہے

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ معجزہ سب سے پہلے ان لوگوں پر نازل ہوا جو جہالت، پسماندگی اور معاشرتی علوم سے کوسوں دور تھے۔ مکہ کے مشرکین اپنی جہالت کے سبب ذہنی بلوغت کے سب سے پسماندہ سطح پر تھے لیکن اس کے باوجود ایسی عظیم کتاب ان پر نازل کی گئی اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو جھنجھوڑا گیا۔

وہ حیران تھے کہ ایسی عظیم کتاب ایسی اعلیٰ ذہنی بلوغت وحکمت اور خوبصورت زبان میں لکھی ہوئی کس طرح ان تک پہنچی ہے ان کا خیال تھا کہ کوئی شر پسند عناصر اس کے پیچھے ہیں جو آنحضورؐ کو لکھ کر ان کے حوالے کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے شہریوں کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ وہ اپنے لیے نجات کا راستہ علم میں نہیں بلکہ جہالت میں دیکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک وحدانیت اور ربوبیت کا تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک واحد خدا سینکڑوں ہزاروں خداؤں کی موجودگی میں ان کی ضروریات پوری کر سکے گا اور ان کی رہنمائی کا باعث بن سکے گا۔

یہ تاریخ انسانی کا ایک عجب موڑ تھا جس کا رخ کسی طرف بھی مڑ سکتا تھا۔ لیکن چونکہ پیغام ابدی حقیقت پر مبنی تھا اس لیے اس کا دھارا صحیح سمت میں جانا ہی مقصود تھا آخر کار ہم نے دیکھا کہ تاریخ نے کیا رخ لیا اور حالات کیونکر بہتری کی جانب بدلے۔ یہ نہ صرف فکر ونظر کی تبدیلی لائے بلکہ ایمان کامل اور عملِ صالح کا سبب بھی بنے۔

تاریخ نے ہمیں سبق دیا کہ حقانیت اور استقامت کے ساتھ حالات کا رخ بدلا جا سکتا ہے اور افراد اور معاشرے کے لیے بہتری کے اسباب پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور سوال جو لمحہ فکر یہ تھا وہ آنحضورؐ کی رسالت کے بارے میں تھا۔ یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ تمام امیر لوگوں، اعلیٰ مرتبہ شاعروں اور قبیلوں کے رہنماؤں میں سے ایک غریب، یتیم، مسکین کو اس بلند وبالا مقام کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ اس خیال کے نہ صرف مخالف تھے بلکہ اس پر نہایت نالاں بھی تھے۔

وہ یہ مقام کسی ایسے شخص کے حوالے کرنا چاہتے تھے جو واقعی ان کا لیڈر بننے کا اہل ہو۔ [1] اس لیے

اس دور کی تاریخ کا یہ بھی ایک المیہ تھا کہ اس قسم کے تضادات باہمی ہم آہنگی کی راہ میں حائل تھے لیکن چونکہ یہ فیصلہ ایک اٹل فیصلہ تھا اور معجزے کی صورت میں رونما ہوا تھا اس لیے ناگزیر تھا۔ اور علم و دانش پر مبنی تھا۔

قدرت نے اس فیصلے کے ذریعے بہت سے ایسے فیصلے کرنے تھے جو تاریخ عالم کے لیے لازمی تھے۔ انہوں نے انسانیت کو فلاح و بہبود کا سبق دینا تھا اور انسان کو اس کی منزل کے قریب لانا تھا۔

مزید برآں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ دولت اور امارت سے انسانی اخلاق، شرافت اور نجابت کے میار قائم نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے اعلیٰ ظرفی۔ ذہنی بلوغت اور اخلاقی اقدار کا ہونا بھی بہت ضروری ہے اور یہ تمام خوبیاں اتم درجہ میں صرف ایک ہی شخص میں پائی جاتی تھیں۔ جس کا نام محمدؐ تھا۔ اور اسے اس معجزے کا اہل سمجھا گیا تھا۔ اور ان پر اس کا نزول ہوتا تھا۔ یہاں یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ علم و دانش کے دھارے انہی لوگوں پر کھلتے ہیں جو سمجھ بوجھ کو اپناتے ہیں اور حقائق کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔

اسی صورت میں دل و دماغ روشن ہوتے ہیں اور روح کو وہ بالیدگی میسر ہوتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ ان عزائم کا اعادہ ہمیں پختہ شخصیتوں میں ہی نظر آتا ہے جو ایمان و یقین، حکمت و فراست کی خوبیوں سے مزین ہوتی ہیں۔

قرآنی معجزے کا ایک اعزازی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ۱۴۰۰ برس گزرنے کے بعد بھی اتنا ہی تر و تازہ ہے جتنا کہ نزول کے وقت تھا۔ اس کا ہر لفظ اور آیت اسی معنی اور مطلب کی حامل ہے جو اس کے نزول کے وقت تھی یہ امتیازی خصوصیت اسے وہ اہمیت دیتی ہے جو دوسری کتابوں میں منقود ہے۔ حقیقت میں تو اس کے تشریحات ابھی تک پوری طرح آشکارہ ہو نہیں سکی کیونکہ وہ لوگ جن کی طرف یہ نازل ہوئی اپنی صلاحیتوں کو اس کام کی طرف مبذول نہ رکھ سکے اور تحقیق و عمل کی راہ ان لوگوں نے اختیار کی جن کا قرآن سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقائق اور مطالب کچھ اور انداز میں پیش کیے گئے لیکن اس کے باوجود

ا۔ قرآن مجید ۳۱:۳۴

Marfat.com

قرآنی حقائق کو جھٹلا یا نہیں جاسکا۔قرآن ایک ایسی ابدی حقیقت کی صورت میں ظاہر ہوا کہ اس کا اثر مسلسل ظاہر ہوتا رہا ہے اور بتدریج پھیل رہا ہے۔یہی قرآن کی حُسن کاری اور تخلیق کاری ہے۔

غیر یقینی صورتحال

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مشرکین مکہ کی مخالفت آنحضورؐ سے کسی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ ان شک و شبہات کی بناپر پیدا ہوتی تھی جو کہ انؐ کے فرسودہ خیالات ونظریات کو چیلنج کرتے تھے اور انہیں وحدانیت کا سبق دیتے تھے ان معززین مکہ نے ایک مضبوط بلاک ابوجہل اور ابولہب کی صدارت میں قائم کرلیا تھا اور اس کے تحت مختلف قسم کے مظاہرے کرتے رہتے تھے ان کا مقصد آنحضورؐ کو مجبور کرنا تھا کہ وہ دوبارہ انکے نظریات کو قبول کرلیں اور ان خداؤں کی مخالفت نہ کریں جو ان کے اور ان کے آباواجداد کے والی اور محافظ رہے ہیں۔

یہ ایک ایسا مخمصہ تھا جس سے نکلنا ان کے بس کا کام نہیں تھا اور تقریباً ایسی ہی صورت حال جدید دور کے لادینی اور مادہ پرست حلقوں میں پائی جاتی ہے جو غیر یقینی صورت حال میں مبتلا ہیں اور دینی نظریات سے دن رات متصادم رہتے ہیں خود ساختہ روشن خیالی۔کمیونزم اور سوشلزم اور ایسے دیگر لادینی نظریات پر اپنے عقائد اور عوامل کا یقین کرتے ہیں۔اس طرح وہ ایسے نظریات کا شکار ہوجاتے ہیں جو انہیں کی اخروی فلاح و بہبود کی راہ میں بری طرح حائل ہوتے ہیں۔

اگر چہ لادینیت اور مادہ پرستی تقریباً ہر دور کے غالب پہلو رہے ہیں لیکن ان کی بدولت انسانیت کافی حدتک پریشانی اور غیر یقینی صورت حال سے دوچار رہی ہے اور تقریباً یہی حالت موجودہ دور کے مغربی حلقوں میں پائی جاتی ہے اور تیزی سے مشرق کی طرف عود کر رہی ہے جہاں مادہ پرستی کے ساتھ بے راہ روی منافقت اور اخلاقی زوال کی صورت بھی پیدا ہورہی ہے۔

بہر کیف قرآن کا معجزہ موجود ہے اور وہ اپنی معجزاتی کیفیات سے دنیا میں روشنی پھیلا رہا ہے۔

یہی سب سے بڑا ذریعہ ہے جو دنیاوی فلاح و بہبود اور اخروی نجات کا سبب بنے گا۔لیکن ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے اصولوں پر نہیں چلتے اور نہ ہی انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Marfat.com

سرچشمہ علم

اگرچہ قرآن علمی، ادبی اور روحانی اعتبار سے رشد وہدایت کی کتاب ہے لیکن اس کے ایسے واضح اشارے بھی ہیں جو طبعی دنیا میں سوچ وفکر کی بھی دعوت دیتے ہیں۔

آفاقی، جغرافیائی اور طبعی کیفیات کی طرف اس کے واضح اشارے جو ۱۴۰۰ برس پہلے دیئے گئے تھے اب تک ہماری توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ سائنسدان ان پر دن رات کام کر رہے اور گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہیں۔

چند ایک حقائق جن کی طرف قرآن نے واضح اشارے دیئے ہیں وہ کائنات میں پھیلے ہوئے نظام شمسی کرہ ارض کی حرکات اور کائنات کے عناصر ہیں وہ توازن، دل ودماغ سے متعلقہ امور اور انسانی و طبعی نشوونما کے مسائل سے متعلق ہیں۔

غور وفکر اس امر پر دینے کی ضرورت ہے کہ یہ بنیادی حقائق اگر سچائی پر مبنی نہ ہوتے اور خالق حقیقی کے علم میں نہ ہوتے تو کسی طرح وہ قرآن کے اوراق کی زینت نہ بنتے۔

لیکن قرآن کے نزول کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ان حقائق پر ایک، سائنسدان کی حیثیت سے گفتگو کرے بلکہ ان امور پر مزید تحقیق کی جائے اور اس کے لیے انسان کو ضروری ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے نوازدیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ان مسائل کا جائزہ لیا اور پیش رفت کا عمل جاری رکھا انہوں نے چاند پر اپنے پاؤں جمادیئے اور جو لوگ اس سے غافل ہوئے وہ قرآن کے حامل ہونے کے باوجود اس کی برکات سے محروم رہے۔ قرآن نے اپنی برکات کا دائرہ تنگ نہیں رکھا بلکہ اسے کائنات کی وسعتوں میں پھیلا دیا ہے۔

علم کے منبع ہونے کی حیثیت سے قرآن کا دائرہ فکر بہت وسیع ہے۔ وہ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم برابر اس پر غور وفکر کریں اور اپنی زندگی کو اس سے مستفیض کریں۔ ذہنی وسعتوں میں اسی وقت پھیلاؤ آسکتا ہے جبکہ ہم اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح بروئے کار لائیں۔ غفلت اور جہالت کا لبادہ جو ہم نے اوڑھ رکھا ہے اس سے نکلیں۔ اس عمل کو دہرانے سے ہی ہم اپنی زندگی میں تبدیلی لاسکیں گے اور وہ انقلابی شعور پیدا کرسکیں گے جس کا داعی قرآن ہے۔

Marfat.com

ان علوم کا احاطہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جن حقائق کی طرف قرآن نے اشارہ کیا وہ پچھلی صدیوں میں تحقیق و دریافت کے مرحلے طے کرنے کے بعد اٹل حقیقت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ سائنسدان اپنی علمی کاوشوں کی بدولت اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکے ہیں جو ایک تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ تہذیب کا خاصا ہوتی ہیں۔ اگر قرآن کے اشارے درست نہ ہوتے تو جدید دور کی ترقی ان خطوط پر نہ ہوتی جن کی طرف قرآن نے ہماری توجہ مبذول کرائی تھی۔

اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اشارے اس وقت دیئے گئے تھے جبکہ حجاز میں کوئی درسگاہ ایسی نہ تھی جو ان علوم میں مصروف کار ہوتی۔ اور خود اس علم کے حامل پیغمبر اسلام آنحضورؐ امی تھے جو کبھی کسی مدرسے یا تعلیمی درسگاہ میں نہیں گئے تھے۔

ان ٹھوس شواہد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی حقانیت ایک بنیادی حقیقت ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ قرآنی حقائق کی تائید علوم حاضرہ نے واضح طور پر کردی ہے زمین اور آسمان کا ایک دوسرے سے جدا کیا جانا۔ پیدائش اور نشوونما کا پانی پر انحصار، کائنات کا گیس کی ضرورت میں ابتدائی وجود، قوس قزح، ستاروں اور کہکشاہوں کا نظام اور ایسے ہی کئی حقائق جن کی طرف قرآن واضح اشارے کرتا ہے اور جنہیں جدید سائنس کی تائید حاصل ہے ہمیں وحدت کائنات اور زندگی کے رموز سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ منکرین وحدانیت اس کا انکار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے۔ [1]

بلاشبہ ان حقائق کا اظہار اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ایک بہت ٹھوس دلیل ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے ذریعہ اخرتیتس (Cosmology) کے بارے میں بھی ذکر کرتا ہے سورۃ فصلات (۴۱) آیت (۸۹) میں فرماتا ہے۔

''کہ کیا یہ لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں۔ جس نے زمین کو دو روز کے قلیل عرصے میں پیدا کردیا۔ اس نے اس زمین پر پہاڑ بنادیئے۔''

ا۔ قرآن: سورۃ البنیا آیت نمبر ۳۰

Marfat.com

اگر چہ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے کہ دو روز سے مراد کیا ہے اور اس میں کتنا عرصہ درکار ہوا۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اس زمین و آسمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس کی پیدائش اور افرنیش میں کون سے مراحل پیش آئے۔ ہمیں تو دعوت اس پر ایمان لانے کی دی گئی ہے اور اگر ممکن ہو تو اس کو سائنٹیفک بنیاد پر حل کرنے کی۔

قرآن حکیم صراحت کے ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر کرتا ہے اور رموز حیات سے آگاہ کرتا ہے۔ اللہ کی تخلیقی قوتوں میں ایمان پختہ کرنے کے ساتھ انسان کے علم میں اضافہ کرنا بھی مقصود ہے تاکہ زمینی اور آفاقی حقائق کو سمجھا جاسکے۔ ایک مغربی ماہر فلکیات (Cosmologist) سر جینس جیمز (Sir Janes James) اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے

''اغلب خیال یہ ہے کہ مادہ تکوینی شروع میں گیس کی صورت میں فضاء کے درمیان ایک منظم صورت میں منتشر ہونا شروع ہوا اور بلاشبہ بادل (Nebular) اس گیس کی ثقافت سے پیدا ہوئے۔ [1] اور اس کی تائید فزکس کے ایک اور پروفیسر گامو (Gamow) بھی اپنی کتاب میں کرتے ہیں۔

''بلاشبہ کائنات اپنی ابتدائے آفرنیش میں ایک ایسے گیس سے بھری ہوئی تھی جو منظم طور پر منقسم تھی۔ یہ گیس کثافت اور درجہ حرارت میں اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ اسکا تصور ناممکن ہے۔ اور اس گیس کے مختلف عناصر ہیں۔ اس کے بعد تو وہی (Nubalar) تبدیلیوں کا عمل واقع ہوا اور زبردست دباؤ کے تحت یہ (Compressed) ہوئی اور یہ گرم گیس ہلکی ہوئی اور پھیلنا شروع ہوگئی اور مادہ کی کثافت اور اسکی حرارت دونوں گرنا شروع ہوگئے اور بادلوں کی صورت میں منتظم طور پر منتشر ہونے لگی اور اس کے بعد ستاروں کا عمل شروع ہوا جو زمین سے علیحدہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئے''

۱۔ سر جینس جیمز کی کتاب ''طبیعات'' دیکھیں۔ یونیورسٹی واشنگٹن

تو یہ تمام حقائق جو ہمیں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے قرآن کی زبانی معلوم ہونے اور جن کی تصدیق آج سائنسدان کررہے ہیں وہ کسی انسانی اختراع کا نتیجہ نہیں ہوسکتے اور جبکہ اس کا پہنچانے والا بھی ایک ایسا شخص ہے جس نے کبھی کسی مدرسے یا درسگاہ سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ ہٹ دھرمی اکثر حقائق کو تسلیم کرنے میں حائل ہوتی ہے۔لیکن آج کی سائنس ہمیں اس موڑ پر لے آئی ہے جہاں قرآنی حقائق سے منہ موڑ ناممکن نہیں۔

اسی طرح قرآن اور بہت سے رموز کو بیانکرتا ہے جنہیں موجودہ سائنس کی پیش رفت کا سبب کہا جاسکتا ہے۔آفرینش کائنات کے سلسلے میں ایک اور آیت جو قابل ذکر ہے سورۃ الذریات (۵۱) کی آیت نمبر ۴۷ ہے۔

اس میں آسمان کی پیدائش اور وسعت کا ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے پیدا کیا اور بلاشبہ ہم ہی اس میں وسعت پیدا کرنے والے ہیں''

آئن سٹائن (Einstein) جو اس دور کا ایک بہت بڑا سائنسدان ہوا ہے کہتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت میں اربوں ٹن گیس (Nebulae) کے بادل سما سکتے ہیں کہ جن میں ہر بادل کروڑہا مشتمل نجوم پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ [۱]

قرآن حکیم میں دیئے ہوئے دلائل اور سائنس سے ثابت شدہ حقائق اللہ تعالیٰ کے وجود کی علامت ہیں۔کائنات کی رعنائیاں اور آفتاب و ماہتاب کی فراوانیاں اللہ کے وجود کی نشانیاں ہیں۔انسان کی تخلیق اور اس کی صلاحیتوں کا استعمال ایمان اور یقین میں اضافہ کرتا ہے۔اور انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ایک دائمی تخلیقی قوت کے غیر موجودگی میں ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا انسان کے نفس میں ودیعت کیا گیا ہے اور یہی تمام فیضان کا سبب بنا ہوا ہے۔

کائنات کا وجود اور انسان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں کا فروغ جہاں اللہ تعالیٰ کی تخلیقی قوتوں کا اظہار

۱۔آئن سٹائن اینڈ دی یونیورس

ہے وہاں وہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ عقیدہ ایک مثبت انداز میں وجود میں آیا اور تاریخ انسانی پر اثر انداز ہوا۔ اس کے بغیر تہذیب وتمدن کا فروغ ممکن نہ ہوتا۔ بنیادی اقدار قائم نہ ہوتیں اور انسانی بقا کا سلسلہ ایک مہذب اور منتظم طریقہ سے عمل میں نہ آتا۔

تاریخ کا مطالعہ مختلف پہلوؤں سے اس حقیقت کا احاطہ کرتا ہے اور ہمیں مزید فکرونظر کی دعوت دیتا ہے۔ فکرونظر اور علمی اور عقلی دلائل انسان کو پختہ بنیادوں پر اپنے ایمان کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں اور یہی قرآن کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ عقل اور دلائل کو پس پشت نہیں ڈالتا۔ وہ اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ بغیر سوچے سمجھے یقین اور ایمان کا راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم نے کائنات اور انسان کی تخلیق کے سلسلے میں تجزیہ کیا ہے وہ اس حقیقت کے بہت قریب ہے۔ اللہ کے وجود کو ثابت کرنے میں فرار حاصل نہیں کرتا۔ قرآن کی آیتیں با آواز بلند انسان کو سوچ وفکر کی طرف مائل کرتی ہیں اور ایمان کے استحکام کے لیے لازم قرار دیتی ہیں۔ انسان کی دلی بے یقینی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی کہ اسے زبردستی بغیر سوچ سمجھ کے کسی چیز کو قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا ہو جو اس کی عقل سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ کیونکہ قرآن کے دلائل واضح طریق سے اللہ کی ذات کے ثبوت میں دیئے جاسکتے ہیں اس لیے سخت متعصب اور عقل سے بے بہرہ لوگ بھی مکمل طور پر اللہ کی ذات سے منکر نہیں ہوسکتے چونکہ زندگی کو کامیاب طریق سے گزارنے کے لیے ان اصولوں، قوانین کی ضرورت ہے جو اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوں اس لیے یہ لائحہ عمل کامیابی کی ضمانت دے گا اور اسے قبول کرنا آسان ہوگا۔ اگر قرآن کی اقدار وہ اقدار نہ ہوتیں جو انسانی بقا کے لیے ضروری تصور کی جاتی ہیں تو آج قرآن کا وہ خزینہ قابل قبول نہ ہوتا جو کہ اقوام عالم میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن نے انہی دلائل اور اقدار کی بنا پر ایسے تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی اور ایسی روشنی پھیلائی جو انسانی بقا اور عالمی امن کی ضامن بنی۔ قرآن ان تمام عوامل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک مغربی مفکر[۱] کہتا ہے کہ ''پانچویں چھٹی

۱۔ آئی۔ ایچ۔ ڈاسن۔ ماہر طبیعات واشنگٹن، امریکہ

صدی میں انسانی تہذیب بے زبونی کا حال تھی اور ایسے دہانے پر کھڑی تھی کہ مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی۔ بہت سے تہذیب وتمدن کے جذباتی سہارے بھی ارتعاش کا شکار تھے اور ان کی بقاء کی کسی صورت میں ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

ایسے موقع پر ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس کا نام محمدؐ تھا اور جو تمام اقوام کو بھائی چارے اور یکجہتی کے دھارے میں سمو سکتا تھا اسکا دائرہ عمل مشرقی اور جنوبی ساحلوں تک جا پہنچا اور اس نے اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچالیا''

قرآن کے علمی اور عقلی دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اور مغربی سائنسدان (سرسفیلڈ) کہتا ہے

''ہمیں اس بات پر مطلقاً حیران نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن سائنس کا بھی منبع ہے اس کتاب میں ہر وہ مضمون جس کا تعلق انسانی فلاح و بہبود، تجارت، کائنات کی تخلیق یا انسانی عقل سے ہو اس کے اوراق کی زینت بنا ہے یہ انسان کے مسائل سے غافل نہیں اور انہیں حل کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن نے وہ تمام راہیں پیدا کر دیں جو مسلم دنیا میں علم ودانش اور اور سائنس کے فروغ کا باعث بنیں۔

یہ علوم صرف مسلم ممالک تک ہی محدود نہ رہے بلکہ یہودی مفکرین اور محققین کی توجہ کا بھی باعث بنے۔ اس کی روشنی میں مغرب کے سائنسدانوں نے مزید ترقی کی اسی طرح عیسائی دنیا بھی اس سے کافی حد تک مستفید ہوئی جواب تاریخ کی کتابوں میں اچھی طرح درج ہے (ہیرنگ ہرشفیلڈ)[۱]

موجودہ (۲۱ ویں) صدی میں جبکہ سائنس اور معاشرتی علوم میں تیزی سے پیش رفت ہو رہی ہے اور مزید ایسے ابواب کھلیں گے جو قرآن کی حقائیت کو مزید گہرائیوں سے مطالعہ کرنے میں مدد دیں گے۔

مزید برآں نئے علمی اور عقلی حقائق آشکارا ہونے سے عالمی سطح پر اس کا مزید اثر ورسوخ بڑھے گا اور وہ ایسے حلقوں کو بھی اپنی طرف مبذول کر سکے گا جو اب تک اس کے دائرہ اثر سے دور ہیں۔ اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے قرآن کی زبان میں یہ کہا جاسکے گا۔

''آپ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو اور دیکھو کہ کیا چیزیں ہیں آسمانوں اور زمین میں اور جو لوگ (عبادت)

۱۔ ہیرنگ ہرشیفلڈ کی کتاب کے تجدین اور تحریر میں تحقیقی مقالے ولندن

Marfat.com

ایمان نہیں لاتے ان کو دلائل اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتے'' ۔[۱]

اس لیے قرآنی آیات آئندہ آنے والے حالات اور روشنی کے دور میں دلائل کی طرف مائل دماغ وروحوں کے لیے زیادہ قابل قبول ہوں گی اور علم و دانش کی روشنی میں یہ پرکھا جاسکے گا کہ جو حقائق قرآن نے ۱۴۰۰ برس پہلے پیش کئے تھے وہ کہاں تک اپنے اثر ورسوخ میں مزید مستحکم ثابت ہو رہے ہیں اور کس طرح قرآن نے سینکڑوں دنیائیں اپنی آیات میں سموئی ہوئی ہیں ۔ جن میں جھانکنے کی کوشش ہم اپنے اگلے باب میں کریں گے ۔

۱۔ قرآن مجید: سورۃ یونس ۔ آیت نمبر ۱۰

Marfat.com

یاں بُلبُل اور گُل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گُل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغِ چمن نشاں ہے کسو بے زبان کا

Marfat.com

Marfat.com

پیمائش زمان و مکان ﴿باب۴﴾

مقام فکر۔ مقام ذکر

یہ بھی ایک عجب معرکہ انگیز منظر ہے کہ ہم قرآن کی آیات میں سینکڑوں دنیائیں دیکھتے ہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی بہت زیادہ ہوں کیونکہ ہزاروں کہکشائیں، ستارے اور سیارے ہمارے مشاہدے اور علم سے باہر ہیں۔ یہاں تک دن تگ ودو کرنے والے سائنسدانوں اور ماہرین افلاک کو بھی اسکا علم نہیں ہے۔

بہرکیف۔ آج کا موضوع ہمیں یہ موقع دے گا کہ ہم اس بارے میں کچھ فطرت کی گہرائیوں میں جھانک سکیں اور ذکروفکر کے ساتھ زمان ومکان کی پیائش کرسکیں۔

یہ منظرنامہ اس لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ قرآن مجید کو نہ ماننے والے خود اس کا ادراک کر رہے ہیں اور اس حقیقت کا اعتراف کرر ہے ہیں جسکا قرآن نے ۱۴۰۰ برس پہلے انکشاف کیا تھا۔ اس سے اللہ اس کی الہامی کتاب ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ سوال ہم ان لادینی حضرات سے کرتے ہیں جو حقائق ابدی کے منکر ہیں۔

اس لیے اب ہمیں ایک بار پھر یہ کہنا پڑے گا کہ قرآن حکیم کو سنجیدگی سے پڑھنے اور اس پر گہری نظر سے غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہوگا کہ قرآن مجید کو پس پشت ڈالنے کا رجحان عموماً مسلمان ملکوں میں زیادہ پایا جاتا ہے جہاں اسے غلاف پہنا کر الماریوں کی زینت بنادیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان قرآن کا نہ ہی تو بخوبی مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس پر غوروفکر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے بقدر ضرورت مستفید نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زوال پذیر ہیں۔ جبکہ وہ

Marfat.com

قومیں جنہوں نے اس پر غور و فکر کیا اور اس کے اشاروں کو سمجھا آج چاند ستاروں کی دنیا میں قدم رکھ چکی ہیں۔

قرآن مجید کے اشاروں اور کنائیوں کو سمجھنے کے لیے اور آئینی اور آفاقی حقائق کا جائزہ لینے کے لیے ان مصدقہ کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو قرآنی ہدایات کی روشنی میں لکھی گئی ہیں اور قرآن اور احادیث کی تفاسیر پر مبنی ہیں چونکہ یہ کتابیں علماء اور محققین کے قلم سے لکھی گئی ہیں اس لیے ان کے ذریعہ زمین اور آسمان کے اضافی دریچے کھولے جا سکتے ہیں۔

قرآن کو ان حقائق کی روشنی میں سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں ترقی کا عمل جاری ہے اور فطری اور قدرتی تقاضے نئے رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔

ان تقاضوں سے نبرد آزما ہونا لازم ہے۔ وگرنہ ترقی اور پیش رفت کے عمل سے انسان محروم ہو جاتا ہے سائنس اور معاشرتی علوم میں ترقی کے پیش نظر قرآن کریم کا اس نظر سے مطالعہ ضروری ہے تا کہ ان مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے جو ہمیں روزمرہ زندگی میں درپیش آتے ہیں۔ اس لیے قرآن کی وضاحت خصوصاً ایسے لوگوں کے لیے جو مختلف علاقوں میں رہتے ہیں اور دوسری زبانیں بولتے ہیں نہایت ضروری ہے۔ اس وضاحت کے بغیر قرآن مجید کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

اس لیے یہ کتاب ایک اس ضمن میں ایک سنجیدہ کوشش ہے کہ دوسرے دیسوں میں بسنے والے لوگوں کو قرآن کے مطابق معانی اور مطالب سے آگاہ کرتی ہے۔ آگہی انہیں اس قابل بنانے میں مدد کرے گی کہ وہ قرآن کی ہدایت پر عمل کر سکیں اور اس کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں ترقی کے مراحل طے کر سکیں۔

تشریح و تفسیر کا سلسلہ جو آج سے کئی سو برس پہلے جاری ہوا قرآن مجید کے مطالب بیان کرنے میں خاصا ممد و معاون ثابت ہوا اور اس کی ضرورت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ بلکہ بدلتے ہوئے حالات کی سنجیدگی کے پیش نظر یہ ضرورت مزید عیاں ہو گئی ہے اور عین اس طرف مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

ان کی بہت سی صورتیں مطلعات اور بہت سی متشابہات کی شکل میں ہیں۔ اس لیے ان کو بیان کرتے وقت یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کی کیا نوعیت ہے اور ان کا اطلاق کن حالات میں کس طرح ہوگا۔ اس ضمن میں قرآن کی صورتیں (۵:۱) اور ۱۷۳:۲ قابل ذکر ہیں ان میں مردہ جانور، خنزیر اور خون گوشت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ ان کو کن حالات میں کھانا اور نہ کھانا جائز یا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

اس لیے قرآنی آیات کو مترشح کرتے وقت ایسے تضادات کو دور کرنا ضروری ہے جو ظاہرہ طور پر متن کی صورت کو تبدیل کرنے کا احتمال رکھتے ہوں۔

علامہ مقاتل بن سلیمان جو 761 ہجری (150 سن عیسوی) میں فوت ہوئے اس ضمن میں انتہائی اہم کام کر چکے ہیں انہوں نے متنہاب القرآن تصنیف کی جو ایک اعلیٰ معیاری تفسیر تصور کی جاتی ہے۔[1]

آنحضورؐ کے زمانے میں یہ کام مکمل طور پر پیغمبر اسلام کے دائرہ اختیار میں تھا۔ اور وہ بذات خود تشریح و تفاسیر کے عمل کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ آنحضورؐ نے جو تفاسیر کیں وہ ان کی احادیث میں منتقل کردی گئی ہیں جو تفاسیر النبوی کے عنوان سے پہچانی جاتی ہیں۔

امام بخاری۔ ابن ماجد اور مسلم کے مجموعے جو اس سلسلے میں تیار کئے گئے یہاں قابل ذکر ہیں۔ اور ان سے آئندہ آنیوالی نسلیں متواتر مستفیض ہو رہی ہیں۔ اس سے قبل حضرت عائشہؓ اور حضرت عباسؓ کی تصانیف نے بھی قرآن حکیم کو سمجھنے میں خاصی مدد دی ہے کچھ مجموعوں کا تعلق تابعون سے ہے جو جیسا کہ المجاہد وغیرہ۔

پہلے چار خلفا کے دور میں عبداللہ بن عیک (وفات 68 ہجری) نے اپنی سنجیدہ کاوشوں سے کچھ تفاسیر کا مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ مزید برآں حضرت ابن مسعود۔ اے ابن کعب اور زید بن ثابت کا شمار بھی اعلیٰ مرتبہ مفسرین میں ہوتا ہے۔

بہر حال ہر دور میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے اور تشریح و تفسیر صحیح اور محققانہ انداز میں کی جائے اور

۱۔ مجاہد محمد الصواف۔ ''قرآنی تفاسیر پر ایک کمینٹری قاہرہ۔ مصر''

انہیں ان مسائل سے پیوست کیا جائے جو انسانی مسائل اور عصری دور کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکیں۔

حضرت ابن عباس کو اس ضمن میں بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔انہیں حبا الامہ بعدِ ترجمان القرآن کہا جاتا ہے۔ان کی تفاسیر کی حقانیت اپنی جگہ بہت مستحکم ہے اور ۱۴۰۰ برس گزرنے کے بعد اور سینکڑوں مفسرین کی کاوشوں کے باوجود ان کا مقام اپنی جگہ پر اٹل ہے۔

ان کی تفاسیر نے نہ صرف قرآن مجید کو سمجھنے میں مدد دی بلکہ اس کے فروغ میں بھی نہایت کامیاب رہیں اور مفکرین نے ان سے بہت زیادہ استفادہ حاصل کیا۔ابن کثیر جو کہ خود ایک بہت بڑے مفسر ہیں کہتے ہیں کہ اگر قرآن کی تفاسیر قرآن میں بذات خود یا احادیث میں نہ ملتی ہوں تو ہمیں آنحضورؐ کے صحابہ اور ان کے تابعین کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور وہی اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کے صحیح حقدار ہیں۔ نیز انکے اعمال وافعال سے انہیں سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ [۱]

ابن عباسؓ جو مکہ میں مقیم تھے انہوں نے تعلیم وتربیت کے فروغ کے لیے ایک اعلیٰ پایہ کا مدرسہ وہاں قائم کر رکھا تھا اور ان کے طلباء میں قابل ذکر مفسرین جبیر، مجاہدین جابر المکّی اکرمہ، طاؤس بن کیسان الیجانی اور طا بن ابلی رباخ قابل ذکر ہیں۔

دوسرا بڑا مدرسہ عراق میں تھا جس کے استاد حضرت ابن مسعودؓ تھے۔اس کے طلباء میں القمر بن قیس ،الاسوذ بن یزید، مسعود بن الاجادہ، الحسین بن بصری، قطع الاسودی اور ابراہیم النکامی کا شمار ہوتا ہے۔

تیسرا مدرسہ مدینۃ المنورہ میں تھا جس میں بہت سے طلباء تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ سب بلند پایہ مقام کے حامل تھے۔ان میں سب سے زیادہ ابے بن کعب جانے پہچانے جاتے ہیں۔

آئندہ آنے والے ادوار میں اعلیٰ مرتبہ مفسرین میں ان حضرات کا شمار ہوتا ہے۔

اسماعیل السودی، الضباح بن مزاھم، مقابل بن سلیمان اور مقابل بن حیان ہیں۔

آئندہ آنے والے ایام میں تفسیر کو احادیث سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کا علیحدہ شعبہ قائم کر دیا گیا۔اس کی صدارت ابن ماجد نے کی جن کا انتقال ۲۷۳ ہجری (۸۸۶ء) میں ہوا ان کے علاوہ ابن

۱۔ابن کثیر۔تفسیر قرآن العظیم۔قاہرہ

جزیرالتاری، ابن جاتم، ابوالشیخ الحکیم، ابوبکر بن مرداویہ وغیرہ تھے۔ [1]

بعض محققین کی رائے ہے کہ پہلا آزاد مفسر ابن فراح تھا جس کا انتقال ۲۰۷ ہجری (۸۲۲ء) میں ہوا۔ اس کی تصدیق ابن ابی ملیکہ نے کی جو کہتے ہیں کہ میں نے خود تفسیر کی ایک مکمل کتاب لکھی ہے۔ [2]

کچھ اور ذرائع (ابن رضا) کے مطابق تفسیر کا علیحدہ شعبہ اب علیحدہ خطوط پر قائم ہو چکا تھا اور وہ مکمل آزاد خطوط پر مصروف عمل تھا اور یہ ساجد بن جبر کی رہنمائی میں کام کر رہا تھا۔

کچھ محققین کا کہنا ہے کہ ابوالاعلیا (انتقال ۹۰ ہجری ۹۰۸ء) پہلے مفسر تھے جنہوں نے تفسیر تحریر کی۔

اگرچہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ پہلا مفسر کون تھا میں نے احادیث سے علیحدگی میں قرآن مجید کو خود اس کی روشنی میں تشریح کی۔ بہر حال اکثر محققین کی رائے ہے کہ یہ شعبہ پہلی ہجری سے دوسرے دہائی میں شروع ہوا۔

ابن جبر کی تفسیر کے بعد یہ سلسلہ آزاد علیحدہ خطوط پر شروع ہوا اور یہ دور ۸۶ ہجری (۷۰۵ء) اور ۱۵۰ ہجری ۷۶۷ء پر محیط تھا۔

سب سے قدیم تفسیر الباری تصور کی جاتی ہے جس کا انتقال ۳۱۰ ہجری ۹۲۲ء میں ہوا۔

اور بہت سی کتابیں جو اس سے پہلے تحریر کی گئیں اب موجود نہیں ہیں۔ [3]

لیکن مجاہد محمد الصواف کے مطابق یہ رائے درست نہیں ہے انکے خیال میں ذیل کی کتابیں اب بھی موجود ہیں۔

- ☆ مجاہد بن جابر المکی جو کہ ۱۰۴ ہجری (۷۲۲ء) میں فوت ہوئے
- ☆ زید بن علی (وفات ۱۲۲ ہجری۔ ۷۴۰ء)
- ☆ عطا الخراسانی (وفات ۱۳۳ ہجری ۷۵۵ء)

۱۔ التسمیح۔ شمارہ۱۔ صفحہ ۱۴۱

۲۔ امجد امین۔ دعا الاسلام (قاہرہ۔ ۱۹۶۲)

۳۔ احمد امین فجر صفحہ ۲۷۴ مجاہد محمد الصواف

Marfat.com

☆ محمد بن الثائب الکلابی (وفات ۱۴۶ ہجری ۷۶۳ء)

☆ مقتل بن سلیمان الخراسانی (وفات ۱۵۰ ہجری ۷۶۷ء)

ابن اسحاق کا بیان ذکر نہیں ہوا ہے حالانکہ ان کا شمار بھی اعلیٰ پایہ کے مفسرین میں ہوتا ہے لیکن چونکہ ان کی تحقیق زیادہ تفاسیر سے متعلق رہا ہے اور یہاں شمار تفسیر کی بنا پر کیا گیا ہے۔ [1]

آئندہ آنے والے دور میں جلال الدین السیوتی (وفات ۱۵۰۵) کی تفسیر کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوا یہ ایک جامع اور خوبصورتی سے لکھا ہوا مجموعہ گردانا جاتا ہے۔ السیوتی کا مجموعہ زیادہ تر ان کے استاد المحالی کی تحقیق پر مبنی ہے جو اسے اپنی زندگی میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے اسی لیے یہ تفسیر کو اس کے دونوں مفسرین کے نام سے جانا جاتا ہے اور تفسیر الجلالین کے نام سے مشہور ہے۔

سیوطی کا دوسرا مجموعہ جو اعتبار اور معنویت کے اعتبار سے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ الحقان فی الحکیم فی التفسیر کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اسے تفسیر کے میدان میں اعلیٰ تکمیل کے مقام پر رکھا گیا ہے۔ اسکے علاوہ زمکشاری (وفات ۱۰۵۵ ہجری ۱۱۴۴ء) اور البیداوی (وفات ۱۲۲۶) نے قرآن کی تفاسیر ان مواقع کی مطابقت سے کی جبکہ ان کا نزول ہوا اور ان عوامل کا ذکر کیا جو کہ ان آیات کے نزول کا سبب ہیں۔

اس طرح قرآن مجید میں جامعیت اور معنویت کا ایک روشن باب پیدا ہوا انہوں نے قرآن کی زبان کو آسان انداز میں پیش کیا جس سے عام لوگوں کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوئی۔

فخر الدین الرازی ایک اور عظیم مفسر تھے (۱۱۴۹ ہجری ۱۲۰۹ء وفات) جنہوں نے قرآن حکیم کو ایک خوبصورت مدبرانہ انداز میں پیش کیا وہ اپنے غیر معمولی مجموعہ "التفسیر الکبیر" کی وجہ سے دنیائے اسلام میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اسے مفاتح الغیب کا بھی نام دیا گیا ہے۔

یہ تفسیر کمینٹری اور بیان کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہے اور یہ فلسفہ اور وحدانیت کے بنیادی پہلوؤں کا حسین امتزاج ہے۔

۱۔ قرآنی تفاسیر کا مجموعہ

Marfat.com

مزید برآں المحاسبی (وفات ۸۵۷ ہجری) اور الغزالی (وفات ۱۱۱۱ ہجری) کی تفاسیر قابل ذکر زمرے میں شمار ہوتی ہیں جنہیں صوفیانہ اور فلسفیانہ رنگ دیا گیا ہے۔

الغزالی کا مجموعہ ''احیاء مذہبی علوم'' میں ایسی تفاسیر شامل کی گئی ہیں جو ہمیں یہ دونوں پہلو انتہائی دلچسپ اور موثر انداز میں سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

موجودہ دور میں مصر کے محمد عبدہ کا مجموعہ تفسیر بھی قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے اسے جدید تقاضوں کی روشنی میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ اسے قرآن کو نہایت جامع صورت میں پیش کیا گیا ہے اور قوانین فطرت اور معاشرتی امور کی نہایت خوبصورت طریق سے وضاحت کی گئی ہے۔ یہ انوکھا انداز قرآنی اصولوں کو موجودہ دور میں اپنانے میں مدد دیتا ہے۔

قرآن کی تفاسیر کا شمار خصوصاً جدید دور میں لامتناہی ہے جو کہ بین الاقوامی سطح پر زیادہ جانا پہچانا نہیں جاتا۔ اس میں زبان اور تراجم کی مشکلات اور ان کا عالمی سطح پر پھیلاؤ حائل ہے۔ مثال کے طور پر برصغیر پاک و ہند میں مولانا آزاد، مولانا مودودی اور عبیداللہ سندھی کی تفاسیر قابل ذکر ہیں جو کہ جدید دور سے متعلق ہے اور نہایت مدلل انداز میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی زبان اردو ہے اور ان کے بیرونی زبانوں میں تراجم کی کمی ہے اس لیے وہ مقبولیت کا وہ حصہ حاصل نہیں کر سکیں جو کہ ان کا مقدر بن سکتا تھا۔ تاہم یہاں ہم ان تفاسیر کے کچھ ایسے پہلوؤں کا ذکر کرنے کی جسارت کریں گے جو کہ معاشرتی اور سائنٹیفک زندگی کے بنیادی حقائق سے منسلک ہیں۔

چونکہ یہ تفاسیر حالیہ دور میں برصغیر میں وجود میں آئیں اس لیے یہ اس ڈھانچے میں ڈھلتی گئیں جو کہ ان کے لیے وقت اور تقاضوں کی مناسبت سے موزوں تھا۔ عربی زبان چونکہ یہاں عام آدمی کی زبان نہیں ہے اس لیے وہ قرآن مجید کے علمی و ادبی پہلوؤں کو باآسانی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس طرح سائنس، کائنات اور تہذیب کے وہ پہلو بھی اچھی طرح عیاں نہیں ہوتے جن کا ذکر قرآن بعض اوقات اشاروں اور کنائیوں سے کرتا ہے۔

قرآن کے وضع کئے ہوئے معاشرتی عقلی اور سائنٹفک ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ

ان تمام عوامل کا محاصرہ کیا جائے جو انسانی تہذیب وتمدن سے متعلق ہیں۔ اور آفاقی امور کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

حیوانی ضرورتوں کے دباؤ کے تحت انسان رحم دل سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اکثر و بیشتر ایسے حربے اختیار کرتا ہے جو اسلام کے دیئے ہوئے نظام عدل کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس لیے قرآن کو اس انداز سے پیش کرنے کی ضرورت رہی ہے کہ عقل وخبرد کے پہلو بدلتے ہوئے حالات میں زیادہ نمایاں ہوں۔ یہاں ایسی تفاسیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جاتی ہے جو گرتے ہوئے معاشرے میں ان اقدار کا احیاء کرنے میں معاون ثابت ہوں جن کا قرآن اور نظام عدل داعی ہے۔

انسانوں کی بھلائی اور خدا کے سامنے جوابدہی ایک ایسا جذبہ ہے جو ابھر کے سامنے آنا چاہیے۔ کوئی سوسائٹی کامیاب سوسائٹی نہیں کہلاسکتی جو اس اصول کو ماننے سے انکار کر دے۔ چونکہ قرآن مشابہات اور متعلقات آیات کا مجموعہ ہے اس لیے ان تمام پہلوؤں کو سمجھنا اور انہیں صحیح روشنی میں پھیلانا نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً ایسی آیات جو تخلیق کائنات کے بارے میں ہیں۔

اس لیے یہاں ایسی جدید تفاسیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جو موجودہ دور کے تقاضوں کی موثر انداز میں قرآن کی روشنی میں وضاحت کرسکیں۔ نیز یہ تاثر بھی قائم کرسکیں کہ اسلامی معاشرہ ایک دقیانوسی معاشرہ نہیں بلکہ قرآنی اصولوں کے مطابق ایک ایسا شعور پیدا کرتا ہے جو تحقیقات اور اصلاحات کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم خالق حقیقی کے تخلیقی ذرائع سے اسرار کائنات سے پردہ اٹھاتا ہے اس لیے انہیں ان ہی کی بھیجی ہوئی کتاب کے ذریعہ سمجھنا اور سمجھانا ضروری ہے۔ تب ہی ترقی اور دریافت کی راہیں ہموار ہونگی۔

یہاں جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک ایسا گلدستہ دے دیا ہے جو کہ نہ صرف تمہاری نشو ونما خوبصورت انداز میں کرتا ہے بلکہ ہمارے لیے مسلسل ارتقائی مراحل طے کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور وہ قرآن مجید ہے۔

Marfat.com

یہ گلدستہ اسی وقت اپنی خوشبوؤں میں اضافہ کرتا ہے اور اپنی ندرتوں سے انسانی زندگی کو منور کرتا ہے جب کہ اسے بدلتے ہوئے حالات میں ایک تجزیاتی انداز میں پیش کیا جائے۔ قرآن کی تفاسیر نے یہ کام ماضی میں نہایت کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور اب بھی مواقع موجود ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور ہر معاشرے کو مستفیض کرتا جائے۔

قرآن ان تمام گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتا ہے جو اچھائیوں اور برائیوں میں گھری ہوتی ہیں۔ یہ الفرقان ہے جو برائی کو اچھائی سے پہچانتا ہے اور یہ پہچان ہمیں معاشرے میں عدل انصاف اور توازن قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ الفرقان کا تصور اسی وقت واضح ہوسکتا ہے جبکہ ضروری تفاسیر اس کی وضاحت کریں اور مناسب شعور پیدا کریں کسی معاشرے کی کامیابی کے لیے یہ شعور بہت ضروری ہے۔

بہر حال یہ کام کسی حد تک دشوار بھی ہے جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ حیوانی خواہشات اور انفرادی مفادات مختلف حالات میں مختلف تقاضوں کے متقاضی ہوتے ہیں اس لیے اسی کشمکش اور تضادات کی صورت کو رفع کرنا قرآن کی روشنی میں قرآنی تفاسیر کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

یہ کام ماضی میں بھی اعلیٰ دماغ اور بصیرت کے حامل مفسرین نے کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور اب بھی کیا جا رہا ہے۔ بہر حال اس کے تقاضے موجودہ حالات میں نئی روح اور نئی تخلیقی کاوشوں کے متقاضی ہیں۔ ذہنی وقلبی گہرائیوں میں ڈوبنے کی ضرورت ہے اور گہرے سمندر سے پوشیدہ موتی تلاش کرنے ہیں۔ علامہ اقبال ان تمام کاوشوں کو جستجو کے مختلف مدارج سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام وہ جن کی شان میں آیا ہے علم الاسما مقام ذکر کمالات رومی وعطار مقام فکر مقالات بوعلی سینا! مقام فکر ہے پیائش زمان ومکان مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

ا۔ علامہ محمد اقبال ضرب کلیم ''ذکر وفکر''

Marfat.com

Marfat.com

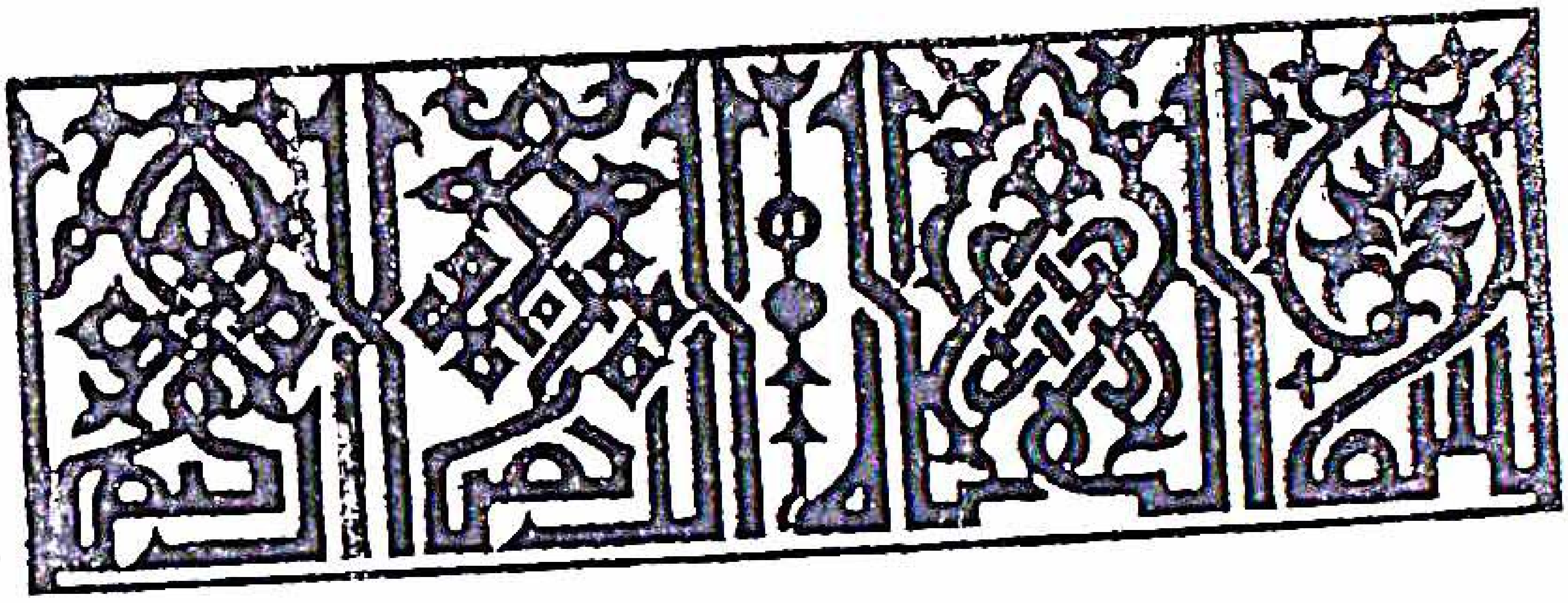

Marfat.com

نزول کتاب سے حامل قرآن تک ﴿باب ۵﴾

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

قرآن مجید کا نزول انسانیت کے لیے بڑھتی ہوئی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں بنیادی طور پر انسانی فلاح و بہبود کے لیے ضروری اصول وضع کیے گئے ہیں۔ اور ایسا خاکہ دیا گیا ہے جسے اپنا کر انسان وہ شعور حاصل کر سکتا ہے جس کی اسے ہر دور میں ضرورت ہوتی ہے یہ شعور فلسفہ کے خشک اصولوں یا جامد مذہبی گتھیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ روشن عقلی اور اعلیٰ روحانی دریچے کھولنے کی کلید ہے۔ جس کے ذریعہ انسانی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے اس میں نہ صرف قدرتی رموز سے پردہ اٹھایا جاتا ہے بلکہ چاند اور ستاروں پر پہنچنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے۔ زمینی حقائق کو آشکارہ کیا جاتا ہے اور انسان کو اللہ کے نائب کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ یہی وہ انقلابی لائحہ عمل ہے جو انسان کی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے اور اسے اپنی تقدیر کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے لیے تیار کرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انسان حامل قرآن ہو۔

انسانی تاریخ میں الہامی کلامات کے آخری خزینہ ہونے کی حیثیت سے اس کا اعلیٰ مرتبہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی طرف بھرپور توجہ دی جائے اور اس کو انسانی زندگی میں عملی جامہ پہنایا جائے۔ تب ہی انسانی ارتقاء اور بقا کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اگرچہ قرآن کریم کے نزول سے لے کر اب تک انسانیت ہزاروں مرحلے طے کر چکی ہے اور ہزاروں نشیب و فراز سے نبرد آزما ہو چکی ہے لیکن ارتقاء کا سلسلہ مسلسل جاری ہے اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں

Marfat.com

لگتی جارہی ہیں۔ اس لیے آج ۲۱ ویں صدی میں ہمیں اس کی رہنمائی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ آج سے ۱۴۰۰ برس قبل زمانہ جہالت میں تھی لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج اس کے عظیم نقیب محمدؐ جیسے رہنما ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور ہم ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور مضمرات سے بھی بے بہرہ ہو چکے ہیں۔

قرآن مجید کی بے پناہ خوبیوں سے متاثر ہو کر ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ ''یہ اس کی زبان کی تاثیر ہے کہ اس کی شیرینی ایک خوبصورت انداز سے اسکی پختہ حقیقت کو انسان پر آشکارہ کرتی ہے حقیقت میں تمام عربی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے جو اس پیرائے سے لکھی گئی ہو اور دنیا میں اتنی زیادہ مقبول ہوتی ہو یہ حقیقت نثر اور شعرو شاعری کی تمام کتابوں کا محاصرہ کرنے کے بعد کہی گئی ہے۔''

یہاں یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ قرآن دن رات دنیا کے ہر گوشے میں پڑھا جاتا ہے لیکن کوئی اس کی تھکاوٹ سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری ہے اور انسانیت اس سے برابر مستفیض ہو رہی ہے۔ [1]

یہ ایک زندہ و پائندہ کتاب ہے جس کے اثرات کا دائرہ قائم ہے۔ اور اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ جب سے سائنس نے کائنات میں جھانکنا شروع کیا ہے اور قدرتی رموز کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرنا شروع کیا ہے اس کی حقانیت کو مزید مستحکم بنیادوں پر پرکھا جانا شروع ہو گیا ہے اس کا شعور زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔

امام غزالی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اس کتاب کے ذریعہ سوچ و فکر کے دھارے ان لوگوں کے لیے کھول دیئے گئے ہیں جو عقل و نگاہ رکھتے ہیں اور حقائق کو علمی و ادبی پیمانے سے ناپتے ہیں۔ یہ ایک روشنی ہے جس کے ذریعہ ایسے ذہنوں کو سنوارا جاتا ہے جو کسی مرض میں مبتلا ہوں۔ اس کے معجزاتی اثرات ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے ہمیشہ تروتازہ ہے اور ہمیشہ ان کی جھولیاں بھرنے کے لیے تیار ہے۔ [2]

۱۔ الفرڈ گیامے ''اسلام'' لندن

۲۔ امام غزالی ''احیاء یوم الدین'' (دائرہ اشاعت۔ اردو بازار کراچی)

Marfat.com

قرآن مجید کو معنی اور مطالب کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا آہستہ آہستہ باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور اگر کوئی اچھا معلم موجود ہو تو اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ اس طرح قرآن ذہن وقلب پر زیادہ موثر انداز میں رونما ہوگا۔

چونکہ اس کے معنی اور مطالب انتہائی سچائی پر مبنی ہیں اس لیے اسے گہری نگاہ سے پڑھنا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

چونکہ قرآن میں ایسے سینکڑوں واقعات اور قدرتی رموز کا ذکر ہے جو کہ کائنات اور انسانیت سے متعلق ہیں انہیں ایک اچھی اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے قرآن کا سمجھنا بہت ضروری ہے جو لوگ اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں اور قرآن کو صرف ثواب کی خاطر پڑھتے ہیں وہ اس کے علمی اور عملی فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ اور قرآن کی ہدایات سے انحراف کرتے ہیں۔

اس ضمن میں آنحضورؐ اور ان کے مفسرین نے جو قرآن کی تشریح اور وضاحت کی وہ بھی لازمی زیر غور آنی چاہیے تاکہ قرآن کی وضاحت صحیح معنوں میں ممکن ہو سکے۔

قرآن کریم کا مقصد انسانی روش کو بدلنا اور زندگی کو صحیح معنوں میں ڈھالنا ہے اور یہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ ہم اسے گہری نگاہ سے پڑھیں اور سمجھیں۔ اس لیے وہ تجزیاتی تحقیقات اور تشریحات بھی زیر غور ہونے چاہیں جو پیغمبر اسلام اور ان کے تبع تابعین کے دور میں کی گئیں۔ انکا ذکر ہم نے گزشتہ باب میں تفصیلاً کیا ہے۔

اس سلسلے میں احادیث کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا جو کہ اعلیٰ مرتبہ مفسرین نے انتہائی جدوجہد سے جمع کیں اور انہیں عوام تک پہنچایا۔ احادیث ایسے دقیق مسائل کی بھی وضاحت کرتی ہیں جو قرآن میں تفصیل سے نہیں بیان کیے گئے۔

نیز ان احادیث اور تفاسیر کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان سے صحیح معنوں میں آنحضورؐ کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے یہاں خاص طور پر یہ کہنا مقصود ہے کہ رجعت پسندوں کا یہ تاثر کہ آنحضورؐ علم اور سائنس میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے تھے جتنی کہ قرآنی آیات میں ہے غلط ہے۔ سید امیر علی اپنی کتاب

روح اسلام سے[1] میں کہتے ہیں۔

کہ رسول عربیؐ کو علم اور سائنس سے جو محبت تھی اور آپ کو دوسرے معلمین دین سے جو امتیاز بخشتی اور جدید دنیائے فکر سے آپؐ کو ایک نہایت قریبی رشتہ موانست میں منسلک کرتی ہے ہم اس کا تذکرہ اوپر کر آئے ہیں (یعنی اس کتاب کے گزشتہ ابواب میں)

مکہ پر کفار کا قبضہ ہو جانے کے بعد مدینہ منورہ میں دور دراز ملکوں سے بھی طالبان حق جوق در جوق آنے لگے۔ مدینے کی شہرت ایرانیوں۔ یونانیوں کو اور مختلف ملکوں اور نسلوں کے لوگوں کو غالباً محض یہ دریافت کرنے کے لیے کہ مدینے میں کیا ہو رہا ہے۔ اپنی طرف کھینچتی رہی لیکن بیشتر لوگ تحصیل علم اور پیغمبر اسلام کی باتیں سننے کے لیے عازم مدینہ ہوئے۔

پیغمبر اسلام کا ایک محبوب موضوع علم کی قدر و منزلت تھا۔

"علم حاصل کرو کیونکہ جو شخص راہ حق میں علم حاصل کرتا ہے وہ ایک کار تقویٰ انجام دیتا ہے۔ جو شخص اس کا ذکر کرتا ہے وہ خدا کی حمد و ثناء کرتا ہے۔ جو شخص اس کی جستجو کرتا ہے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے جو شخص علم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے وہ خیرات تقسیم کرتا ہے۔ جو شخص ایسے لوگوں کو جو علم کے اہل نہیں علم بخشتا ہے وہ ایک عمل صالح کرتا ہے۔

علم جس کے پاس ہو اس کو اس امر کی استعداد عطا کرتا ہے کہ وہ ممنوعہ اور غیر ممنوعہ چیزوں میں امتیاز کر سکے۔ وہ ہمارے لیے آسمان کی شمع راہ ہے۔

وہ اس دنیا میں بادشاہوں کا ہم پلہ بنتا ہے اور سعادت ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔[2]

اس کے علاوہ ایک اور مشہور حدیث ہے جس میں آنحضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے"۔

۱۔ روح اسلام نواں باب صفحہ ۵۳۱

۲۔ حدیث ماخود ہے۔ اللہ دین محمد تقی

Marfat.com

اور آپؐ اکثر اپنے صحابہ کو فرماتے تھے کہ علم اگر چین میں بھی ہو تو وہاں جا کر حاصل کرو۔

جو شخص علم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ خدا اسے جنت کا راستہ دکھاتا ہے۔ [1]

آنحضورؐ نے فرمایا کہ صانع حقیقی کے کارناموں پر ایک گھنٹے کا غور و فکر ۷۰ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ [2]

قرآن عظیم کے نزول کی غرض و غائت بھی درحقیقت علم و دانش کا پھیلاؤ ہے۔ زمخشری سورۃ الفلق کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''خدا نے قرآن کے ذریعے لوگوں کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتے نہ تھے۔ اور یہ اس کی رحمت کی ایک بڑی نشانی ہے۔''

یہ انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انسان کو جہالت سے نکال کر علم کی روشنی عطا کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج انسان اور جانور میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا۔ یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جس نے انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔ اسے نیکی اور بدی کا شعور دیا اور فلاح و بہبود کی صلاحیتوں سے نوازا۔

شاعری اور خطابت:

نزول قرآن کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں علم و دانش کے کوئی آثار نہ تھے۔ البتہ چند شاعر اور مجنون قسم کے لوگ شاعری، خطابت اور نجوم کے شوقین تھے۔ وہ اپنی زبان میں ایسی حکایات بیان کرتے تھے جو پاکیزہ زندگی سے دور تھیں اور لہو و لعب کے قصوں پر مشتمل ہوتی تھیں وہ انہیں دل و دماغ کے چٹکھارے عطا کرتی تھیں۔

بہرکیف قرآن کا نزول ان تمام حوالوں سے ایک ضرب کلیم تھا جس نے نہ صرف سوچ کے انداز بدلے بلکہ ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے وحدانیت کا تصور بھی دیا۔

دیوتاؤں کی شرکت سے جو کاروبار چل رہا تھا اسے تلاش حق کی صورت میں منتقل کیا گیا۔ اس سے نہ صرف فطرت کے پوشیدہ راز نمایاں ہوئے بلکہ فیضان ربوبیت کا ایسا چشمہ پھوٹا جس نے انسانیت کو بے

۱۔ روح اسلام صفحہ ۵۳۲

۲۔ جامع الاخبار

شمار رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا اور ہر دور میں علمی۔ اخلاقی اور روحانی سطح پر انسان کی رہنمائی کی۔ علم و دانش اور فیضان ربوبیت ایسے سرچشمے ہیں جن سے انسانی عقل و خرد میں مزید اضافہ ہوا اور آگے چل کر علم کی وسعتوں کو فروغ ملی۔ تحقیق و دریافت کا سلسلہ شروع ہوا اور بلوغت اور بصیرت کو مزید وسعت حاصل ہوئی۔

''یہی وہ محور ہیں جن کے گرد ہزاروں برس ارتقاء کا عملیہ گھومتا رہا اور یہی وہ روشنی کے مینار ہیں جو زندگی کے بحرِ بے کراں ہیں جن کی تابش و ضو سے تہذیب و تمدن کے سفینے رواں دواں رہے۔''

اللہ کی برکات سے ایک ایسا گروہ وجود میں آیا جس نے انسانیت کو تزکیہ و تخلیہ کی راہ دکھائی ابراہیم، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرتؐ کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ [1]

ان الہامی کلامات اور ان کے پاکیزہ سفینوں نے ایسا سلسلہ شروع کیا جس نے تاریخ عالم میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔ یہ انقلاب ہمیں انسانی زندگی کے خدوخال میں ہر دور میں دیکھنے کو ملا۔ البتہ اس کی نفاست اور اثرات حالات کے مطابق بدلتے نظر آئے۔

حالات کو بدلنے اور صورتحال کو نیا رخ دینے کے لیے دو بڑے ذرائع منتخب کئے گئے۔ تکوینی اور تشریحی۔ ان ذرائع کو اپنانے سے جہاں انسان اپنی فکری اور عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا وہاں اللہ تعالیٰ نے عظیم مفکرین کو پیغمبروں اور مفسرین کی صورت میں مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے رشد و ہدایت کی راہیں ہموار کیں۔

اس سے نہ صرف تسخیر کائنات کے راز معلوم ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے رشتہ بھی مزید مستحکم بنیادوں پر استوار ہوا اور انسانیت کو عدل و انصاف کے محور کے گرد نکھارا گیا۔

مولانا ندوی فرماتے ہیں، وحی و تنزیل، دریافت و یافت کی فکری و عملی کوششوں میں کہیں تضاد یا تناقص نہیں پایا جاتا۔ دونوں میں ہم آہنگی اور اتحاد ہے۔ دونوں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے برابر گوشاں رہتے ہیں اور دونوں کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ کسی نہ کس طرح انسان کی تکمیل کی جائے اور اس کو فطرت کا راز داں بنایا جائے۔ [2]

۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ ''مطالعہ قرآن''

۲۔ مولانا ندوی۔ مطالعہ قرآن صفحہ ۱۰

Marfat.com

حامل قرآن کا مرتبہ حاصل ہونے سے انسانی اعمال کو نکھارنے میں خاصی مدد ملتی ہے اور انسان جو کئی ادوار میں حیوانیت کے چنگل میں پھنسا ہوا نظر آتا ہے کامیابی سے راہ راست اختیار کر پاتا ہے۔

اس طرح ان اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا ممکن ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وضع کئے ہوئے ہیں اور عقل وخرد کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔

ان عوامل سے انسانی زندگی میں ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے جو ہمیں تکمیل کے مراحل طے کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے

''الفاظ دیگر ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ''عقل وخرد'' کے تقاضے اور مذہب ودین کے واجبات دو متناقض پہلو ہونے کی بجائے اس کے تکمیلی اجزا ہیں۔ جو انسانی فطرت کو جلا بخشتے ہیں اور اس کے مضمرات ارتقاء کو ابھارتے ہیں۔ چاہے انکا تعلق اس کے سیرت وکردار کے معجزات سے ہو اور چاہے ذہن وعقل کے خوارق سے۔

غرض ومقصد کے اتحاد سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کے جوہر ومزاج میں ہی یگانگت پائی جاتی ہے۔

وحی وتنزیل کے داعیے اپنی آغوش میں عقل وخرد کے وہ تمام آفتاب چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی میں تہذیب وتمدن کے قافلوں کو آگے قدم بڑھانا ہے۔

اور اسی طرح عقل وخرد کے عملیہ میں وحی اور الہام کے تقاضوں کا بھی دخل ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں ہے جب کہ تشریح اور تکوین کے دائروں کو آپس میں بہر حال ملنا اور متحد ہونا ہے اور جب آسمانی اور ذہنی کوششوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھلنا اور ظہور پذیر ہونا ہے''۔

تکوینی اور تشریح امتزاج کے بعد اب یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ یہ شعور کس طرح انسانی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے اور ربی اور دینی فلاح وبہبود کے خزینے پیدا کرتا ہے۔

ان عوامل کو جب ہم قوموں کے دستور میں ڈھلتا دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ قدرت کا

مولانا حنیف ندوی ''مطالعہ قرآن''

نظام ٹھوس اصولوں پر قائم ہے اور اس کی حقانیت ہر دور میں عیاں ہوتی ہے۔ وہ قومیں جو تنزل پذیر ہیں ان میں ان کے اثرات قدرے کم نظر آتے ہیں۔

آنحضورؐ نے ان تمام عوامل کو خوب جانچا پرکھا اور اپنے ہم وطنوں اور دنیا کے رہنے والوں کو ان سے آگاہ کیا۔ احادیث اور تفاسیر کے ذریعے یہ عمل تا حال جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

اگرچہ بہت سے حقیقت سے منکر ہم وطنوں نے ان پر جنون اور گمراہی کی تہمت بھی لگائی لیکن انہوں نے سچائی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے تھے انہیں بطریق احسن انجام دیا۔

اس ثابت قدمی نے نہ صرف اسلام کے اصولوں کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا بلکہ تہذیب وتمدن مذہبی روایات اور اخلاقی اقدار کے اعلیٰ پیمانے بھی قائم کیے۔

یہ ایک نہایت سنجیدہ کاوش تھی جس میں نہ کوئی شک اور نہ کسی قسم کا تضاد تھا یہ حقائق کی راہیں ہموار کرنے کے لیے پیامبری کا ایک روشن باب تھا۔

ہم نے ان مضمرات کو یہاں تفصیل سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کا قرآن اور اس کا شعور بیدار کرنے میں ایک خاص رول ہے جسے سمجھنا اور سراہنا نہایت ضروری ہے۔

نزول قرآن سے پہلے یہ تمام خطہ جہالت اور اندھیروں میں گھرا ہوا تھا لیکن جلد ہی آنحضورؐ کی کاوشوں کی بدولت اور اللہ کے الہامی کلام کی رہنمائی میں یہاں ایسی تبدیلی رونما ہوئی جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنی۔ اور اسطرح نزول قرآن سے مسلمانوں کی اکثریت حامل قرآن بن گئی۔

آپؐ کی مدت حیات میں ہی کئی تعلیمی اداروں کی داغ بیل پڑ گئی جو آئندہ چل کر مشہور یونیورسٹیوں (قاہرہ بغداد، دمشق اور قرطبہ) میں تبدیل ہوتی نظر آئیں۔

یہ آنحضورؐ ہی کے فرمان تھے جنہوں نے علم و دانش کے متلاشیوں کا درجہ بلند کیا اور مسلمانوں کو خانقاہوں سے نکال کر اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں کے حوالے کیا۔ اس اعجاز کو جاننا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم اس مشن کو آگے جاری نہیں رکھ سکتے جس کا بیڑہ آنحضورؐ نے اٹھایا تھا۔ آنحضورؐ نے فرما دیا کہ مفکر کا ایک گھنٹے کا غور وفکر عابد کے ۷۰ سالہ عبادت سے زیادہ مقدس ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے

Marfat.com

مسلمان بھائی اس سے غافل رہے اور علم و دانش کی بجائے دوسرے امور کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید کو نہ صرف علم و دانش کے اعلیٰ مقام پر فائض ہونا تھا بلکہ انسانیت کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل بھی تعین کرنا تھا جس سے انسان اس دنیا اور آخرت میں کامیابی سے زندگی گزار سکے۔ اور یہی صفت ربوبیت ہے جو ہمیں مظہر نبوت میں نظر آتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی عقل وخرد بھی انسان کو عطا کی گئی تا کہ قرآن کی ہدایات اور اپنے تجربہ اور تجزیہ سے بخوبی مستفید ہو سکے۔

زندگی کا مقصد کھانا پینا، جینا مرنا نہیں تھا، بلکہ ایک خوبصورت زندگی کے لیے اعلیٰ اقدار اور فلاح و بہبود کے بنیادی اصولوں کو اپنانا تھا اور یہی جذبہ انسان کو ترتیب حیات اور تکمیل زندگی کی طرف لایا۔

اس لیے قرآن کو ام الکتاب کا لقب دیا گیا اور صفات الفاظ میں بتا دیا گیا کہ یہ تمہاری سمجھ اور فلاح و بہبود کے لیے نازل کی گئی ہے۔[1]

چونکہ قرآن براہ راست عربی ماحول اور عرب باشندوں کے لیے نازل کیا گیا تھا اس لیے ایسی زبان (عربی) اختیار کی گئی جو یہ باشندے بخوبی سمجھ سکیں لیکن ساتھ ہی راز و رموز کی پیچیدگیوں کے پیش نظر ضروری احادیث اور تفاسیر کا بندوبست بھی کیا گیا جو کہ اندرونی اور بیرونی سطح پر سمجھ و بوجھ کا دھارا ہموار کرنے کے لیے تھیں جیسا کہ ہم گزشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں۔

اگرچہ قرآن کو بیان کرتے وقت بہت مشکل انداز یا تکنیکی الفاظ استعمال نہیں کئے گئے تاہم ایسا اسلوب ناگزیر تھا جو حالات اور واقعات کے مطابق ہو۔ اور جس کو واضح کرتے وقت غیر معمولی نوعیت کے الفاظ استعمال میں آ جائیں۔ اس لیے غور و فکر کا دہانہ عقل و خرد اور تحقیق و جستجو کا جذبہ ابھارنے کی طرف مبذول کیا گیا اس عمل سے ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔

اس کے باعث انسان اس لائق ٹھہرا کہ وہ اس منصب اعلیٰ (خلیفہ فی الارض) کا شعور حاصل کر سکے جس کے لیے اس کی تخلیق وجود میں آئی اور جس کے لیے اسے زمین پر بھیجا گیا۔

۱۔ قرآن مجید کی سورۃ ۲۴: ۴۳ دیکھیے

Marfat.com

اس طرح نہ صرف ایک نیا شعور پیدا ہوا بلکہ وہ تمام فرسودہ تصورات جو بالیدگی کی راہ میں حائل تھے آہستہ آہستہ دور ہونا شروع ہوئے۔

اس لیے ایک ایسے شعور نے جنم لیا جس نے انسانی زندگی میں انقلاب بپا کردیا۔ اس انقلاب کی حدود وجہ سے ایک منصفانہ نظام عدل قائم ہوا اور ایک ایسا ماشرتی ڈھانچہ تیار ہوا جو کہ سیاسی، سماجی اور جغرافیائی سے بالاتر تھا اور ایک نئی تہذیب وتمدن کا نقیب بنا۔

اس لیے نہ صرف عربوں کی دنیامیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ایک نئے ورلڈ آرڈر کا وجود عمل میں آیا جو عالمگیر تھا اور تمام انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد کالے گورے یا کسی خاص علاقے کا تحفظ نہیں تھا۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے برابری اور اعلیٰ اقدار کا پیغام تھا۔

ہم یہاں اکثر طور پر یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کا پیغام کسی خاص علاقے یا قوم کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ یہ ایک عام انسانی لائحہ عمل تھا جسے ہر خطے میں بسنے والے بخوبی اپنا سکتے تھے۔

یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن اور اسلام سلامتی کا درس دیتے ہیں اور یہ درس سیکھنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے قرآن کو سمجھنا بہت ضروری ہے لیکن قرآن کے مطالعہ سے کیونکہ اکثر لوگ غافل رہتے ہیں اس لیے اس کے مضمرات عام زندگی میں گہرے اثرات نہیں چھوڑتے۔ نیز مختلف قسم کے خیالات (سیاسی، مذہبی اور عالمی امن سے متعلق) اور تضادات زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قدرے گھناؤنے رنگ میں پیش کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں امن اور سلامتی پر زد پڑتی ہے۔ تفرقہ بازی، مذہبی اور سیاسی حد بندیاں اور برداشت کی کمی اندرونی اور بیرونی سلامتی کو خاص دھچکہ پہنچاتی ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اس خطرہ کو گہری نگاہ سے دیکھیں اور ذاتی مفادات کو سلامتی اور امن کے لیے خطرہ نہ بنائیں۔ یہ موجودہ دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ دینا اور خاص طور پر قرآن کی روشنی میں جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔

مولانا مودودی قرآنی فہم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن ایک عظیم کتاب ہے اور اسے سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ انسان کا ذہن ستھرا اور شفاف ہو۔ اور تمام آلودگیوں سے مبرا۔ تب ہی

Marfat.com

قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے اور اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ ''قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ قرآن کا نزول کیوں ہوا اس کی غرض و غایت کیا تھی اور اس کا مرکزی موضوع کیا ہے۔ پڑھنے والے کی نظر اس کے اسلوب بیان، انداز فکر اور ان بنیادی علمی حقائق کی طرف بھی ہونی چاہیے جو اس کے مرکزی خصوصیات ہیں۔

ان حقائق اور واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو کسی خاص آیت کے نزول کا باعث بنے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کا نزول بتدریج ہوا اور یہ اکثر ان حالات اور واقعات کی غمازی کرتا ہے جو پس منظر میں نمایاں ہوتے تھے۔ [1]

آیات کا احاطہ آنحضورؐ خود اپنی ذات میں کر لیتے تھے اور بعد میں اپنی یادداشت سے انکا اعادہ اپنے صحابہ اور دیگر حضرات سے کرتے تھے جو بعد میں انہیں کسی ایسی شے پر منتقل کر لیتے تھے جو کچھ عرصہ قائم رہنے کے قابل ہوتی تھی۔

اس لیے قرآن کے فہم میں یہ چیز مانع نہیں آتی کہ یہ ایک متواتر تنزیل کا لبادہ اوڑھے ہوئے نہیں ہے قرآن کا مجموعی شعور اس کی جامعیت اور موزونیت پر حاوی ہے۔

بہرحال قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے جہاں ان حقائق کا جاننا ضروری ہے وہاں ایک صاف ستھری ذہنی سطح اور بغیر کسی تعصب اور ذاتی عناد کے جذبہ شوق کا ہونا بھی ضروری ہے۔

ایک مغربی مفکر کیتھ کراگ نے قرآنی خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''قرآن علمی تماثیل، زمینی حقائق اور مذہبی سچائیوں کا حسین امتزاج ہے۔ اس نے خوبصورتی سے ان حقائق کی عکاسی کی ہے جو انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

تمام اوراق علم و ادب کے پارنیوں سے مزین ہیں اور تمام علم و ادب الہامی کلام سے متاثر ہوتا نظر آتا ہے۔

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ ''تفہیم القرآن'' جلد نمبر 1

Marfat.com

یہی خوبی ہے جو اسے دیگر کتابوں میں منفرد حیثیت دیتی ہے۔‘‘[1]

اس لیے یہ ایک خاص اعجاز ہے کہ قرآن کریم کی خوبصورت عبارتیں اور الہامی بیانات ہمارے لیے رشد و ہدایت کا سبب بنیں ان کی وجہ سے ہمیں نہ صرف الہامی کلام سے متعارف ہونے کا موقع ملا بلکہ ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا بھی نصیب ہوا۔

اگر چہ توحید اس الہامی کتاب کی جان ہے لیکن سماجی معاشرتی، عقلی اور علمی پہلو بھی ہماری برکات کا باعث بنتے ہیں۔

جوں جوں ہم زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے ہیں قرآن مجید کی ہدایت اور حکمت ہمارے کام آتی ہے۔

کینتھ کراگ کہتا ہے کہ قرآن کے تین بنیادی مطالبے ہیں جنہیں ہمیں سمجھنا ہے اور سلجھانا ہے۔

وہ ہیں: واحدانیت، اجتماعیت اور نبوت،

اگر ہم قرآن کے ذریعہ ان تقاضوں کو سمجھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ جس پر انسانیت ہمیشہ اپنا سر فخر سے بلند کر سکے گی۔ اور یہی قرآن کا معجزہ اور اعجاز ہوگا۔

اسی کے ذریعہ ہمیں روح کی بالیدگی، عقل و خرد کی پاکیزگی اور دل و دماغ کی خوبصورتی حاصل ہوگی۔

لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ہم قرآن مجید کا نزول اپنی ذات پر ہوتا ہوا محسوس کریں اسکے راز اور اسکی حقیقت اسی وقت منکشف ہوں گے جب ہم اپنا رشتہ و تعلق اس سے قریبی نوعیت کا جوڑیں گے۔ اسکا نزول فیوض ربوبیت کا ایک مستقل مظہر ہے۔ جو ہماری صلاحیتوں کو چمکاتا اور سنوارتا ہے۔ اور ہمیں حامل قرآن بناتا ہے۔

۱۔ کیتھ کراگ۔ ’’قرآن اور ایک معجزہ‘‘ آکسفورڈ

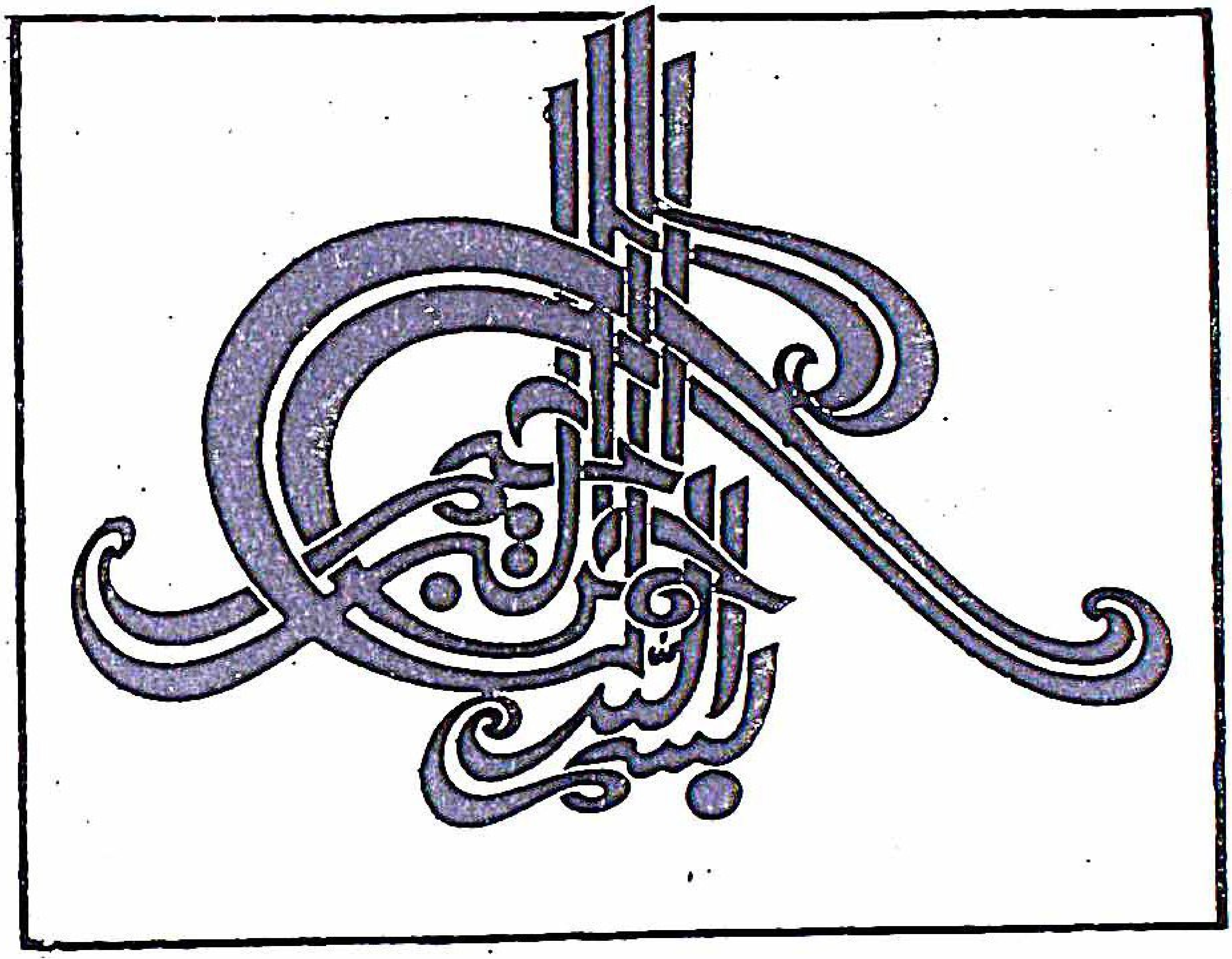

Marfat.com

﴿باب ۶﴾

قرآن : عظمتوں اور رفعتوں کا دیباچہ

سورۃ ۸۵: ۲۱۔۲۲

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ٥ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ٥

یہ قرآن مجید کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے جسے لوح محفوظ میں رکھا گیا ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی خوبیوں میں سے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خصوصاً اختصار اور تکرار کے ساتھ کیا ہے وہ اس کی دائمی کیفیت ہے جو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے اس کا پیغام عظیم اور شاندار ہے اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اپنی منفرد حقیقت کے اعتبار سے انتہائی احترام کے لائق ہو اور ایک محفوظ جگہ پر محفوظ ہو۔

یہ ایک مافوق الطبعی خصوصیت ہے جس کی اور کوئی کتاب حامل نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

کہ "بے شک یہ نصیحت کا صحیفہ ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (دیکھیے سورۃ الحجر۔۹)

پھر ارشاد فرمایا گیا

"یہ قرآن ایک ایسا راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے (سورۃ بنی اسرائیل:۹۱)

قرآن کا ایک ایک لفظ ہزاروں لفظوں پر بھاری ہے اور اگر سمندر اس کے الفاظ کی توضیح وتشریح کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔

(سورۃ الکہف۔۱۰۹)

اور اس طرح قرآن سے ہی ہم اس کے معنی اور مطالب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ آیات قرآن حکیم کی بلاغت، عظمتوں اور رفعتوں کا ایک دیباچہ ہیں جو ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ قرآن کریم ایک معمولی کتاب نہیں جسے ہم اکثر و بیشتر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

اس احساس اور تعارف کے بعد ہمیں اس کی گہرائیوں میں جھانکنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تا کہ ہم اس کے انمول موتیوں کو اپنے مقدر کا ستارہ بنا سکیں۔

تب ہم اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں میں بھی پھیلاؤ کے متکلف ہو سکتے ہیں جن کا تقاضا قرآن کا مطالعہ کرتا ہے۔

اس طرح قرآن مجید کی ان تصریحات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جن کی تصدیق رموز کائنات سے ہوتی ہے۔

ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود بھی ہم اب تک اپنی کوششوں سے یہ نہیں جان سکے کہ یہ جہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں کتنے چاند، ستارے اور کہکشاں موجود ہیں۔

ارتقاء اور تکمیل کے مراحل کا اندازہ لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم قدرت کے شاہکاروں کا قرآن مجید کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

مغربی محققین نے تحقیق و دریافت کے اصول اپناتے ہوئے ہمیں ان حقائق کے کچھ قریب کیا ہے لیکن ابھی بہت سی منزلیں پڑی ہیں جن سے ہم نے گزرنا ہے اور رموز ہائے قدرت کو سمجھنا ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے نام سے موسوم کیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ابتدائی آیت میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے (سورۃ ۸۵: البروج ۲۲۔۲۱) اور اسی طرح ذیل کی آیات میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ (الاحقاف: ۲)

’’یہ کتاب خدائے غالب و حکمت کے مالک کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور پھر سورۃ الجمعہ :۲ میں کہا گیا ہے۔ یہ کتاب خدائے غالب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور امیوں کے اندر ایک رسول اٹھایا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

کتاب کے تین اوصاف ہوتے ہیں یہ لکھی ہوئی شکل میں ہوتی ہے اور اس میں مختلف معانی و مطالب کو جمع کیا جاتا ہے۔

یعنی جو باقاعدہ تحریر اور نوشتہ کی صورت میں ہے اور قرآن کے حوالے سے جس میں وحی اور تنزیل کے تمام مراحل طے کئے گئے ہیں۔

اس میں معنی و مطالب کی وضاحت زبان کی خوبصورتی اور بلاغت کے اعتبار سے بدرجہ احسن کی جاتی ہے تاکہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ایک دیرپا اثر قائم کر سکے۔
تب ہی ایک جامع کتاب بنتی ہے اس طرح قرآن نے ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر ایک ایسا سانچا تیار کر لیا جو وضاحت و بلاغت کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔
اس کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ منبع رشد و ہدایت ہونے کے ساتھ انسانی ذہن کو متاثر کرتی ہے اور ایسے نقوش چھوڑتی ہے جنہیں ہدف کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔
اس کتاب کی مسلمہ حیثیت اس وقت قائم ہوتی ہے جب یہ ہمیں وحی اور نبوت کی حقیقت بتاتی ہے اور ان امور کی نشاندہی کرتی ہے جو انسانی ارتقا اور تکمیل کے لیے لازم قرار دیئے گئے ہیں۔
یہ عقل و خرد کو پاکیزگی بخشتے ہوئے اخلاقی اور روحانی بالیدگی کا بھی سبب بنتی ہے۔
نیز رموز ہائے کائنات سے پردہ نہ اٹھتا اگر یہ ہمیں فطرت کی گہرائیوں کا کھوج لگانے کو نہ کہتی۔
اس طرح یہ ہمیں وہ اعلیٰ معیار حاصل کرنے میں خصوصی مدد دیتی ہے جو بالآخر انسانیت کا معراج تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ایک الہامی کتاب ہی نہیں بلکہ تمام الہامی کتابوں کی روح اور جان ہے جو رشد و ہدایت کے لیے نازل کی گئی۔

اسے ایک فرقان کا درجہ دیا گیا ہے جس کے ذریعہ نیکی و بدی اور غلط اور صحیح راستوں میں فرق واضح کر دیا گیا سورۃ الفرقان (ایک ۱۱) میں کہا گیا کہ ''وہ خدا بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا۔ تاکہ دنیا بھر کے لیے ہدایت قرار پائے۔

قرآن تب ہمیں رات کے اندھیروں میں ایک ایسا منور ستارہ نظر آتا ہے جو تاریکی کو دور کر دیتا

Marfat.com

ہے اور ایسی صبح صادق کا موجب بنتا ہے جو انسان کے لیے باعث برکت اور فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''تحقیق نازل کیا ہم نے قرآن کو بیچ شب قدر کے بہتر ہے ہزار مہینوں سے''

(سورۃ القدر ۳۔۲:۹۷)

پھر اس کتاب کو پڑھنے کے لیے کہا گیا (سورۃ الفلق ۵۔۳:۹۶)

''پڑھ اور پروردگار تیرا بہت کرم کرنے والا ہے جس نے سکھایا ساتھ قلم کے وہ سب کچھ جو تو نہیں جانتا تھا۔''

یہ وہی شعور اور ادراک کا موضوع ہے جو قرآن کا مرکزی محور ہے اور جسے ہم مسلسل اس کتاب میں بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔

چونکہ شعور اور ادراک کے بغیر کچھ ممکن نہیں اور تمام روشنی اور ہدایت کے فوارے یہیں سے پھوٹتے ہیں اس لیے اس موضوع پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔

ان سرچشموں کے ذریعہ انسانی دماغ اور روح کو خوراک ملتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی ہے اور اسی سے ہم پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

الفرقان

یہ قرآن کا اپنا اسلوب بیان ہے جس میں الفرقان کو خاص طور پر ایک موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے سورۃ البقرۃ، آل عمران۔ افضال۔ الانبیاء۔ دیگر کئی اور جگہوں (تقریبات) پر استعمال میں آیا ہے یہ لفظ متقابل یا متشابہہ جگہوں میں صورت حال کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے استعمال میں لایا گیا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ

الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

Marfat.com

Marfat.com

قرآن کی شیرینی اور سحر آفرینی

اَوْزِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا○

''اور جب قرآن کی تلاوت کرو تو بہت دھیمے۔ بچے تلے انداز میں کرو'' (سورۃ ۷۳:۴)

قرآن کا مطالعہ ایک عام کتاب کا مطالعہ نہیں ہے یہ ایک ایسی حکمت و دانش سے بھرپور صحیفہ کا مطالعہ ہے جو انسانیت کے لیے فلاح و بہبود کے ذرائع متعین کرتا ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ غور و فکر اور تحقیق و تجزیہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے اس کی برکات سے بھرپور طور پر مستفیض ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے آہستہ آہستہ دھیمے انداز میں غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے۔

مزید برآں اسے اس انداز میں پڑھنے سے اس میں ایک خوبصورتی کا پہلو عیاں ہوتا ہے جو کہ جلد بازی اور فکر و نظر کی کمی کے باعث پوری طرح آشکارہ نہیں ہوسکتا۔

اگر ان پہلوؤں سے تہی دستی کی جائے تو ارتقاء اور تشکیل و تکمیل کے مراحل بھی اثر انداز ہوسکتے ہیں۔

اس لیے قرآن کا مطالعہ اس امر کا متقاضی ہے کہ قاری اس میں ڈوب جائے اور اپنی ذات کو قرآن کے معنی و مطالب میں محلول کردے اور صحیح معنوں میں حامل قرآن ہوجائے۔

اس کے پیغام کو حاصل کرنے اور ذہن نشین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ عمل بھرپور انداز میں اپنایا جائے۔ ذہن اور روح پر یہ نقوش اسی وقت ابھر کے سامنے آسکتے ہیں جب ہمارے اس عمل میں ترتیب اور ہم آہنگی قائم رہے۔

قرآنی مطالعہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ جہاں اس کے مضامین اور مطالب کا ایک بے بہا ذخیرہ

Marfat.com

رواں دواں ہے اسی طرح اس میں الفاظ وحروف اور حکمات کے بے شمار ذخائر موجود ہیں۔ جن کو بخوبی سمجھنا اور ان سے مستفیض ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان کی ساخت اور ترتیب بھی زیرِ غور ہونی چاہیے تا کہ اس کی برکات سے بھرپور طور پر مستفید ہوا جاسکے۔

''یعنی یہ کتاب ہدیٰ عالم لاہوت اور ناموت کے درمیان رشتہ وتعلق کی ایسی نوعیت ہے جو لفظ و معنی دونوں کو آغوش منزل میں لیے ہوئے ہے۔ کلام ومعنی دونوں کی اہمیت یہاں یکساں ہے۔ دونوں وحی ہیں دونوں الہام ہیں۔ یا یوں کہیے دونوں اہم لازم وملزوم یا جسم وروح سا ناتا رکھتے ہیں۔ نہ الفاظ مستقل بالذات اور معانی سے تہی اور بے نیاز ہیں اور نہ معانی ایسی تجرید سے متصف کہ اظہار بیان کے لیے الفاظ وحروف کی منت پذیری سے آزاد ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا اولین اطلاق الفاظ و حروف کے اسی مجموعہ پر ہوتا ہے۔ جسے قول وکلام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ہم دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں۔'' [۱]

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا○

ہم عنقریب تم پر بھاری قول (فرمان) اتاریں گے (سورہ مزمل آیت ۵)

بہرکیف جہاں معانی ومطالب اہم ہیں وہاں الفاظ کا صحیح استعمال ان کی تشریح اور متن کے اعتبار سے ان کی موزونیت بہت اہم ہے۔

معانی ومطالب کو اگر الفاظ کی موزونیت اور شیرینی نہ دی جائے تو وہ دل ودماغ پر اس انداز میں اثر انداز نہیں ہوتے جو کہ بصورت دیگر ممکن ہے۔

اس لیے ہم یہ مضمون زیر بحث لائے ہیں تا کہ دونوں پہلوؤں کی اہمیت کو اجاگر کیا جاسکے۔

اگرچہ کچھ لوگوں (معتزلہ) کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ اصل اہمیت معانی ومطالب کی ہے نہ کہ الفاظ کی ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے طور پر جو بنیادی سبق دیا اور قلب پیغمبر پر اتارا وہ بنیادی عقائد ہیں جو قرآن اور اسلام کی بنیاد ہیں۔ مثلاً توحید امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اخلاقی اقدار بہتر عدل وانصاف

۱۔ مولانا حنیف ندوی، مطالعہ قرآن۔

Marfat.com

کے تقاضے ہیں، آنحضورؐ نے انہیں فکروشعور کے ذریعہ سمجھا اور پھر الفاظ کا جامہ پہنایا اس لیے جہاں تک قرآن فہمی کا تعلق ہے وہ اس کے معنی ومطالب سے اخذ ہوتی ہے۔

بعدازاں خلق قرآن کا نعرہ بھی بلند ہوا جس کا مقصد مخالفین کے اعتراضات سے بچنا خاص طور پر عیسائیوں کی بوچھاڑ جن سے بچنا متعلقہ حضرات کے لیے مشکل ہورہا تھا۔

بہرکیف یہ اضافی مسائل ہیں جو یہاں بیان کئے گئے ہیں اصل مسئلہ قرآن کا مطالعہ اور اس کی فہم ہے۔

امام غزالی جو اس ضمن (قرآن فہمی) میں ماہر مانے جاتے ہیں کہتے ہیں۔

''کہ قرآن پڑھنے کا مقصد قرآن کو سمجھنا ہے ان خیالات اور تصورات کا احاطہ کرنا ہے جن کا قرآن اپنی آیات میں ذکر کرتا ہے۔

ترتیل قرآن اس مقصد کے حصول میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے اور فضیلت کے مراتب بلند کرتی ہے۔ [۱]

قرآن کے ایک اور بڑے مفکر کہتے ہیں کہ ترتیل قرآن کے آداب واسلوب کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کس طرح کیا جائے کہاں قیام کیا جائے اور الفاظ کی کس طرح صحیح طور پر ادائیگی کی جائے'' [۲]

موسیقی سے احتراز

یہاں اس خبر کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ ترتیل قرآن میں موسیقی کو شامل نہیں کرنا چاہیے اور ہر قسم کی طرز اور راگ کے انداز سے احتراز کرنا چاہیے اسی طرح قرآن کی پاکیزگی اور نفاست کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

آنحضورؐ سے منسوب ایک حدیث اس سلسلے میں واضح ہدایت دیتی ہے یہ کہتی ہے کہ ''قرآن کو ایسے ہی پڑھو جیسے عرب اپنا مطالعہ کرتے وقت الفاظ کی ادائیگی کرتے ہیں اور آوارگی کی طرف مائل

۱۔امام جلال الدین سیوطی (وفات ۱۵۵۰)

۲۔امام غزالی کی طرح سیوطی کا بھی یہ خیال ہے کہ ترتیل قرآن کی طرف زیادہ توجہ دی جانی چاہیے کیونکہ اس سے قرآن سے دلچسپی اور خیالات کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے۔

Marfat.com

موسیقی کے راگ الاپنا منع ہے۔ خاص طور پر ایسے انداز میں ادائیگی جیسا کہ یہودی اور عیسائی اپنی کتابیں پڑھتے وقت کرتے ہیں اگر چہ کچھ جدید حلقوں کا یہ خیال ہے کہ کیونکہ موسیقی موجودہ تہذیب وتمدن کا ایک ضروری جزو ہے اس لیے اسے کسی نہ کسی صورت میں اپنایا جائے اور قرآن اور اس کے مطالعہ کو مقبول کیا جائے۔ لیکن مقبول کرنے کے لیے یہ حربہ اپنانا ضروری نہیں کیونکہ اس سے قرآن کی پاکیزگی اور خوبصورتی کے منفی انداز میں اثرانداز ہونے کا خدشہ ہے۔

قرآن میں ایسی روایات پیدا کر کے جدید تہذیب وتمدن کے بیہودہ پہلوؤں کو فروغ حاصل ہوگا اور بالاخر قرآن ایک بے ہودہ کلچر کا حصہ بن جائے گا۔

اس لیے ہر ممکن طور پر یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر اس قدم سے جو ہمیں اور ہمارے معاشرے کو بے راہ روی کی طرف لے جائے احتراز کرنا چاہیے۔

قرآن ایک نہایت اعلیٰ مرتبہ اور پاکیزہ کتاب ہے اور زندگی کے ہر پہلو کا سنجیدگی سے احاطہ کرتی ہے۔ اس لیے اسے کسی لہو ولعب کے میدان میں گھسیٹنا نہایت افسوسناک عمل ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ خطامہ (۹ ویں صدی) اور الاعرابی (۱۲ ویں صدی) جسے مفکرین نے بھی اس رجحان کی مذمت کی ہے اور ہر قسم کی موسیقانہ ملاوٹ سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔

ابن خلدون نے جو تاریخ اور دیگر معاشرتی علوم کے ماہر تصور کیے جاتے ہیں اپنی کتابوں میں ترتیل قرآن کے ضمن میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہر قسم کی آمیزش اس سلسلے میں نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

قرآن کے ضمن میں ابن خلدون کہتے ہیں کہ اسے ہر قسم کی لادینی آمیزش سے پاک رکھنا چاہیے اور تقریباً تمام مدارس فکر اس امر پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ شافعی حضرات بھی اس کے مخالف ہیں کہ کوئی لادینی راگ قرات کے ہم رکاب ہو۔

اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ابن خلدون کہتے ہیں کہ امام مالک نے اس ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔ امام مالک ایک بڑے مفکر گزرے ہیں اور ان کے خیالات اور تشریحات قابل ذکر ہیں۔ ان کا مطالعہ اس ضمن میں ضروری ہوگا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ معنی و

مطالب جاننے کے لیے زبان، الفاظ اور حروف کا جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ زبان ہی کے ذریعہ سوچ و فکر کے دہانوں کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور ارتقاء و تخلیق کا عمل بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

قرآن نے زبان کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ○''۔ (البقرہ:۳۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان کو زبان سکھائی تاکہ وہ تہذیب و تمدن کے ڈھانچہ کو ہم آہنگی اور خوبصورتی سے تشکیل دے سکے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ الفاظ اور معنی دونوں بیک وقت شعور کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں ایک پہلوتہی دوسرے سے ناانصافی ہوگی۔ [1]

اگر الفاظ اور معنی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو نہ صرف فکر و نظر کی وسعتوں میں کمی آئے گی بلکہ تخلیق کا عمل بھی ادھورا رہے گا۔

تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نت نئے ندالے الفاظ نئے انداز میں وجود میں آئیں اور زبان کی ہم آہنگی اور شیرینی میں متواتر اضافہ ہوتا رہے علم و دانش کے دریچے کھلتے رہیں اور نظر و فکر اور غور و فکر میں اضافہ ہوتا رہے۔

لبیب السعید اپنی کتاب المصحاف ''المرتیل'' میں کہتے ہیں کہ اظہار بیان کے لیے یہ ضروری ہے کہ زبان کی شیرینی کا خیال رکھا جائے ورنہ اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوگی جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

اس رائے سے موجودہ دور کے بہت سے دانشمند اور مذہبی حلقے اتفاق رکھتے ہیں۔

آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو قرآن مجید کو اس کی شیرینی اور گہرائی کے ساتھ نہیں پڑھتا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے''

ساتھ ہی اس کے معانی و مطالب میں آدمی اس قدر ڈوب جائے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی

ا۔ ابن خلدون مطالعہ تاریخ صفحہ 100

Marfat.com

لڑیوں سے بھرپور ہو جائیں یہی قرآن کا اعجاز ہے اور یہی قرآن کا کلام سے مستفیض ہونے کا ذریعہ۔

قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی روح تڑپتی ہے اور اس کے درد و درماں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کو مزید موثر انداز میں سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ''لسانی سطح پر اس بات کا اعتراف ہو جائے کہ وحی اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ جب بھی قلب پیغمبرؐ پر نازل ہوتی ہے اپنے ساتھ الفاظ، اصطلاح، پیرائیہ بیان اور متن کی خصوصیات بھی لاتی ہے۔ اور اسی کلیہ کے مطابق قرآن حکیم نہ صرف ایک کتاب اور پیرانیہ اظہار ہے بلکہ اس کا ایک ایک لفظ، حرف اور نقطہ بجائے خود تعبیر و استدلال کی تمام تر خوبیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر شوآن اگر یہ کہتا ہے کہ قرآن کے الفاظ و حروف میں ایک طرح کا کیمیائی اثر یا سحر آفرینی ہے جس سے قلب و ذہن جلا پاتا ہے۔ انسانی جسم حسن و رعنائی کے قالب ہیں ڈھلتا اور عالم کون و مکان میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔

تو غلط بات نہیں کہتا بلکہ یہ تو اپنی حقیقت کی صدائے بازگشت ہے جس کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے'' کہ جو قرآن تلاوت کرتا ہے اس کو ہر ہر حرف کے بدلے ایک نیکی کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے جو دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگلا ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام دوسرا اور میم تیسرا حرف ہے۔ اور جب قرآن حکیم اس کے بارے میں برکات کا لفظ استمال کرتا ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس کے ایک حرف اور لفظ میں تاثیر و تفسیر بے شمار پہلو پنہاں ہیں'' [۱]

''اور یہ کتاب جسے ہم نے نازل کیا بابرکت''

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

ترجمہ: اور یہ مبارک والی کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔ تصدیق کرتی ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے تھی۔ تا کہ ڈرادے اس شہر والوں کو اور ان کو جو گرد اسکے ہیں۔ (سورۃ الانعام: ۹۲)

۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ ''مطالعہ قرآن'' صفحہ ۱۰۴

الغرض لسانی، نفسیاتی یا روحانی جس پہلو سے بھی دیکھا جائے قرآن کے الفاظ، متن یا مطالب سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کو سمجھنا اور اس کی برکات سے مستفیض ہونا اس لیے وحی والہام کے شاہکار ہیں جسے قرآن کہا جاتا ہے معنی و حروف برابر اہمیت اور تقدس کے حامل ہیں دونوں کے ہی ذریعہ انسانی روح کو بالیدگی۔ عقل کو پاکیزگی اور جسم کو رعنائی ملتی ہے۔[1]

۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ ''مطالعہ قرآن'' صفحہ ۱۰۴

Marfat.com

Marfat.com

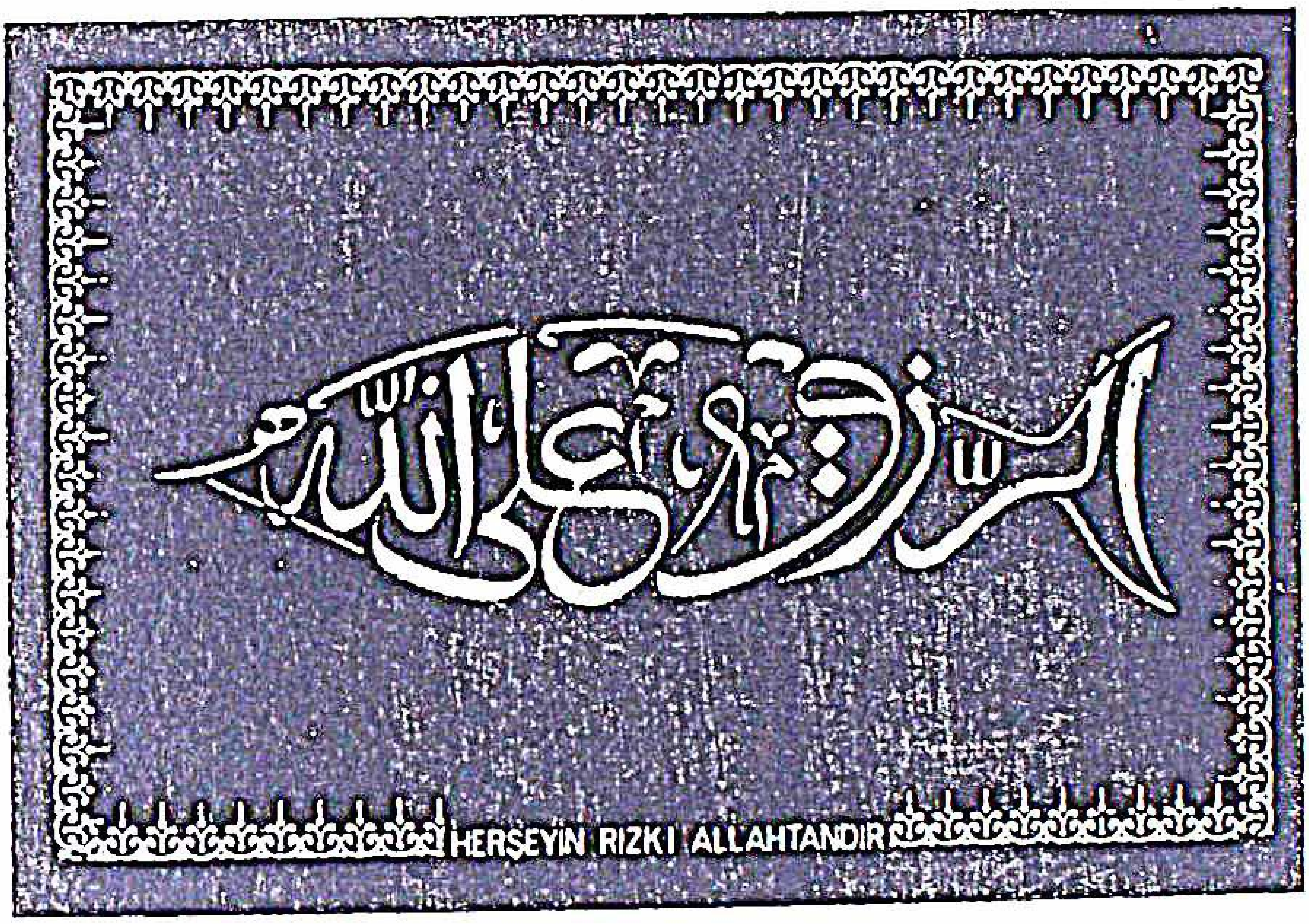

Marfat.com

Marfat.com

عقل اور الہام کا امتزاج

﴿باب ۸﴾

مقام ربوبیت اور حُسن عبودیت

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمۡ يَلِدۡ ۙ وَلَمۡ يُوۡلَدۡ ۙ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

ترجمہ: ''کہہ دیجیے کہ اللہ کی ذات ہی ایک ایسی ذات ہے جو یکتا اور سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے''

(سورۃ ۱۱۲۔۴۔۱)

یہ وہ بنیادی تصور ہے جو اس آیت کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے اور جو ہمارے ایمان، یقین اور دین کی بنیاد ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم اس مقام پر پہنچتے ہیں جو ہمارے لیے مقرر کیا گیا ہے اور جو ہمارا مقصود ہے۔

اس پیغام کے اولین مخاطب تو آنحضورؐ تھے لیکن بالآخر اس کے مخاطب تمام وہ مومنین ہو گئے جو آنحضورؐ کے پیروکار ہوئے یا ہوں گے۔

آخرت تک یہ پیغام جوں کا توں اٹل ہے اور اس کی حقیقت اور اہمیت دائمی ہے یہ کوئی نیا پیغام نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی انسان کے تخیل کی اختراع ہے۔ حقیقت میں یہ انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ جو تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اس پر آشکارا ہوتا جاتا ہے۔ حضرت آدم کی پیدائش سے لیکر اب تک یہ پیغام ہم تک اسی صورت میں پہنچ رہا ہے جس میں یہ بنیادی طور پر وضع کیا گیا تھا۔ یہ اس بنیادی اصول پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام کائنات کا خالق ہے اور وہی یکتا اور تنہا اس کا حاکم ہے۔

اس پیغام کی تشریح کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے (سورۃ ۷: ۱۷۲)

Marfat.com

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِھِمْ ج اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ط قَالُوْا بَلٰی ج شَھِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ o

''اور جب تیرے پروردگار نے آدم اور اس کی اولاد کو اس امر پر گواہ بنایا اور ان سے پوچھا کہ کیا میں ان کا رب نہیں ہوں اور انہوں نے اقرار کیا کہ بے شک آپ ہی ہمارے رب ہیں اور ہم اس کی گواہی دیتے ہیں یہ اقرار اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ قیامت کے روز اس حقیقت سے منکر نہ ہوں اور یہ نہیں کہیں کہ ہم تو اس حقیقت سے غافل تھے۔

(سورۃ الاعراف۔۱۷۲)

یہ توحید کا بنیادی سبق ہے جو قرآن مجید اور اس سے پیشتر آنے والی الہامی کتابوں میں مسلسل تائید کے ساتھ نازل ہوتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا پیغام اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ واحد قادر مطلق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

لیکن اس حقیقت کے باوجود شرک اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبودوں کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہا۔ مختلف ادوار میں اور مختلف اوقات پر جہالت اور لادینی رجحانات کے تحت لوگ دوسرے معبود گھڑتے رہے اور اُن سے رجوع کرتے رہے اور اس طرح یہ بنیادی حقیقت جس پر کہ بنی آدم کی گواہی لی گئی تھی اپنا اصل رنگ زائل کرتی رہی اور شرک کے اثرات سے پراگندہ ہوتی رہی۔

صحاک اور قتادہ اور مقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ وفود آنحضورؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا۔

''اے محمدؐ! اپنے رب کی کیفیت ہمیں بتایئے کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت تورات میں نازل کی ہے۔ آپ بتایئے کہ اللہ تعالیٰ کس چیز سے بنا ہے اور کیا وہ کھاتا پیتا ہے اور کس سے اس نے دنیا وراثت میں پائی ہے اور اس کے بعد کون اس کا وارث ہوگا۔[۱]

اس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر مختلف لوگ اس قسم کے سوال کرتے تھے اور آنحضورؐ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصیات دریافت کرتے تھے۔

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ''تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ صفحہ ۵۳۱

اس لیے ان سوالات کی وضاحت کے لیے یہ سورت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی بنیادی خصوصیات کونہایت موثر انداز میں صحیح طور پر بیان کر دیا۔

توحید اور وحدانیت کا سلسلہ جیسا کہ ہم نے اوپر سورۃ الاعراف (۱۷۲) میں دیکھا پیدائش آدم سے چل رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف پیغمبروں پر اس کا نزول ہوتا رہا جیسا کہ سورۃ الانبیاء آیات ۱۶۶۔۱۶۵ میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے لیکر آنحضورؐ تک سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا اور قرآن میں بہت سے پیغمبروں کا ذکر بیان نہیں کیا گیا ہے۔

(سورۃ النساء ۱۶۶۔۱۶۵)

اور ایسی ہی بہت سی سورتیں قرآن مجید میں اور اس سے پہلی الہامی کتابوں میں نازل ہوئیں جن کا مقصد اللہ کی وحدانیت کو قائم کرنا تھا۔ ان سے کچھ لوگوں نے ہدایت حاصل کی لیکن بہت سے لوگ گمراہی اور شک میں ہی دھنسے رہے۔

سورۃ الانبیاء (آیت ۲۵) میں اسی پیغام کا اعادہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف وحی کی کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں ہے، صرف میری ہی عبادت کرو۔''

چونکہ اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اور مشرکین مکہ اس بیماری میں بہت زیادہ مبتلا تھے اس لیے اس دعوت کا رخ انہی کی طرف تھا۔

شرک اور گمراہی عام تھی اور مختلف قسم کے بت ہر جگہ موجود تھے۔ ان کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ وحدانیت میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وحی اور نبوت کا فریضہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔

آئندہ آنے والی صدیوں میں اگرچہ مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ پیغام پھیلایا گیا لیکن اس کے اثرات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا اور لوگ متواتر لادینیت اور گمراہی کی گہرائیوں میں ڈوبتے رہے۔

حضرت عیسیٰؑ اور ان سے قبل کے دور میں علم و دانش میں اضافہ ہوا اور یونان کے فلسفیوں نے

Marfat.com

مذہب اور نافوق الفطری امور کی طرف زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے ذہن کی گہرائیوں میں ڈوب کر فطرت اور قدرت کے راز جاننے کی کوشش کی اور سچائی کو اس کے مختلف مضمرات کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی۔

فیثا غورث سقراط اور ارسطو کا شمار ایسے مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے حقیقت کے رموز کو جاننے کی کوشش کی اور کسی حد تک سچائی کی اہمیت منوانے میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ اس کے لیے ایک بڑی قیمت ادا کرنا پڑی اور زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا لیکن وہ راہ حق سے نہیں ہٹے۔

سقراط کی کوششیں اس ضمن میں قابل ذکر ہیں اس کے زمانے (۳۹۹۔۴۷۰ قبل از مسیح) میں کچھ مفکرین نے سچائی، پاکیزگی اور وحدانیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔

اس کے بعد افلاطون (Plato) نے اعلیٰ خیالات پر مبنی سچائی کا تصور دیا جو آگے چل کر حقائق کو آشکارا کرنے میں خاصا معاون ثابت ہوا۔

افلاطون تصور سچائی کو ایک ابدی حقیقت سمجھتا تھا اور اس کا پرتو اللہ تعالیٰ کی ذات کی خوبیوں میں نظر آتا تھا۔

ارسطو سچائی اور نیکی (Aristotle) نے ان خیالات کو ایک جامع صورت دی۔ اور یہ ڈھانچہ اس بنیادی تصور پر قائم ہوا کہ واقعات اور حالات کا ایک ایسی ذات کے نتیجہ میں جنم ہوتا ہے جو موجود ہے اور اپنی دانش اور طاقت سے ان تمام واقعات کو پیدا کرتی ہے جو ہمیں اپنے اردگرد اور کائنات کے دوسرے مقامات پر نظر آتے ہیں اس نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی کہ خدا کی ذات کے بغیر واقعات کا رونما ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور اسی کے قبضہ قدرت میں ہر قسم کا تغیر و تبدل عمل میں آتا ہے۔

اگرچہ یونانی فلسفی سچائی کے متلاشی تھے اور حقائق کی تہہ تک جانے کے لیے کوشاں تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کا ایک واضح تصور وضع نہیں کر سکے تھے چونکہ وہ اللہ کے بارے میں ایک واضح تصور قائم نہیں کر سکے اس لیے دوسرا بڑا قدم جو انہوں نے اس سلسلے میں اٹھایا وہ نیکی اور سچائی کی حقیقت جاننے کی جانب تھا اور اس سے اعمال اور عقل و خرد کی پاکیزگی بھی جنم لیتی تھی جو کہ ایک اچھی اور کامیاب زندگی کی ضروری شرط ہے۔

بہر حال علم و دانش کے متلاشیوں کے لیے سچائی کے اصل منبع کو جاننا ایک متواتر جدوجہد کا درجہ

Marfat.com

اختیار کرتا رہا ہے۔

فلسفیوں کی اکثریت اس بات پر متفق رہی ہے کہ اللہ کی صفات کو جان کر ہی سچائی اور پاکیزگی کے دھارے کو ہموار کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ دور میں مادیت اور خصوصاً لادینیت نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کو خاصا دھچکہ پہنچایا ہے اور یہ دھچکہ نہ صرف مغربی ممالک میں محسوس کیا جارہا ہے بلکہ مسلم حلقے بھی خاصی حد تک اس کی زد میں آچکے ہیں۔ اور وہاں وہ وحدانیت اور اخلاقیات کا تصور جو اسلام نے پیش کیا تھا کافی حد تک مفقود ہوتا نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اب صرف نام کے مسلمان رہ گئی ہے اور توحید سچائی اور پاکیزگی کے اثرات بہت کم ہوگئے ہیں۔ اس لیے اس کتاب میں ہم نے ان امور کو زیادہ واضح کیا ہے جو ہمارے معاشرے کی اخلاقی اور مذہبی روایات پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ تمام حقائق قابل غور وفکر ہیں۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس کا مطالعہ اور اس پر سوچ وفکر اس نقطہ نگاہ سے کرنا ضروری ہے کہ اسے عملی جامہ پہنایا جاسکے اور تبھی ہم ان مثبت نتائج کو اخذ کرسکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں ودیعت کیے ہیں۔

موجودہ دور میں جہاں مفکرین کی اکثریت جدیدیت کے مادی اثرات سے متاثر ہے وہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو الوہیت اور عبدیت کے فطری تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان سے اپنی فکر کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ایسے مفکرین میں آندرے لنگ (Andre Ling) کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یورپ کے ان مفکرین میں سے ایک ہیں جو ایک خالق حقیقی کی ہستی میں یقین رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اتنی وسیع کائنات اور نظام حیات بغیر ایک خالق حقیقی کے وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

لنگ کہتے ہیں کہ ''ہر شخص اپنے دل میں ایک بلند پایہ نظریہ کا حامل ہوتا ہے اور یہی انداز فکر عقیدہ کی بنیاد کے لیے کافی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک خدا کی ہستی ضرور ہے جو کائنات کو پیدا کرنے والی اور اس کو بنانے والی ہے اور ہر انسان کے پاس اس عالم کی موجودات کی صفت کے متعلق ایک ایک انداز فکر ہوتا ہے کہ وہ ایسے صانع کی ذات پر یقین رکھتا ہے جو ان کو وجود میں لاتا ہے اور وہ خود ان

چیزوں کو نہیں بتا سکتا۔

اسی طرح جدید مایوفزکس کے پروفیسر ڈاکٹر پال کلیرنس یوسولڈ (Paul Clearanc Isosold) [۱] کہتے ہیں کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی توجہ اور جستجو اپنی عقل سے زیادہ عقل والے کے متعلق اور اپنی تدبیر سے زیادہ مستحکم اور وسیع پیمانے پر تدبر کرنے والے کے سلسلے میں پائی جاتی ہے تا کہ وہ اس کائنات کی تحقیق میں اس سے مدد لے سکے جو یہ چیز بجائے خود ایک بہت بڑی اور زبردست تدبیر مکر نے والی قوت کے وجود پر شمار ہوتی ہے اور وہ قوت اور تدبیر اللہ ہی ہے۔

اور انسان محض مادی علمی دلائل کی بنیاد پر خالق کے وجود کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم ایمان کامل کی طرف اس وقت پہنچ سکتے ہیں جب ہم علمی توجیحات اور الہامی دلائل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں۔''

تب ہی ہم الوہیت کے تصور کا ادراک کر سکتے ہیں اور اسے اپنے ذہن میں سمو سکتے ہیں۔

اگر چہ کچھ جدید سائنسدان اور مفکرین علمی اور عقلی دلائل کو الہامی کلام کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن توحید کی حقیقت یا ربوبیت کا تصور جو قرآن نے ہمیں دیا ہے وہ ابھی ان کے دل و دماغ پر غالب نہیں آسکا ہے جبکہ قرآن نے اس حقیقت کو اس طرح سے بیان کیا ہے

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ o وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ o

پس اے نبی اور نبی کے پیروکارو ایک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل صحیح اور درست دین ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ (الروم ۲۱۔۲۰)

اس لیے قرآنی کلمات اور جدید سائیٹفک سوچ میں ہم آہنگی کی ضرورت ہے تا کہ ہم صحیح سمت میں

۱۔ Paul Clearanc Isosold

Marfat.com

اپنا رخ پھیر سکیں اور ایک ایسی راہ اختیار کر سکیں جو فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہو جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے دوسرے ابواب میں جدید سائنس کی تحقیقات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے الوہیت انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور اس لیے کائنات کے خالق پر اعتقاد رکھنا بنیادی تقاضا ہے۔

اللہ پاک کے کلام پر غور و فکر کرنا اور جدید سائنسی تحقیقات کو بغیر کسی تعصب اور تنگ نظر رجحانات کے افہام و تفہیم کی غرض سے سمجھنا ایک ضروری امر ہے موجودہ دور میں چونکہ مادی اور لادینی رجحانات شدومد سے پھیل رہے ہیں اس لیے ایک ہم آہنگی کی صورت اپنا اثر دکھانے میں ناکام ہو رہی ہے اور بہت سے لوگ الوبیت اور ربوبیت کے حقائق کا ادراک نہیں رکھتے حالانکہ علمی اور روحانی کیفیات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ایک بنیادی تقاضا ہے جس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔

چونکہ فطری طور پر انسان بندہ ہے اور عبودیت اس کی فطرت کا تقاضا ہے اس لیے بندگی کی طلب و جستجو کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور ربوبیت اور عبودیت کا صحیح فطری نظام قائم کئے بغیر انسانیت کے اعلیٰ مراتب حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر اقبال نے کہا تھا۔

مقام بندگی دیگر نہ لوں مقام خداوندی

بہرکیف یہ ایک سوچ و فکر کا مقام ہے جہاں پہنچ کر آدمی اپنے لیے صحیح راہ کا تعین کرتا ہے وہ راہ جو اس پر وقت آفرینش سے عیاں کر دی گئی ہے اگر صحیح راہ اختیار نہ کی جائے تو خدشہ ہوتا ہے کہ آدمی کی نظر و فکر کی صلاحیتیں مضمحل ہو جائیں اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جائے کہ عقل و دانش کی موجودگی میں اس کی سوچ درست ہوگی اور اس طرح وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے جو بالآخر گمراہی کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے اور ربوبیت اور عبودیت کے صحیح معنوں سے بے بہرہ کر سکتی ہے۔

الوہیت اور ربوبیت کا ادراک اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان ایک ناقابل تلافی زیاں کے کرب میں مبتلا ہو سکتا ہے جو اسے اسفل السافلین بنا کر اس کی نجات کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

اس صورت میں اس کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں جو بغیر ایسی ذات کے جو اس کی صحیح

Marfat.com

رہنمائی کر سکے دور نہیں ہوتیں۔ اور یہی مقام ربوبیت سے جو بندہ کو رب العالمین کی ذات سے آشنا کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ سوچ ایک فطری تقاضا ہے جو اس کی فطرت میں ابتدائے آفرنش سے آج تک موجود ہے اس کا اظہار قرآن نے تو بار بار کیا ہے لیکن سائنس اب تک اس پر صحیح انداز میں لب کشائی نہیں کر سکا ہے۔ سائنس کو جو اپنی تحقیقات میں عقل و دانش کا سہارا لیتا ہے اور نت نئے تجربات کرتا ہے ان حقائق سے نظر پوشی میں کرنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو ان حقائق کا جائزہ لیا جانا چاہیے جیسا کہ حال میں امریکہ کے سائنسدانوں نے دماغ اور ربوبیت میں ایک رابطہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں اس کتاب میں ہم نے دماغ اور مذہب پر ایک مضمون تحریر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ ہر نئے پیدا ہونے والے بچہ کی فطرت اعتقاد خداوندی پر مبنی ہوتی ہے کوئی سطحی دعویٰ نہیں ہے بلکہ قدرت کے رموز پیدائش میں سے ایک ہے اس پر توجہ دینا ضروری ہے کیونکہ اس سے بہت سے حقائق کا پختہ بنیادوں پر علم حاصل ہوگا اور لادینی حلقوں کو دین فطرت کی طرف مائل کرنا ممکن ہوگا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے ''جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسے پکارتے ہیں''۔

جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں (یعنی بادلوں) کی طرح (محیط ہو کر) گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ کو ہی پکارتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَکُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ۝

(سورۃ لقمان آیت ۳۲)

اس طرح قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان کس طرح فطرتاً اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس کرتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو منسلک کرتا ہے۔

ہم یہاں یہ بھی کہتے چلیں کہ علم اور ایمان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ ایمان اور عقیدہ سے بھی تہی دامن ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے تدبر و تفکر کی تلقین کی ہے۔

Marfat.com

یورپ کے ایک ممتاز مفکر لوئی پاستور (Louis Pasteur) کہتے ہیں۔

''ایمان کسی بھی قسم کی ترقی کو نہیں روکتا۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو ترقی کرتی ہے وہ اللہ کی مخلوقات کے مختلف مدارج کا احاطہ کرتی ہے اور علم سے اس کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔

جتنا میں آج علم رکھتا ہوں اگر اس سے زیادہ علم رکھتا تو بلاشبہ اس وقت میرا ایمان موجود ایمان کی نسبت زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتا''

لوئی پاستور آگے چل کر کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ صحیح علم مادی ہی ہو بلکہ وہ حقیقت میں ایمان باللہ میں زیادتی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ وہ کائنات کا تجزیہ ہے جو مہارت اور بصارت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور اللہ کی ذات پر ایمان میں تقویت کا باعث بنتا ہے۔

نیز اس ایمان کی حکمت ان قدرتی قوانین کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے جو نظام حیات و کائنات کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں یہ قوانین بغیر ایک ایسی ہستی کے جو کہ باکمال ہو وجود میں نہیں آسکتے تھے۔

ایک اور سائنسدان کہتا ہے کہ ''جب میرا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے تو میں اس کو مضبوط کرنے کے لیے سائنس اکیڈیمی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ [۱]

ایک اور یورپی سائنسدان جو مشہور عالم الافلاک ہوا ہے کہتا ہے

''یہ بات غلط ہے کہ سائنسدان کو اس کا علم اسے خدا سے منکر کرتا ہے۔ [۲]

ایک اور مشہور جیالوجسٹ ایڈیسن ہربرٹ نے کہا ہے

''کہ یہ ممکن نہیں کہ سائنس کسی کو کفر مادیت یا خدا کے وجود میں انکار کی طرف لے جائے'' [۳]

الوہیت اور ربوبیت کے بارے میں یہ چندان سائنسدانوں اور مفکرین کی آراء ہیں جنہوں نے خدا کی ہستی پر

۱۔ لنکن ونز۔ بیمر اکیڈیمی آف سائنسز۔ باریزہ کالج

۲۔ نی نون۔ اکیڈیمی آف سائنسز۔ ''اصل العوالم''

۳۔ Edison Herbert France\ University Soborue

Marfat.com

اپنے ایمان سے علم مستحکم کیا۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل و دانش کے ساتھ ربوبیت کے رموز کو بھی سمجھا جائے اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق اپنے رجحانات میں توازن پیدا کیا جائے اسی صورت میں ہم عقل اور الہامی (قرآنی) دلائل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں تب ہی ہم مقام ربوبیت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور خاصہ انسانیت (عبودیت) اخذ کر سکتے ہیں۔

اس مضمون میں ہم نے الوہیت اور عبودیت کے کچھ اہم پہلوؤں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے جو ہمیں ان حقائق کی حقیقت اور غرض و غایت کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ انسان کی عظیم ترین کامیابی وہ شعور و ادراک ہے جو اسے ہستی باری تعالیٰ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور ان علوم کو حاصل کرنے کی طرف راغب کرتا ہے جو ایمان باللہ کو تقویت دیتے ہیں اس علم سے اور ایمان کے ساتھ انسان ''مقام شاہدیت و رضوان'' پر متمکن ہوتا ہے۔

''یہ مقام واردات کے اعتبار سے ارتقائی ہے اس کا پہلا درجہ ''دوست'' کی دید و بقاء کا ہے اور اس کا دوسرا درجہ جو پہلے سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے ''ہم نظری اور ہم کلامی کا ہے''

لیکن جہاں تک مقام رضوان کا تعلق ہے یہ ہم رضائی کا حُسن المقام ہے۔

اس مقام کے ارتقاء کی نوعیت دوہری ہے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اپنے بندوں سے اور دوسرے بندوں کی خوشنودی اللہ تعالیٰ سے انسان فطرۃ عبد ہے۔ ''عبودیت'' اسکا خاصہ اور عبادت اسکی طمانیت و مسرت کا واحد ذریعہ ہے، جو ابدالآباد تک قائم رہے گا۔ یہی حسن عبودیت ہے

۱۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ''فلسفہ حسن''، صفحہ ۸۳

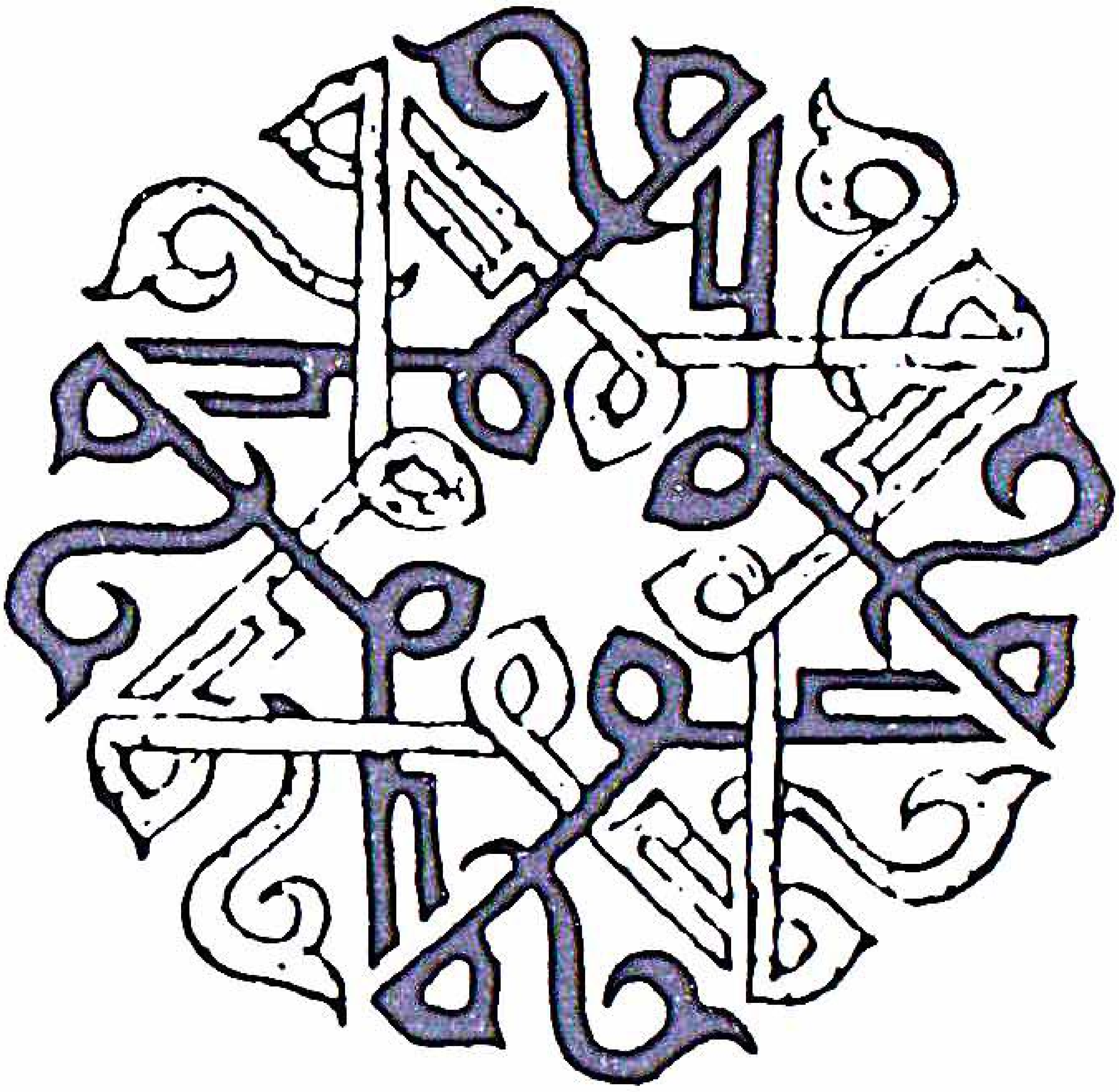

Marfat.com

سچائی کی تلاش میں ﴿باب ۹﴾

فلسفہ۔ سائنس اور مذہب کا مشترکہ سفر

یونانی فلسفیوں کا اثر ورسوخ پہلے ہی کئی مسلمان مفکرین پر گہرے نقوش چھوڑ چکا تھا جس کے تحت ان کے تحقیقی مقالے عربی اور انگیریزی زبانوں میں منتقل ہوئے اور انہوں نے یورپ میں ''نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔

دسویں، گیارویں اور بارویں صدی عیسوی میں ان اثرات کو مزید فروغ حاصل ہوا جبکہ کچھ مسلمان فلسفیوں، دانشوروں نے بصرہ اور بغداد میں ایک تنظیم قائم کی جس کا نام اخوان الصفار رکھا گیا۔ اس کا مقصد ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا جہاں فلسفہ۔ مذہب اور سائنس پر مقالے اور مذاکرے منعقد کیے جاسکیں اور ہم موضوعات پر تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ نیز اس سے تعصبات اور تنگ نظری کو بھی دور کرنا مقصود تھا تاکہ کھلی فضا میں ذہنی وسعتیں پیدا کی جاسکیں اور مذہب کو عقل وخرد کے پیمانے کے ساتھ سمجھا جاسکے۔ انکا خیال تھا کہ یہ فضا علم و دانش اور روح کی تقویت کے لیے نہایت ضروری ہے انہوں نے مذہب کو اس طرح پیش کرنا چاہا کہ وہ فلسفہ اور سائنس سے ہم آہنگ ہو۔

انکے نزدیک اسلام کا روایتی تصور جس میں دقیانوسی لوگ مبتلا تھے درست نہیں تھا۔ اگرچہ ان کے نظریات سیاسی نوعیت کے نہیں تھے لیکن وہ بنو عباس کے خلفاء کے حق میں بھی نہیں تھے۔ وہ ان کی مذہبی اور سیاسی حکمت عملی کے خلاف تھے اور لوگوں کو پوشیدہ طور پر ان کے خلاف اکساتے تھے۔ ان کے نظریات کے بارے میں بیشتر معلومات ہمیں ابوحیان التوحیدی کی تصانیف سے ملتی ہیں جو ان کا ہم خیال تھا۔

Marfat.com

نظریہ علم

وہ نظریہ علم میں ارسطو سے زیادہ متاثر تھے اور اسے روح کی بالیدگی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے کیونکہ حقائق کا شعور اور علم و دانش کا فروغ انسانی زندگی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

انہوں نے علوم کی تین بڑی اقسام بیان کیں۔

ریاضی، طبیات اور مابعد الطبیات، ان کا خیال تھا کہ باقی علوم کو ان اقسام کے تحت لایا جاسکتا ہے۔

وہ افلاطون (Plato) کے نظریہ علم سے بھی متاثر تھے اور علم کو انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیتے تھے حقائق کا شعور حاصل کرنا ضروری ہے خواہ وہ کسی عالم سے ہو یا براہ راست اللہ تعالیٰ کے الہام کلام سے جیسا کہ آنحضور کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا الہامی کلام کے علاوہ ریاضی اور منطق کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے اس کے بغیر عقلی صلاحیتوں کو جلا نہیں بخشا جاسکتا۔

اخوان الصفا کے مابعد الطبیاتی نظریات میں فلاطینوس کے خیالات کا اثر نظر آتا ہے ان کا خیال تھا کہ اللہ کی ذات انسانی فکر سے مبرّہ ہے اور وہ احاطہ علم میں آہی نہیں سکتی۔

اس طرح اخوان الصفا نے نظریہ زیست کائنات اور مذہبی نظریہ تخلیق کے مابین ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ مذہب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

انہوں نے نو فلاطونی نظریات کی روشنی میں تخلیقی عمل کی وضاحت کی اور اُن مراحل کی نشاندہی کی جن سے یہ عمل ہو کر گزرتا ہے۔

ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ علت العلل ہے۔ اور جب تک معلول برقرار رہتا ہے یہ علیق بھی کارفرما رہتی ہیں۔ وہ زندگی اور حیات بعد الموت کے بارے میں بھی فیثاغورث کے نظریہ سے متاثر تھے۔ انہی کی طرح وہ شادی کے بندھن میں پھنسنا پسند نہیں کرتے تھے۔

Marfat.com

سائنس

اخوان الصفا سائنس اوراس کی تحقیقات کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے اوران سے مستفید ہونا زندگی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ریاضی، جیومیٹری اور طبیعات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اوراس میں مہارت حاصل کی۔

انہوں نے کائنات میں تین قسم کی موجودات دریافت کیں معدنیات۔ نباتات اور حیوانات۔ ان میں ارتقاء کا عمل جاری ہے اوراسی کے سبب وہ تکمیل وتشکیل کے مراحل طے کرتے ہیں۔

اخلاقیات

اخوان الصفاء نے روح کی بالیدگی اور عقل وخرد کی پاکیزگی کے لیے اخلاقی اقدار پر بہت زور دیا۔ ان کے نزدیک اخلاقیات کو عقل کے ذریعہ پرکھا جانا چاہیے اور جو چیز انسانی فطرت کے خلاف ہو اسے رد کردینا چاہیے۔

اس لیے خیروشر کا پیمانہ بھی عقل ہے۔ شر سے بچنا اور نیکی کو اپنانا ہی زندگی کی معراج ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے اور انسان کو ہمیشہ نیکی کی بستی میں ہی بسیرا بنانا چاہیے۔

انسانی سیرت اور کرداراسی طرح نشوونما پاتا ہے اور خداداد اور صلاحیتوں سے جلا حاصل کرتا ہے۔ وہ قرآن مجید کے اس نظریہ سے متفق تھے کہ تمام انسان نیک سیرت پیدا ہوتے ہیں لیکن حالات اور گردونواح کی گندگی سے برائیاں جنم لیتی ہیں اور انسان اسفل السافلین ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اصلاح کے عمل کو بروئے کار لایا جائے اور ہمیشہ اپنی سیرت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ تب ہی انسان قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر اعلیٰ اخلاقی معیار حاصل کرسکتا ہے وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ خیر کا عمل لازم ہے اور وہ جغرافیائی ماحول سے براہ راست اثر انداز ہوتا ہے اس لیے اخلاقی پاکیزگی اور روحانی بالیدگی کے لیے نیک سیرت ہونا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ نیکی کا حصول ایک مسلسل جدوجہد ہے جو خارجی حالات میں بہرکیف جاری رہنی چاہیے۔

توحیداورقرآن

قرآن کے بارے میں وہ اسکی خوبیوں کے قائل تھے اوران کا عقیدہ تھا کہ ایک الہامی اور سچی کتاب ہے جو پہلے آنے والی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انسان قرآن کے ذریعہ سچائی اور وحدانیت کے رموز کو جان سکتا ہے اوران پر چل کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا شعور حاصل کرسکتا ہے۔ اگرچہ اس شعور کے حصول کے لیے عقل کا عمل دخل بھی ضروری ہے۔اور عقل کے پیمانے پر ان اصولوں کو پرکھنا ضروری ہے جوقرآن اوردوسری الہامی کتابوں نے وضع کیے ہیں۔

وہ قرآن مجید کوہدایت کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔لیکن ایسے روایتی تصور کے خلاف تھے جو اسلام کوعقلی اور دنیاوی خدوخال سے جدا کر دیتا ہے۔وہ اس حقیقت کے معترف تھے کہ اسلام میں صلاحیت موجود ہے جو بدلتے ہوئے حالات کوسلجھاسکے اور انسان کو بگڑنے سے بچاسکے۔اسلام کی یہ صلاحیت اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے اور ہر دور میں سماجی اور معاشرتی نظام کو بہتر بنانے میں نمایاں کردارادا کرتی ہے۔اسلام نہ صرف دنیاوی مسائل کوحل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ روحانی طور پر بھی انسان کو بالیدگی اور پاکیزگی بخشتا ہے۔

قرآن کی آیت لااکراہ فی الدین کے مطابق اخوان الصفاءاوردیگرآنے والے مفکرین دین میں جبرواکراہ کے قائل نہیں تھے۔

ان کے نزدیک انسان کی عقل اس امر کا تعین کرسکتی ہے کہ ہدایت اور سچائی کی کونسی راہ درست ہے اوراس کی منزل کس طرح اس کے نزدیک تر ہوسکتی ہے۔

اخوان الصفاء سے پہلے اور بعد میں ہمیں ایسے مفکرین نظر آتے ہیں جنہوں نے مذہب،توحیداور انسانیت کے مختلف پہلوؤں کو فلسفیانہ اور عقلی انداز سے پرکھا اور ہدایت اورسچائی کے متلاشی رہے ان میں مشہور نام یہ ہیں۔ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی (۸۰۱ءتا۸۷۳ء)ابونصر الفارابی (۸۷۰ء تا۹۵۰ء)ابن سینا (۹۸۰ئتا۱۰۳۰ء)،ابن یعقوب سکویہ (المتوفی ۱۰۳۰ء)ابوحامد ممدان الموسی وشافی الغزالی (۱۰۵۸ءتا۱۱۱۱ء)،ابن ماجہ (المتوفی ۱۱۳۸ء)،ابن طفیل (المتوفی ۱۱۸۵ء)،ابن رشد (۱۱۲۶ءتا

۱۱۹۸ء)،ابن خلدون (۱۳۳۲ء۱۴۰۲ء)

یہاں یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ علم اور شعور کے حصول کے لیے جہاں الہامی کلام اور نبوت کا ایک اہم کردار ہے وہاں عقل، دانش اور فلسفہ کا بھی رول نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ علم کے متلاشی مختلف ذرائع سے سچائی اور حقائق جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ دینی اور دنیاوی امور کے علاوہ اللہ کی وحدانیت ایک ایسا پہلو ہے جس پر ہر ذریعہ سے غور وفکر لازم ہے۔

قرآن نے اللہ کی وحدانیت کی طرف جیسا کہ ہم نے اوپر (۴۔اشورہ ۱۵: ۱۱۲ میں دیکھا) دعوت دی اور اس کا خاطر خواہ شعور حاصل کرنے کے لیے نظام کائنات کو عقلی دلیل کے طور پر پیش کیا۔

اللہ کی وحدانیت اور اس کا ادراک حاصل کرنے کے لیے انسان کو عقل وخرد عطا کی گئی جس کی ابتدا حواس خمسہ سے ہوتی ہے حواس خمسہ سے ان چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے جو غیر موجود ہوتی ہیں۔ یا جن کا صرف خیالات اور تخیل کے ذریعہ ہی احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ تخیلات اور انسانی سوچ کا چولی دامن کا ساتھ ہے جب آدمی غیر مرئی چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ مادیت سے تجرد کی طرف سفر کا آغاز کرتا ہے۔

اللہ کی وحدانیت بھی ایک ایسا ہی تصور ہے جس کی جزئیات کا ادراک بہت مشکل ہے۔ لیکن انسان کا اپنا وجود اور کائنات کا نظام ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اللہ کا وجود کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اگرچہ ہم اس کا مکمل احاطہ نہیں کرسکتے البتہ وہ لوگ جو تزکیہ نفس اور تطہیر ذات کے عمل میں مصروف ہوتے ہیں اس تصور کا ادراک کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوجاتے ہیں۔

چونکہ عام آدمی کی بصیرت اس اعلیٰ اور ارفع معیار کی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایمان کی ان منازل پر نہیں پہنچ پاتا جو کہ اللہ کی وحدانیت جاننے کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور اسے عقلی دلائل کی ضرورت پیش آتی ہے جیسا کہ برطانوی فلسفی برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے اپنی کتاب ''میں عیسائی کیوں نہیں ہوں'' (Why i am not a Christion) میں اس ضمن میں بحث ومباحثہ کیا ہے۔

Marfat.com

لیکن کچھ مسلم فلسفیوں نے ارسطو اور فارابی کی طرح عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ کونیاتی دلائل پیش کرتے ہوئے مسکویہ کہتا ہے کہ طبی حرکت کو ہستی باری تعالیٰ کے شعور میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ تمام مادی اشیاء حرکت پذیر ہیں اور ارتقائی مراحل طے کر رہی ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک محرک موجود ہو جو انہیں حرکت میں لاتا ہو اور اس طرح ہستی خداوند کو ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل پیش کرسکتے ہیں۔

اگرچہ اس کے مضمرات بہت دقیق اور پیچیدہ ہیں جنہیں اس جگہ سمونا مشکل ہے۔ بہر حال ان کی تفصیلی گفتگو کے لیے ذیل کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مسئلے کو آسان کرنے کے لیے کچھ مسلم مفکرین نے کچھ ایسے طریقے وضع کیے ہیں جنہیں اپنا کر ہستی باری تعالیٰ کا ادراک ہوسکتا ہے۔ ابن رشد نے اپنی کتاب ''الکشف عن مناہج الادلۃ'' میں ان طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن رشد کا خیال ہے کہ عقلی طریق کار جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کو جاننے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے درست ہے۔

لیکن ان کا عقلی استدلال قرآن کے طرز استدلال سے قدرے مختلف ہے اور بعض اوقات ان کے دلائل اتنے پیچیدہ اور دقیق ہوتے ہیں کہ ایک عام آدمی انہیں سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

اس لیے بعض مفکرین (حشویہ) نے یہ رویہ اختیار کیا کہ جو آنحضورؐ نے اس ضمن میں وضاحت کی ہے وہ درست ہے اور اس طرح انہوں نے احادیث سے ہستی باری تعالیٰ کے بارے میں وضاحت طلب کی جو کہ مقابلتاً صحیح عقیدہ اور قرآن کے بنیادی تصور کے مطابق تھی۔ اس لیے انہوں نے عقل و منطق پر اتنا انحصار نہیں کیا جتنا کہ دوسرے فلسفیوں نے کیا۔

ابن رشد نے ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور کہا کہ انہوں نے قرآنی آیات کو جو کہ عقل پر مبنی ہیں پس پشت ڈال دیا ہے ان آیات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

صوفیا نے کشف و وجدان کا راستہ اختیار کیا اور گھنٹوں ذکر خاص میں مستغرق رہنے کے بعد وہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے جو خاص الہامی کیفیت میں حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے متواتر برسوں مجاہدے کیے اور تزکیہ نفس اور طہارت ذات سے وہ صلاحیت پیدا کی جس سے وہ علم

ڈاکٹر عبدالخالق اور پروفیسر یوسف شیدائی ''مسلم فلسفہ'' ۱۹۴۔۱۹۲

Marfat.com

حاصل ہوتا ہے جو ذات الٰہی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

ابن رشد نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ طریقہ قابل احترام ہے لیکن ہر شخص اس کی صعوبتوں سے نہیں گزر سکتا۔ اور نہ ہی یہ اسلوب قرآن سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے۔

ابن رشد کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت میں دو قسم کے دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ فایتی اور کونیاتی جہاں تک فایتی استدلال کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ نظام کائنات ان وضع کیے ہوئے اصولوں کے مطابق چل رہا ہے جن کے ذریعے اس میں یگانگت، ہم آہنگی اور تناسب پایا جاتا ہے۔ اگر یہ خوبیاں اس میں نہ ہوں تو وہ اتنا عرصہ قائم نہیں رہ سکتا اور پیدا کرنے والے کی قدرت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر نظام کائنات اور فطرت انسانی کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرف اس قرآنی آیت میں یوں اشارہ کیا:

''سخر لکم مافی السموات والارض جمعیا منه''(۴۵:۱۲)

(جو کچھ زمین اور آسمانوں میں موجود ہے انسانوں کے لیے مسخر کر دیا ہے)

یہ خوبیاں حادثاتی یا اتفاقی نہیں بلکہ خالق مطلق نے انہیں ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی طرح انسان کی تخلیق بھی ان مقاصد کی مرہون منت ہے جن کی تکمیل کے لیے یہ تمام کائنات پیدا کی گئی اور یہ تمام عوامل اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہستی باری تعالیٰ کا وجود ایک حقیقت ہے جسے عقلی طور پر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

''کونیاتی دلیل کائنات کو ایک معلول تصور کرتی ہے جس کے لیے ایک علت کا ہونا ناگزیر ہے۔ وہی علت ذات باری تعالیٰ ہے۔ جو خود کسی اور علت کی محتاج نہیں۔ بلکہ علت اول یا علت العلل ہے۔ یہ دلیل بھی قرآن سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بار بار بدیع السمٰوٰت اور خالق الارض اور باری کے ناموں سے پکارا گیا ہے۔

تاہم فارابی اور ابن سینا کی طرح ابن رشد اس بات کا قائل تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کائنات کی علت ہونا ایک عام علت کی مانند زمانی اعتبار سے اپنے معلول یعنی کائنات پر مقدم ہونا نہیں بلکہ محض منطقی اعتبار

Marfat.com

سے مقدم ہونا ہے اللہ کی حیثیت منطقی طور پر بنیادی ہے اور کائنات کی ثانوی۔

ابن رشد کی رائے تھی کہ ایک انسان خواہ ذہنی استعداد کی کسی بھی سطح سے تعلق رکھتا ہو ان دلائل کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

ابن رشد نے توحید باری پر بہت زور دیا اس کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف کر دے گا لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

قرآن نے بھی ایک مقام پر توحید کو فطرت کے حوالے سے ثابت کیا ہے۔ قرآن (سورۃ ۲۲:۲۱)

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝

(اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین اور آسمان درہم برہم ہو جاتے)

ابن رشد کے مطابق توحید کے علاوہ اللہ کی صفات اولیہ ہیں۔ علم حیات، قدرت، ارادا، سمع، مبصر اور کلام۔

اسکا خیال تھا کہ عوام الناس کو مزید بحث میں الجھنا نہیں چاہیے اور انہیں عام لغوی معنی پر اکتفا کرنا چاہیے عقل تعبیر کا حق صرف فلاسفہ کو حاصل ہے۔

جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس نے اسے انسانی فلاح و بہبود کے لیے ضروری قرار دیا۔"

ہستی باری تعالیٰ کے بارے میں ہر قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں لیکن ہماری کوشش ہے کہ ہم ان پہلوؤں کو زیر بحث لائیں جن سے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کی توثیق ہو۔ کفر اور شرک آدمی کو اس دھانے پر لے جاتے ہیں جہاں سے واپسی بہت مشکل ہوتی ہے اور مایوسی اور قنوطیت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

چونکہ ہمارا موضوع قرآن اور اس کی تعلیمات ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ توحید کو اس نقطہ نظر سے پرکھا جائے۔ ہستی باری تعالیٰ اور توحید کے بارے میں صحیح تصور (جسے ہم قرآن سے اخذ کرتے ہیں) اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے ہمیں ایک بہتر زندگی گزارنے اور ایک خوبصورت عدل و

Marfat.com

انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

اگر قرآن اور دیگر الہامی کتب ہمارے لیے ہدایت کی راہ متعین نہ کرتیں تو ہم آج انسانیت کی اس معراج پر نہ ہوتے جو تہذیب وتمدن کی صورت میں آج ہمیں حاصل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح کائنات کو ایک اعلیٰ پیمانے پر پیدا کیا اسی طرح انسان کو بھی ایک خوبصورت طریق پر تخلیق کیا۔

(دیکھیے قرآن: ۹۵:۴)

الغرض انسان اور انسان کی تخلیق ایک ایسا کارنامہ ہے جو باری تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی ہستی وجود میں نہیں لاسکتی۔ ہدائتی پیچیدہ تخلیق ہے کہ جس کا ہر جزو کمال وتکمیل کی اعلیٰ مثال ہے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے اس کو بے ہنگم اور جانور مطلق نہیں بنایا۔ بلکہ عقل ذہن اور دیگر صلاحیتوں سے نوازا۔ تاکہ انسان وہ اعلیٰ معیار حاصل کر سکے جس کے لیے کہ اس کی تخلیق وجود میں آئی اسے خلیفہ الارض بنا کر بھیجا اور ساتھ ہی اسے دستور حیات دیا تاکہ وہ بھٹکنے نہ پائے اور رشد وہدایت کی روشنی میں خوبصورت اور کامیاب زندگی بسر کر سکے۔ پہلی قوموں کے لیے بہت سے پیغمبر آئے اور الہامی کتابیں نازل کیں۔ انکا نچوڑ قرآن مجید میں دیا اور آنحضورؐ کو اپنا آخری پیغمبر بنا کر بہترین خوبیوں سے نوازا تاکہ وہ انسانیت کے لیے روشنی اور فلاح وبہبود کے راستے ہموار کر سکیں۔ اس سے انسانی فطرت کی تکمیل ایک اعلیٰ پیمانے پر کرنا مقصود تھا۔

قرآن مجید میں یہ خوبی پیدا کی گئی کہ وہ ہر قوم کے لیے ہر زمانے میں رہنمائی اور روشنی مہیا کر سکے اس کے ذریعے ایک لائحہ عمل دیا گیا تاکہ صحیح طور طریقے اپنائے جاسکیں۔ ربوبیت میں رحمانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی (رحمٰن اور رحیم) اس لیے قرآن کے ذریعہ انسان کی تعلیم وتربیت کی گئی۔

الرحمٰن علم القرآن (۵۵:۲)

وہ رحمان ہے جس نے قرآن سکھایا۔

(مسلم فلسفہ۔ عبدالخالق۔ صفحہ ۲۶۳۔ ۲۶۲)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو تین خصوصیات سے نوازا ہے۔

۱۔ علم وعقل عطا کی اور ذہنی، جسمانی مادی اور روحانی صلاحیتوں سے نوازا تاکہ انسان برابر اپنی اصلاح کرتا رہے اور ارتقا کے مراحل کامیابی سے طے کرتا رہے۔ جن قوموں نے ان صلاحیتوں سے استفادہ کیا وہ چاند اور ستاروں پر پہنچ گئیں اور جو ان سے غافل رہیں وہ پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستی گئیں۔

یہاں بنیادی اصول اور صلاحیتیں کارفرما تھیں اور مسلمان اور کافر کا امتیاز نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین کے طور پر اپنی حکمت اور ربوبیت کا اظہار کرتا ہے اور یہ تصور غلط ہے کہ وہ کسی خاص قوم یا طبقے کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔

۲۔ حُب جمال۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو ایک اچھے پیمانے پر پیدا کیا اس لیے اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا کیں جن سے وہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔ اور وہ زندگی کو خوبصورت رنگوں سے دلکش بناتا جائے۔ زندگی کا یہ تصور کہ اسے بوسیدہ کپڑے پہن کر اور گندے ماحول میں دقیانوسی انداز سے گزارا جائے نہایت فرسودہ اور قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن/ستاروں پہ کمند ڈالنے کا سبق دیتا ہے اور یہ کمند غاروں میں رہ کر تعلیم وتدریس سے بے بہرہ ہو کر اور پسماندگی کی صورت میں نہیں ڈالی جاسکتی۔

خوبصورت زندگی کا تصور دینی اور دنیاوی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ تصور کہ ہمیں آخرت کے لیے یہاں کے مثبت اور خوبصورت پہلوؤں کو نظرانداز کر دینا چاہیے درست نہیں ہے۔

۳۔ خدمت کا جذبہ اور انسانیت کے لیے فلاح و بہبود کی راہیں متعین کرنا بھی ایک باشعور انسان کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہے۔

قرآن کہتا ہے

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۝ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

Marfat.com

سورۃ الماعون (۷-۱:۱۰۷) میں خیرات اور حسن اخلاق پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور جو لوگ ان خوبیوں کو نہیں اپناتے اور نماز محض دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں ان کی نمازیں بیکار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے اعمال قبولیت نہیں حاصل کرتے۔

مزید برآں قرآن مجید اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عالمی ربوبیت کا تصور قرآن کی سورۃ (۶:۱۰۳) سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سوچ تمام عالموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جسے انسان اپنی محدود عقل اور بصیرت سے نہیں سمجھ سکتا ایک اور آیت (۲:۲۵۵) میں قرآن فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم آسمانوں اور زمینوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے وہ اپنے علم اور دانش میں لامحدود ہے اور ہم انسانوں کی طرح تنگ نظر اور متعصب نہیں ہے۔ کاش ہم ان خوبیوں کا ایک ذرہ بھی اپنی ذات میں پیدا کر سکتے۔

وہ کسی خاص طبقہ یا مذہب کا رب نہیں بلکہ دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کا رب ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن ایک ایسا بین الاقوامی آئین اور ضابطہ حیات دینا چاہتا ہے جو سائنس اور فلسفہ سے ماورا ہو اور تمام ادوار میں تمام عالمین کے لیے برابر اہمیت کا حامل ہو۔ اس کی افادیت اور مقبولیت تب ہی قائم ہو سکتی ہے جبکہ اس کا دائرہ عمل طبقاتی اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو۔

اس لیے یہاں یہ نکتہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ کسی مذہب یا طبقے کو یہ اجارہ داری حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی ربوبیت کو خود تک محدود کر دے۔

قرآن کی بین الاقوامی حیثیت اسی وقت منوائی جا سکتی ہے جبکہ اسے ایک عالمی کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے اور اس کی اقدار اور قوانین عالمی سطح پر لاگو ہو سکیں۔

تربیت کا نظام جو قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ ہمہ گیر اور تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ رب العالمین کی حیثیت سے جو ربوبیت ابھرتی ہے وہ یہ تقاضا کرتی ہے کہ تمام انسانوں کو اپنی آغوش میں لے اور ان کے لیے باعث ہدایت اور رحمت ہو۔

یہ ایک ایسا بین الاقوامی دستور ہے جو قرآن ہمیں دیتا ہے۔ نہ صرف ہمیں ایک ضابطہ حیات

Marfat.com

دیتا ہے بلکہ ہمیں اپنے فرائض سے بھی آگاہ کرتا ہے اور ہم میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنے فرائض کو حیوانی سطح سے بلند ہو کر ادا کریں اور اقوام عالم کے لیے ذریعہ امن و سلامتی اور فلاح و بہبود بنیں۔ یہاں ہمیں یہ موقع بھی میسر آتا ہے کہ ہم عالمی امن کے لیے جدوجہد کر سکیں اور یہ تاثر ختم کر سکیں کہ مسلمان طبقاتی اور دقیانوسی حدود میں مقید ہیں۔ جنہوں نے ان کی سوچ وفکر اور اعمال پر قدغن لگا رکھی ہے۔ خصوصاً موجودہ دور میں جبکہ دہشت گردی عام ہے اور مسلمانوں کو اس کے لیے موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے یہ حقیقت عالمی سطح پر عیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کا درجہ بلند ہو سکے اور انہیں اقوام عالم میں وہ مقام حاصل ہو سکے جس کا قرآن ان کے لیے عندیہ دیتا ہے۔

مزید برآں رب العالمین ہونے کا تصور ہمیں وہ آفاقی سوچ عطا کرتا ہے جہاں ایک فلسفی کی سوچ نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ایک مغربی مفکر گلسن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو سمجھنے کے لیے ہمیں فلسفہ کی پیچیدگیوں سے نکل کر معرفت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ [1]

اور یہی بات مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں اس انداز میں کہی ہے۔

''کہ فلسفیانہ انداز فکر جو کہ مکمل طور پر عقل وخرد پر مبنی ہے ہمیں عقل کا غلام بنا دیتا ہے اور ہم اس سفر میں پیچھے رہ جاتے ہیں جو کہ ایک سچائی کا متلاشی اپنی عارفانہ کاوشوں سے باآسانی طے کر لیتا ہے:

بہرحال عقل کو بھی سوچ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ہم قرآن کے مطابق عقل اور الہام کے امتزاج سے ان منازل پر پہنچ سکتے ہیں جو ہمارا مقدر ہے۔ سچائی کی تلاش ایک لمبا سفر ہے اور اسے تمام ممکنہ ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کے ساتھ الہامی کلام کی روشنی میں طے کرنا مقصود ہے۔ [2]

انسانیت جیسا کہ ایک مفکر نے کہا ہے ایک ذمہ داری کا نام ہے اور اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہی انسانی جوہر ہے، ربوبیت کا ادراک اور انسانیت کا شعور انسانی ذمہ داریوں میں سے ایک اعلیٰ پایہ کی

۱۔ سینٹ آگسٹائن عیسائی فلسفہ۔ صفحہ 23

۲۔ جلال الدین رومی ''مثنوی''

Marfat.com

ذمہ داری ہے ایسی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے انسان انسانیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا ہے اور وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ بن جاتا ہے۔ اسے ذمہ داری کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جس (وقت) آدمی اپنی سوجھ بوجھ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور ہستی باری تعالیٰ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن صرف عقل ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نہیں سمجھا جا سکتا اس کے لیے ہمیں الہامی کلام قرآن مجید کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اسی قسم کے خیالات کا اعادہ مغربی مفکر کوپل سٹون نے اپنی کتاب ''فلسفہ کی تاریخ'' میں کیا ہے۔

قرآن کے ذریعہ ہی ہمیں اللہ تعالیٰ کی ہر آن بڑھتی ہوئی شان کا علم ہوتا ہے اور ہمارا ذہنی افق بلند ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے (۱۸۸:۳)

''حقیقت تو یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور روز و شب کے تغیر میں ایسی نشانیاں [۲] موجود ہیں جن سے ہستی باری تعالیٰ کی توثیق ہوتی ہے۔ لیکن یہ نشانیاں وہی لوگ دیکھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں جو بصیرت کے مالک ہوتے ہیں اور سوجھ بوجھ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کئی لوگ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور سوتے جاگتے ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ آپ نے یہ تمام چیزیں بیکار میں پیدا کیں۔'' (قرآن:۱۸۸:۳)

اس لیے یہ ضروری ہے کہ علم حاصل کیا جائے اور اس دنیا اور مابعد الطبیعات سے متعلقہ حقائق سے آگہی حاصل کی جائے۔ علم کا اصل منبع مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید ہے اور اسی کی تشریحات سے علم کا حصول ممکن ہے یہاں کچھ لادینی حلقے جو مذاہب اور الہامی کلام میں یقین نہیں رکھتے قرآن اور دیگر الہامی کتابوں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ آج کل جدید دور میں ہزاروں سال پرانے ذرائع کو کیسے اپنایا جائے۔ موجودہ دور میں جبکہ سائنس اپنے دریافت شدہ حقائق سائنٹیفک بنیادوں پر ثابت کرتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآنی وحی کو بنیادی ذریعہ علم مان لیا جائے۔

۱۔ فریڈرک کوپل سٹون (تاریخ فلسفہ)

۲۔ قرآن مجید ۸۸:۳

Marfat.com

لیکن اس کتاب میں ہم یہی حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قرآن نے ۱۴۰۰ سال پہلے جن حقائق کو بیان کیا وہ کسی مفروضے یا تخیل پر مبنی نہیں ہیں اور اس کی تصدیق جدید سائنس اپنی آزادانہ تحقیقات کے ذریعے کر رہا ہے۔

نیز بہت سے مفکرین جن میں ماضی اور جدید دور کے فلسفیوں اور سائنسدانوں کا بھی شمار ہوتا ہے اس حقیقت کو مانتے نظر آتے ہیں کہ جو قرآن نے ۱۴۰۰ سال پہلے کہا وہ درست تھا اور کسی سائنٹیفک دریافت سے اس کی تردید نہیں ہوسکی ہے۔

الہامی کلام کی تصدیق کرتے ہوئے امریکہ کا ایک مشہور سائنسدان کہتا ہے کہ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ کائنات ایک خالق کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نظام کائنات ایک ایسے ہی خالق کے قبضہ قدرت میں ہے اور اسی کے دیئے ہوئے قوانین کے تحت یہ تمام قوتیں اپنا جوہر دکھا رہی ہیں ان تمام عوامل کی محرک ایک ایسی قوت ہے جو ابدی ہے اور اپنی رحمتوں اور نعمتوں کا نزول اپنے وضع کیے ہوئے اصولوں کے تحت کرتی رہی ہے۔[۱]

قرآن مجید یہاں مفکرین حق کو علم ہی کی بنیاد پر چیلنج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ”کیا لوگ غور نہیں کرتے۔ کہ یہ زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ ہماری خلاقی کو نہیں مانتے۔“ (قرآن۔ ۳۰:۲۱) (النور ۴۵)

یہ وہ حقائق ہیں جنکا قرآن نے ۱۴۰۰ برس پہلے انکشاف اور جنکی جدید سائنس نے تصدیق کی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ تمام حقائق ایک ایسے نبی کے ذریعے دنیا کو دیئے گئے جو کہ کبھی کسی مدرسے یا تعلیمی درسگاہ میں نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس زمانے میں سائنس اور فلسفے کی ایسی درسگاہیں موجود تھیں جہاں تحقیق و دریافت کو نظام کائنات اور اس کے مضمرات کو جاننے کے لیے بروئے کار لانے کی سہولتیں موجود ہوتیں۔ اور نہ ہی وہاں ایسے سائنسدان اور اساتذہ موجود تھے جنہوں نے تحقیق و

۱۔ جان ویلر۔ برنسٹن یونیورسٹی۔ امریکہ

Marfat.com

دریافت کے میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہوتا۔

اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک اور مغربی سائنسدان کہتا ہے۔

''کہ ہم (تمام تحقیق و دریافت کے باوجود ابھی بھی سائنس کے ابتدائی دور میں ہیں۔ اور ہر آنے والے دن ایسے انکشافات ہوتے ہیں جو ہمیں خالق حقیقی کی ہستی کا معترف ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ ذہانت اور علم کا منبع ہے۔ اور جہاں سے تمام تخلیق جنم لیتی ہے۔

ہرنئی دریافت ہمیں ہستی باری تعالیٰ کے نزدیک ہونے میں مدد دیتی ہے''

وہ الہامی کلام میں اپنے یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سائنٹیفک اور زمینی حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت کا زندہ ثبوت ہیں اور یہ نشانیاں اس کے وجود کی گواہی دیتی ہیں۔'' [۱]

بہر حال ان نشانیوں کا احاطہ وہی نظر کرسکتی ہے جو بصیرت سے بھرپور ہو اور وہی دل اسے سما سکتا ہے جو نیکی اور سچائی سے آشنا ہو۔ جیسا کہ مولانا رومی نے کہا ہے۔

''اگرچہ چراغ تو مختلف ہیں لیکن روشنی ایک ہی ہے اس کا احاطہ کرنے کے لیے آدمی کو ان خوبیوں سے مزین ہونا پڑتا ہے جو دل و دماغ اور روح کو تڑپا دیں اور سچائی کے اعلیٰ مراتب کو اپنے میں جذب کر لیں''۔ [۲]

۱۔ اے۔ جی۔ موریسن۔ ''سات وجوہ

۲۔ ریڈرز ڈائجسٹ۔ امریہ

۳۔ مولانا جلال الدین رومی۔ مثنوی

Marfat.com

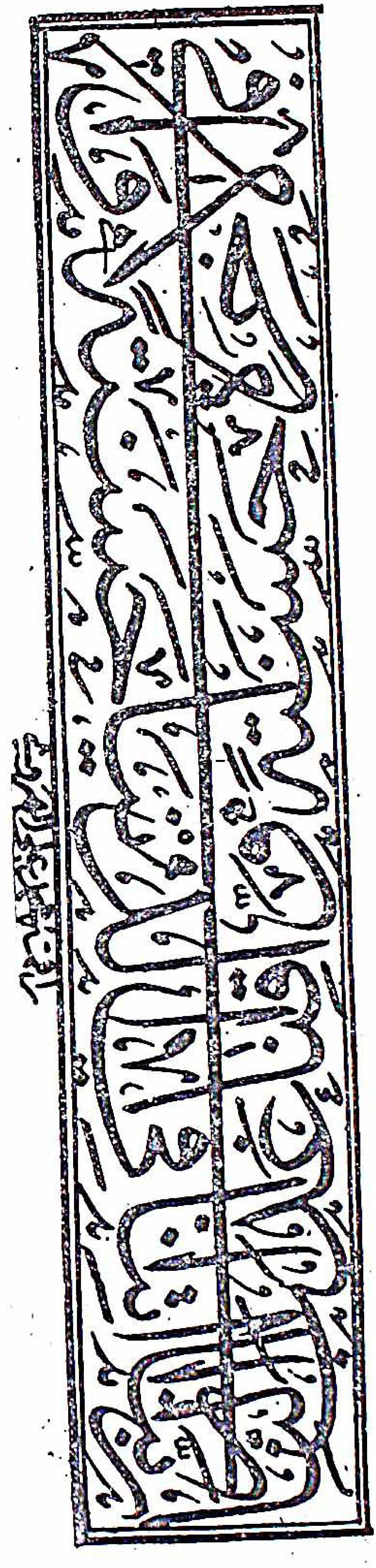

Marfat.com

Marfat.com

سائنس کی روشنی میں ﴿باب ۱۰﴾

قرآنی نظریہ کون ومکان

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ٥

(آیت ۳۴: ۱۰)

''تحقیق یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خالق ارض وسما ہے۔ اسی نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ۶ دنوں میں: پھر قرار پکڑا اوپر عرش کے۔

تحقیق اسی نے سب سے پہلے پیدائش کی ابتدائی اور وہی اس کو دوبارہ کرے گا۔ تاکہ جزا دے ان لوگوں کو جنہوں نے نیک اعمال کئے ساتھ انصاف کے اور جو کافر ہوئے ان کے لیے سخت عذاب (گرم پانی کا پینا) ہے۔''

تخلیق کائنات، زمین وآسمان کی پیدائش اور خود انسان کا اپنا وجود اللہ تعالیٰ کا اس عظیم خلاقی کی عکاسی کرتا ہے جو ہمیں اپنے گردوپیش میں نظر آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت ہے جس سے ان عظیم

قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے جو انسان کی عقل کو میجر کر دیتی ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ قرآن بار باران زمینی اور آفاقی حقائق کی مختلف انداز میں نشاندہی کرتا ہے تاکہ آدمی اپنی عقل وخرد اور حسی اور نفسی صلاحیتوں کے ذریعہ قدرت کی تخلیقی کاوشوں کا کچھ اندازہ کرتا رہے۔اس نظام کائنات کا مکمل احاطہ کرنا تو تقریباً ناممکن ہے کیونکہ سائنس کی اپنی تحقیقات اور دریافتوں کے باوجود ہزاروں لاکھوں سیارے انسانی نظر سے پوشیدہ ہیں۔

موجودہ دور میں کئی سائنسدانوں نے ان رموز کو پانے کی کوشش کی ہے لیکن اپنی تمام تحقیقات کے باوجود وہ اس نظام کائنات کے ایک بہت معمولی جزو تک ہی پہنچ سکے ہیں۔

ان میں مشہور نام کاپرنیکس (Copernicus) کیپلر (Keplor) اور نیوٹن (Newton) کے ہیں۔جنہوں نے اس میدان میں عرق ریزی کی ہے اور کچھ معلومات حاصل کی ہیں جو نظام کائنات سے کچھ پردہ ہٹانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔انہوں نے چاند اور سورج زمین اور ستاروں کی گردش کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں جو ہمارے الہامی علم کو مزید مستحکم کرتی ہیں۔

ان تحقیقات کے نتیجہ میں سائنسدان اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ نظام قدرت بغیر کسی خالق حقیقی کے وجود میں نہیں آسکتا تھا چونکہ یہ نظام ایک ضابطے اور اصولوں کے مطابق چل رہا ہے اس لیے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو قائم کرنے والا ایک خالق حقیقی ہے اس نے نہ صرف اس نظام کو قائم کیا ہے بلکہ اس کو ایک مربوط صورت میں باقاعدہ کام کرنے کے قابل بھی بنایا ہے۔

ایک امریکی جریدے (Nature) کے مطابق سائنسدانوں کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا ایک خالق ضرور موجود ہے جس نے یہ نظام پیدا کیا اور اسے چلا رہا ہے۔

رابرٹ رسل (Robert Russell) جو کہ برکلے۔یونیورسٹی،امریکہ میں سائنسدان کے طور پر کام کر چکے ہیں اور اب ایک مذہبی مفکر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ ''لادینی حلقوں کا ہستی باری تعالی سے انکار حقائق کے منافی ہے۔اس کے برعکس اب ایسے ٹھوس شواہد موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرتے ہیں اور مذہبی سوچ سے مطابقت رکھتے ہیں۔[1]

زمان ومکان کیضمن میں گفتگو کو بڑھاتے ہوئے رابرٹ رسل کہتے ہیں کہ زمان

Marfat.com

(Time) ومکان (Space) کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے اور تخلیق کی مختلف صورتوں کو انسے تعبیر کیا جا سکتا ہے مکان تخلیق الحق ہے اور اللہ تعالیٰ کا تخلیقی سلسلہ ایک مسلسل ارتقائی کیفیت میں پایا جاتا ہے اور یہ لامتناہی ہے اس لیے نظام کائنات وقت کے ساتھ وجود میں آیا یہ برطانوی

ا۔امریکی رسالہ (Nature) جلد ۳۸۶۔صفحہ ۴۳۵

سائنسدان ہاکنگ (Hawking) کے اس نظریہ کی نفی کرتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو تخلیقی عمل سے بے دخل کرتا ہے۔ [1]

رابرٹ رسل جو امریکہ کی بارکلے سینٹر برائے مذہبی امور معاشرتی علوم میں پروفیسر ہیں اور نظام کائنات تحقیق کرتے ہیں اپنی رپورٹ میں کہتے ہیں کہ ہستی باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا اور وہ زمان ومکان کی قیود سے بالاتر ہے۔

رابرٹ رسل کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ ایک سائنسدان کسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہستی پر غور وفکر کر کے صحیح نتائج اخذ کرسکتا ہے۔

نظام کائنات کے بارے میں اسلامی اور عیسائی موقف میں کچھ فرق ہے جس کا ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا۔عیسائیت کے نزدیک تخلیق ایک ''تنہا اور بہت قدیم'' عمل ہے اسلامی نقطہ نظر اسے ایک جاری وساری سلسلہ تصور کرتا ہے یہ سلسلہ متواتر ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے اور انسانی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے تکمیل کی جانب رواں دواں ہے۔

قرآن حکیم فرماتا ہے۔

''یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے نظام کائنات کا آغاز کیا اور اس کا اعادہ کر رہا ہے۔'' (قرآن: ۴۔۱۰)

اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے اور اس کی مختلف کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور اس دنیا سے ماورا آخرت تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس لیے قرآن حکیم جہاں ماضی اور حال کے بارے میں اطلاعات دیتا ہے وہاں ہمیں مستقبل

Marfat.com

میں بھی جھانکنے کے قابل بناتا ہے اس لیے قرآن کا فکرونظر ماضی ۔حال اور مستقبل پر محیط ہے اور نظام

۱۔رابرٹ رسل ۔بار کلے سینٹر برائے مذہبی امور

۲۔جیمز ہاکنگز۔کیمبرج یونیورسٹی ''نظام کائنات''

کائنات بھی اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ وہ ان تمام زمانوں کے مطابق بڑھتا پھولتا چلا جائے اس کائنات کے بے شمار اور بے قیاس سلسلے ہیں جن کا اثر انسانی زندگی پر براہ راست یا بالواسطہ پڑتا ہے عالم کائنات وحیات میں ہر آن تغیرات رونما ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جو بصیرت افروز نظر بینا رکھتا ہو۔اگر انسان ان تغیرات کی گہرائیوں میں اچھی طرح جھانک لے تو وہ اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور اس منزل پر پہنچ سکتا ہے جو اس کا مقصود ہوتی ہے۔

ان کڑیوں کا ذکر قرآن مجید نے کئی جگہوں پر کیا ہے سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا کہ کائنات کی وسعت اور اس کا پھیلاؤ بے شمار ہے اور اسکا اندازہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

''اور آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے پیدا کیا اور بلاشبہ ہم ہی اس میں وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔''

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کائنات وسعت پذیر اور ارتقائی منازل سے ہمکنار ہے مشہور عالمی سائنسدان آئن سٹائن (Einstein) اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات کی وسعت میں اربوں گیس کے بادل (NEBULAR) سماسکتے ہیں۔جبکہ ہر بادل کروڑ ہا نجوم پر مشتمل ہے۔

اس حقیقت کے شواہد ان تجربات سے ملتے ہیں جو علم الافلاک کے ماہرین نے اپنی تحقیقات کے دوران کیئے۔انہوں نے ایسی علامات دیکھی ہیں جو گیس کے بالوں کو خلا میں منظّم حرکات میں منتقل کرتی ہیں۔انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمام گیس کے بادل خلا (Outer space) میں جزائر کو فیہ (Cosmissues) میں یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہمارے مجموعہ شمیسہ سے دور

ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے بھی دور ہیں اور اسی وجہ سے عالم کون (Cosmology
(Universe) میں سکوت نہیں بلکہ وہ تغیر پذیر ہے بلکہ وہ اسطرح پھیل رہا ہے جیسا کہ صابن کے بلبلے یا ربڑ کے غبارے لیکن وہ اپنے اندرونی اجسام کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ [1]

۱۔ آئن سٹائن: "دنیا اور آئن سٹائن"

اس ضمن میں مختلف ماہرین نے مختلف طریقوں سے ان حقائق کی تشریح کی ہے پروفیسر ہیبل (Hable) کا کہنا ہے کہ ایک خاص بات جو یہاں قابل غور ہے وہ ان چمکنے والے نجوم کے مجموعہ سے دوری (Distance) ہے جو آگے جانے کے مقابلے میں پیچھے آنے کی طرف زیادہ مائل ہے پھر اس کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ [1]

مزید برآں قرآن ایک اور آیت میں سورج، چاند اور دیگر سیاروں کی حرکات کا ذکر کرتا ہے۔

سورۃ یٰسین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (قرآن: ۳۶: ۴۰) "اور ان کے لیے ایک اور نشان سورج ہے جو اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے اور چاند اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی ہوئی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

سورج کا ایک معین سمت میں دوڑتے چلا جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس کی نشاندہی قرآن نے آج سے پندرہ سو برس پہلے کر دی تھی اور جس کی وضاحت سائنس آج کر رہا ہے دونوں (قرآن اور سائنس) کی تحقیق و دریافت میں کوئی تفاوت نہیں ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی تجربات اور مشاہدات الہامی معلومات سے مختلف نہیں ہیں اس لیے وہ لوگ جو صرف عقلی اور سائنسی دلائل پر ہی انحصار کرتے ہیں ان کے لیے قرآن کی تصریحات سے انحراف ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کہتا ہے کہ چاند اور سورج اپنے اپنے دائرہ فلکی میں تیر رہے ہیں سورج کی قوت جاذبہ کے تحت یہ مجموعہ شمسیہ چکر کاٹ رہا ہے جو اس کو سورج کے گرد مداروں یا بیضوی شکل میں گھما رہی ہے۔

Marfat.com

اور قرآن حکیم نے زمین کو گردش کی بھی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ ''ولا الیل سابق النھار'' (اور نہ رات، دن سے پہلے آسکتی ہے۔ بس زمین کی گردش اپنے محور پر ہی باقاعدگی سے رات کو دن میں منتقل کرتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورج، چاند اور زمین کی باقاعدہ گردش ایک ایسے نظام کی نشاندہی کرتی

ا۔ ڈاکٹر گاموٗ ''سورج'' (The Sun)

ہے جو ایک ضابطے کے تحت کام کر رہا ہے۔ پھر اس نظام کا جو گہرا تعلق انسان کی زندگی سے ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ نظام ایک علیم و حکیم خالق کے ارادہ سے قائم ہوا ہے اور وہی اسے اس مربوط اور منظم صورت میں چلا رہا ہے۔

نیز زمین کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر ہونا بھی اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ زمین پر انسان، حیوان اور نباتات کا وجود ایک احسن طریقہ سے قائم ہے اور نظام حیات ایک باقاعدہ قاعدے اور اصول کے مطابق چل رہا ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نظام کبھی کا تیتر بتر ہو جاتا ہے اور اس کرہ ارض پر خال خال زندگی کے نشانات نظر آتے اور اغلباً بالکل ہی دکھائی نہ دیتے۔ اس لیے یہ تسلسل اور باقادگی ایک ضابطے کے تحت عمل میں لائی گئی ہے جو اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے۔

ہم یہاں ان حقائق سے بحث کر رہے ہیں جن کی حقانیت سائنس نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ ثابت کر دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو جدید دور کا انسان قرآن اور اس کے مضمرات سے بالکل بے بہرہ ہوتا اور کبھی اس کلام کی طرف رخ نہ کرتا جہاں عقلی اور سائنسی سطح پر تضادات موجود ہوں۔

قرآن کی ایک اور آیت (النور: ۴۳) جس کے بارے میں سائنس ابھی ابتدائی تحقیقی مراحل میں ہے بادلوں اور ان کے تہہ تشکیل سے متعلق ہے یہ ان مراحل اور ان کی خصوصیات کی وضاحت کرتی ہے جن کی تہہ میں سائنس ابھی پہنچ نہیں سکا ہے۔ یہ بادلوں کی بناوٹ اور انکا اثر حال ہی میں دریافت ہوا ہے اور ابھی کئی تحقیقی مرحلوں سے گزرنا باقی ہے بادل کیونکر کشف ہوتے ہیں اور کس طرح اولے برساتے ہیں اور کیسے بارش ہوتی ہے ''سحب رکامیہ'' سے مراد جو صفت قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے اس

Marfat.com

کی تشریح سائنس کی تحقیقات کے ذریعہ ابھی ہونا باقی ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کا علم ہمیں اس مذکورہ آیت سے ہوتا ہے اور جن کا مطالعہ سائنس ابھی تحقیق کر رہا ہے۔ سائنسی تحقیقات اور ان کے نتائج کے ہم منتظر ہیں کہ وہ قرآن کی اس آیت کی کس طرح وضاحت کرتی ہیں۔

اسی طرح قرآن حکیم نے پہاڑوں پر اور زیادہ بلند مقامات پر دل کے تنگ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے مراد آکسیجن کی کمی بھی لی جاسکی ہے۔ پہاڑوں پر چڑھنے والا شخص تنگی تنفس محسوس کرتا ہے اور قرآن نے یہ حقیقت وہاں بیان کی یعنی سرزمین عرب میں جہاں بہت بلند پہاڑ نہیں ہیں۔

یہ قرآن کا علمی اعزاز ہے کہ اس نے آج سے ہزاروں سال پہلے ان حقائق سے پردہ اٹھایا جو آج سائنس کے موضوع تحقیق ہیں۔

(قرآن۔سورۃ الانعام۔آیت ۱۲۵)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذرہ (atoms) کا بھی ذکر کر دیا جو کہ آج جدید طبیعات کا (Physics) نہایت اہم موضوع ہے اور جس پر سینکڑوں سائنسدان دن رات کام کر رہے ہیں۔

سورۃ یونس آیت ٦١ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمانوں میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز اس سے بڑی۔ مگر یہ سب کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہے۔

اس آیت میں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ ذرات (atoms) صرف زمین پر ہی نہیں بلکہ سورج، سیاروں اور دیگر کواکب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

جدید بیالوجی کی ایک اور دریافت قرآن حکیم نے پہلے ہی کر دی ہے اور وہ حیوانات اور نباتات کی دنیا میں زوجیت کی صورت میں متعین کر دی گئی ہے اس ضمن میں قابل ذکر آیات یہ ہیں:

سورۃ الشعراء۔آیت نمبر ۷

سورۃ الشوریٰ۔آیت نمبر ۱۱

Marfat.com

سورۃ الذاریات۔ آیت نمبر ۴۹

اس کے علاوہ کئی اور قرآنی انکشافات جن کا گہرا تعلق سائنس سے ہے حسب ذیل ہیں۔

بجلی کا پیدا ہونا۔

اوپر دی ہوئی آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی دشوار نہیں ہے کہ موجودہ دور میں بجلی کی ٹیکنالوجی ان منفی اور مثبت خواص کی مرہون منت ہے جو ان دونوں کے اتصال سے بجلی کا کرنٹ پیدا کرتی ہیں۔

موجودہ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ (atoms) میں بھی ایک چھوٹا سا دل ہوتا ہے جس کو نواۃ الذرہ یعنی ایٹم کا بیج اور بہت سے ہلکے پھلکے اجسام جن کو الیکٹرون کہا جاتا ہے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن جو اس کا قلب منفی (Nucleus) ہوتا ہے وہ مثبت اثرات کا حامل ہوتا ہے اور سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق نواہ الذرہ (Nucleus) بھی چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں دو بنیادی اکائیاں ہوتی ہیں جن سے ایک ہائیڈروجن کے ذرہ کا بیج (atom) جو پروٹون کہلاتا ہے اور دوسرے کو نیوٹرون کا نام دیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں یہ بتا دیا ہے کہ زمین کس طرح حرکت میں آتی ہے ''جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ یکا یک حرکت میں آ گئی اور پھول گئی اور ہر قسم کے خوش مناظر۔ نباتات پیدا کرنے لگی۔''

(قرآن: سورۃ الحج: آیت ۵)

اور ساتھ ہی کائنات میں ایک توازن بھی قائم کر دیا گیا ہے تاکہ نظام متزلزل نہ ہونے پائے'' اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے موجود ہیں اور ہم اپنی خاص حکمت کے مطابق ہر چیز کو ایک معین مقدار میں اتارتے ہیں۔''

(قرآن: سورۃ الحج: آیت ۲۱)

اور پھر فرمایا!

''ہر چیز اللہ کے پاس ایک خاص اندازے سے ہے۔''

(قرآن۔ سورۃ الدعد۔ ۸)

الغرض تمام کائنات کون ومکاں اور ہر چیز ایک خاص اندازے کے مطابق اور ضابطے کے تحت پیدا کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے جو ایک خاص حساب کتاب کے مطابق کام کر رہا ہے۔

سورج کی روشنی! آسمان پانی۔ ہوا میں آکسیجن اور زمین پر نباتات سب اللہ تعالیٰ نے انسان کی نشوونما اور فلاح و بہبود کے لیے پیدا کر رکھی ہیں۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ تمام تخلیقات نظام حیات اور کائنات ایک علیم و حکیم رب العالمین کی سوچ بوجھ کا نتیجہ ہے۔ اور مشیت ایزدی ہی کی صفت ہے کہ ہر چیز ایک خاص ضابطے اور حساب کے مطابق عمل میں لائی گئی ہے۔

یہ تمام حقائق صرف مسلمانوں کو ہی متاثر نہیں کرنے بلکہ بہت سے مغربی مفکرین بھی یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اس تمام کائنات کا بغیر کسی خالق کے وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔

بروٹو گوادرڈونی (Bruw Guiderdoni) جو پیرس یونیورسٹی میں شعبہ تحقیق سے منسلک ہیں اپنے ایک مقالے میں کہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ تخلیق جدید سائنٹیفک تحقیق کے عین مطابق ہے اور اس ئیں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا۔" [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد جو ہندوستان کے اعلیٰ پایہ کے مفکر ہوئے ہیں اور جو قرآن حکیم پر گہری نظر رکھتے تھے کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کو سمجھنے کا اہم ذریعہ قرآن مجید ہے۔"

قرآن کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ کی خصوصیات جو ربوبیت اور رحمت میں آشکارا ہوتی ہیں قرآن کیذریعہ ہی معلوم ہوتی ہیں قرآن کی آیات تخلیقی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے وہ تمام صفات بھی ہمارے علم میں لاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ صفات ہم سے پوشیدہ رہیں تو ہم کبھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار نہ ہوتے۔

پروفیس بروٹو گوڈرانی

جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

"جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم رحمت کے سزاوار قرار پاؤ۔"

Marfat.com

(قرآن۔ سورۃ الاعراف۔۲۰۴)

اس لیے قرآن تمام انسانیت کے لیے باعث علم وہدایت ہے لیکن اس کا خطاب خصوصاً ان لوگوں کے لیے زیادہ باعث توجہ ہے جو عقل اور شعور کو بروئے کار لاتے ہیں اور سوجھ بوجھ کے دہانے اس جانب

۱۔ پروفیسر بروٹو گوڈریانی پیرس یونیورسٹی

مبذول کرتے ہیں جہاں سے انہیں علم اور روشنی کے سرچشمے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہ صرف کہتا ہے کہ ''ہو جاؤ اور وہ ہو جاتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے اور پلک جھپکتے ہی اس پر عمل ہو جاتا ہے (قرآن۔۵۰:۵۴)

ایک اور مغربی مفکر کہتا ہے کہ ''قرآن کریم ایک بہت عظیم کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کائنات اور نشانیاں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں لیکن اس کا حسن اور خوبصورتی انہی لوگوں پر عیاں ہوتی ہے جو عقلی اور قلبی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور نظر و فکر اور بصیرت و حکمت کے متلاشی ہوتے ہیں۔

اس تمام منظر کشی کا مقصد جو قرآن مجید ایک خوبصورت انداز میں پھولوں کی مہک سے لدی آیات میں جگہ بجگہ کرتا ہے تاکہ ایک خالق حقیقی کی ہستی سے آشنائی پیدا ہو اور اس کی خصوصیات کو سمجھا اور پرکھا جائے۔ مزید برآں ان سے لطف اندوز ہوا جائے۔ یہی لذت زندگی ہے اور یہی حسن الماب ہے۔ ان لذتوں سے خاطر خواہ لطف اندوز ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو عقل و خرد عطا کی وہاں حسی، نفسیاتی اور جمالیاتی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور کیا تاکہ اللہ کا حسن اور محبت انسان سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ انسان کو ایک اعلیٰ اور عمدہ صورت میں پیدا کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

(قرآن۔ سورۃ الوطین ۷۔۱)

کیونکہ خوبصورت آدمی ہی جمالیاتی حسن کا مالک ہوتا ہے اور خوبصورت چیزوں کو سراہتا ہے اور وہی ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ایک ہیرے کی قدر جوہری ہی کر سکتا ہے ورنہ جاہل کمہار کے لیے تو وہ گدھے کے گلے میں ڈالنے والا پتھر ہوتا ہے۔

اجرام فلکی اور ان کے حسین و جمیل مناظر ہمیشہ انسان کی دلچسپی کا باعث بنے رہے ہیں اور جوں

جوں انسان کی عقل وشعور میں اضافہ ہوا اس نے ان تک پہنچے اور ان کے خزینے دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس سے سائنس اور تحقیق کے میدان میں خصوصاً اس رجحان کو تقویت ملی کہ چاند، ستاروں اور دیگر سیاروں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا جائے اور اس علم کو انسانی فلاح و بہبود اور اللہ کی قربت کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

ان زمینی اور آفاقی مناظر کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے اور وہ انسانی زندگی اور ان عوامل سے تعلق رکھتا ہے جو اس کی بقا کے لیے ضروری ہیں ان تمام عناصر کا جائزہ لینے سے اور ان کا تجزیہ کرنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ کہ انسانی زندگی ان تمام عوامل کی کتنی مرہون منت ہے جو اس کی بقا اور ارتقاء کے لیے رب العالمین نے اپنی رحمت بے حساب سے پیدا کیے اور ان سے لطف واندوز ہونے کا موقع دیا۔ کیا اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر سورج کی شعائیں نہ ہوں۔ ہوا نہ ہو اور پانی نہ ہو تو انسان اپنی زندگی کیسے گزار سکے گا۔

نیز ہم پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر کار یہ تمام چیزیں کون پیدا کر رہا ہے اور یہ نظام کون چلا رہا ہے اس سے ان منکرین خدا سے بھی مذاکرات کرنے کا موقع ملتا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ تمام نظام اتفاقاً وجود میں آ گیا۔ ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہ سب کچھ اتفاقاً وجود میں آ گیا تو یہ نظم وضبط اور تسلسل وثبات اس میں کس طرح پیدا ہو گیا۔ آخر اتفاق تو اتفاق ہی ہوتا ہے اور اتفاقاً جو چیزیں وجود میں آتی ہے وہ حسن و جمال، صحت وتندرستی اور نظم وضبط کی حامل نہیں ہوتیں۔ نیز وہ کسی نہ کسی وقت اتفاقاً ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان میں تسلسل اور ثبات نہیں رہتا جو ایک باقاعدہ ارادتاً تخلیق کیے ہوئے شاہکار میں ہوتا ہے اتفاقاً معرض وجود میں آنے والی چیز کبھی جمال وکمال کی مظہر نہیں ہوتی جیسا کہ انسان خود اور اس کے گرد وپیش کائنات میں پائی جانے والی تخلیقات ہیں خواہ وہ زمین پر ہوں یا آسمان پر۔

ان تمام زمینی اور آفاقی مناظر کا مشاہدہ کرنے کے بعد اور قرآن حکیم کی آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں عبرت وحیرت کے علاوہ معرفت وحکمت اور علم وعرفان کے دریچے بھی کھلتے نظر آتے ہیں۔ اس مطالعہ اور مشاہدات کے بعد ہماری علمی وعقلی اور حسی وجمالیاتی حس بھی محرک ہوتی نظر آتی ہے۔

''نیز جمالیاتی ذوق میں قلمونی آفاقیت، لطافت اور نظافت بھی پیدا ہوتی ہے برف پوش پہاڑ ہوں یا سبزہ و اشجار سے مزین کوہ و کمر گل و لالہ اور برگ و بار سے آراستہ اشجار ہوں یا ان سے معمور باغ و زاغ، کشت و سبزہ زار سے آراستہ میدان ہوں یا مناظر ہوش ربائی، آئینہ دار وادیاں، سمندر کی موجزن وسعتیں ہوں، یا دریا کی روانی نظر افروز، اور آبشاروں کا سیل نقرئی، جنگل کی جلیل و تابناک، گنجلک وسعتیں ہوں، بالق و دق صحراؤں کا لامتناہی پہنائیاں، ان سب میں اہل ذوق نظر کے لیے جمال و جلال ہے اور ان کے جمالیاتی مشاہدے سے ان کی نظر میں ذوق دید جمال و جلال پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اس سے متعدد امراض قلب کو شفا بھی ہو سکتی ہے مثلاً کور ذوقی، غرور و تکبر، بے سمعی و بے بصری، کجی و زنگ آلودگی دل بخل و تنگ ظرفی۔

نیز اس سے ذات رنگ و جمال و جلال سے مزین بھی ہو سکتی ہے۔

الغرض یہ مشاہدہ ہمیں زمین و آفاق کے دریچوں کی سیر کراتا ہے جو حسن و جمال سے مزین ہوتے ہیں ان دریچوں کے ذریعہ ہمارے دل و دماغ میں ایک انقلابی شعور پیدا ہوتا ہے جو ہمارے حسّی، نفسی اور قلبی نظام کو مزید فعال و محرک بناتا ہے۔

ہماری روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اور ہماری عقل کو پاکیزگی بخشتا ہے۔ یہی ہمارے مطالعہ کا نچوڑ ہے اور یہی ہماری زندگی کا حُسن۔ اور ہمارا فلسفہ حیات۔

ا۔ ڈاکٹر قیصر احمد ناصر کی کتاب فلسفہ سے ماخوذ

Marfat.com

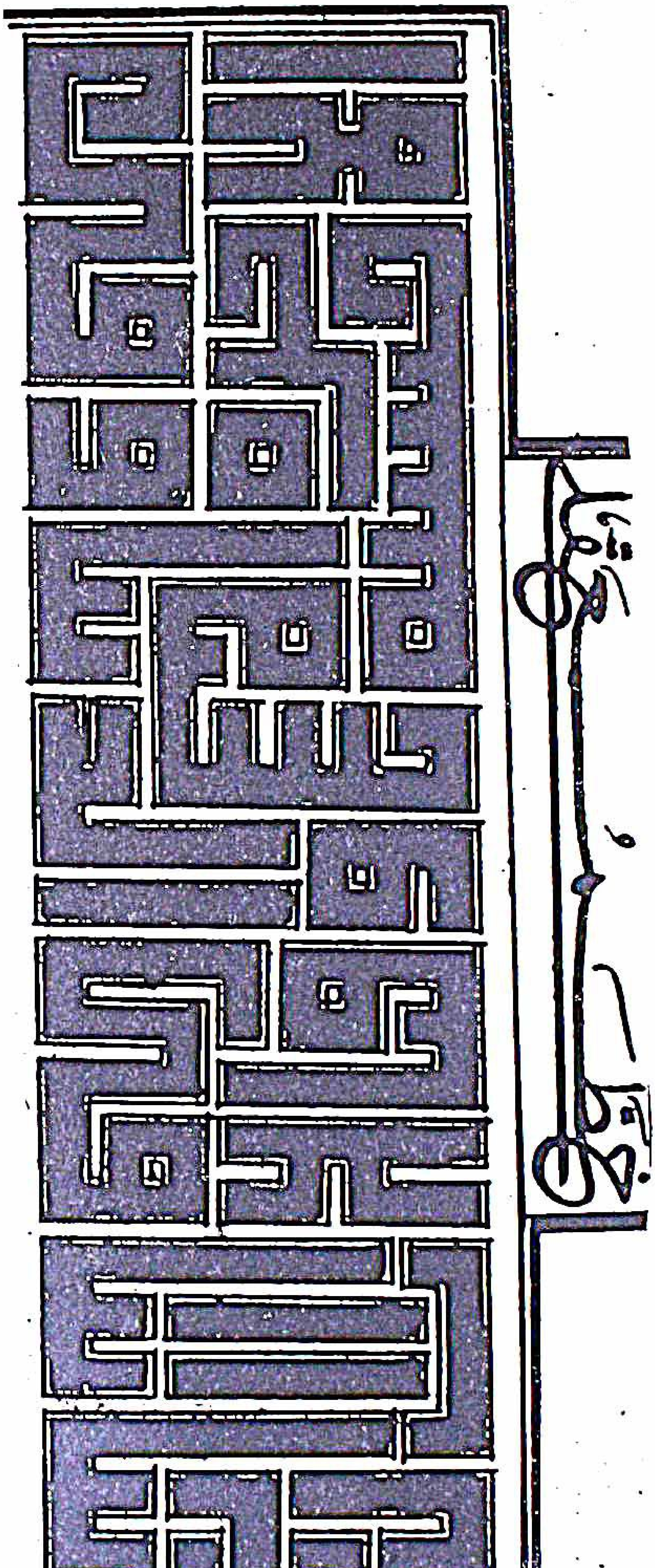

Marfat.com

Marfat.com

سائنس کے انکشافات اور قرآن ﴿باب ۱۱﴾

علم و حکمت: قرآن کا اصل سرمایہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ○

قرآن: ۲۱:۳۰

''کیا منکرین حق جنہوں نے نبی کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔غور نہیں کرتے کہ سب آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔کیا وہ ہماری اس خلاقی پر ایمان نہیں لاتے؟

قرآن کا یہ پیغام جس میں منکرین حق کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے نہ صرف اس دعوت کا انکار کرنے والوں کے لیے ایک چیلنج ہے بلکہ عقل و شعور اور مشاہدہ و تجربہ کے لیے بھی نئی راہیں متعین کرتا ہے۔قرآن کی یہ خوبی ہے کہ عقل سلیم کی وساطت سے وحی و متزیل کو ذریعہ نور و ہدایت بناتا ہے۔ [1]

عقل کو تفکر و تدبر کی آزادی دیتے ہوئے قرآن استدلال کے ضروری مواقع فراہم کرتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو منکرین حق یہ فتویٰ داغ دیتے کہ یہ کتاب تو تحقیق اور تنقید کے راستے میں رکاوٹ حائل کرتی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے مستفید ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

Marfat.com

۱۔ یہی مضمون سورہ النور: ۴۵ میں گزر چکا ہے۔سورۃ النحل۔حاشیہ نمبر ۱۲ (مودودی) تفہیم القرآن) (دیکھیے سورہ النور ۴۵: ۲۴)

نیز اسلوب اور انداز بیان کو بھی حالات اور واقعات کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے تا کہ قرآن کے بیانات کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ارشادات جنہیں تقریباً ۱۵۰۰ برس پہلے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا جدید دور میں سائنس کی تحقیقات سے متصادم نہیں ہیں بلکہ سائنس ان کی حقیقت کی توثیق کرتا ہے۔جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں پانی اور اس سے پیدا ہونے والے جانداروں کی اللہ تعالیٰ نے نشاندہی کی وہ آج جدید سائنٹیفک تحقیقات سے صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

قرآن کی یہ خوبی ہے کہ جہاں وہ وحی و تنزیل کی وساطت سے ذریعہ ہدایت بنتا ہے وہاں وہ عقل سلیم کے ذریعہ آدمی کو یہ آزادی بھی دیتا ہے کہ وہ اس کی حقانیت کو پرکھے اور دیکھے کہ جو قرآن کہہ رہا ہے وہ اس کے مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پورا بھی اترتا ہے کہ نہیں۔

علم وحکمت خواہ الہامی ہو یا عقلی بہر حال حقائق سے مطابقت رکھتی ہو تو تب ہی مقبولیت حاصل کرتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ مشرقین نے بعض ایسے نکتے اٹھائے ہیں جن سے قرآن کے اسلوب کو ٹھیس پہنچتی ہے۔مثال کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے قصص میں کچھ تکرار اور تضادات پائے جاتے ہیں۔

ایک مغربی مفکر (T.I.Rolinson) ٹی۔آئی۔روبنسن کہتا ہے کہ یہاں نہ صرف تکرار۔اضافہ اور اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ ایسے تضادات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں آسانی سے رفع کرنا آسان نہیں۔"

بہر حال یہاں ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے اور اپنے موقف پہ قائم ہیں کہ سطحی اختلافات کے باوجود (جنہیں سلجھانے کے لیے گہری نگاہ کی ضرورت ہے۔) قرآن کا اسلوب اور طرز بیان اپنی انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کا ایک جمالیاتی تشخص بھی ہے جو قدرت کے نظام کلی سے عبارت ہے۔اس کے جمالیاتی مضمرات کے باعث اس کے پڑھنے سے ایک خاص طمانیت حاصل ہوتی ہے۔اور حسن و

جمال کے رنگ جو کسی اور کتاب میں نہیں پائے جاتے۔

انسان خود ایک جمالیاتی حس لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے فطرت سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔آنحضورؐ نے فرمایا ہے کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے فطرت صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔اس لیے فطری طور پر ''مسلمان'' ہوتا ہے۔وہ خیر سے نزدیک اور شر سے دور ہوتا ہے۔وہ قدرت کی رعنائیوں کو سمجھنے اور سراہنے کا اہل ہوتا ہے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن عمر کے بڑھنے کے ساتھ ماحول کی آلودگی اور خواہشات کی قبح کاری اس نیکی کے جذبے کو دبا دیتی ہے اور وہ شیطانیت کے چنگل میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

فکر ونظر اور سوجھ بوجھ کے لیے بھی ضروری ہے کہ جمالیاتی حسن انسان میں بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ اسے اپنے یقین۔ایمان اور اعمال کو حسین (بہتر) بنانے ہیں بروئے کار لائے فکر ونظر کا عمل بالترتیب مقصود نہیں بلکہ اسے قدرت کی موشگافیوں اور ہستی باری تعالیٰ کو سمجھنے کے لیے استعمال میں لانا ضروری ہے اور اسی غرض سے قرآن حکیم میں بار بار ایسی آیات کا تذکرہ ہوتا ہے جو عقل ودانش اور بصیرت وحکمت پر مبنی ہوتی ہیں ان آیات کا مطالعہ موجودہ دور کی تحقیقات اور ایجادات کی روشنی میں بہت آسان اور مفید ہو جاتا ہے

آج سے پندرہ سو برس پہلے قرآن کی مندرجہ بالا آیت (۲۱:۳۰) کو سائنس کی روشنی میں ثابت کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ اس وقت سائنس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور ہمارے پاس ایسے شواہد موجود نہیں تھے جو پانی کی اہمیت کو زندگی کی بقا کے لیے ثابت کر سکتے۔لیکن موجودہ دور کے سائنسدانوں نے یہ بات مشاہدہ اور تجربے سے ثابت کر دی ہے اور اب اس آیت پر دینی اور لادینی دونوں حلقوں کا اتفاق ہے۔ان تحقیقات سے اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا ہے کہ ان پیمانوں کی تشریح کی جائے جو قرآن حکیم نے پیش کیے ہیں سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق اس کرۂ ارض پر ہی نہیں بلکہ دوسرے جہانوں میں بھی یہ امکان موجود ہے کہ پانی کے ذریعہ زندگی کا سلسلہ جاری رکھا گیا ہو۔

کولون (جرمنی) یونیورسٹی کے پروفیسر نین ہادور کا کہنا ہے کہ جدید تحقیق کے ذریعہ یہ امر عین ممکن ہے کہ دوسرے سیاروں میں بھی پانی کی وساطت سے زندگی کی رمق پائی جاتی ہو۔ ۱

Dr.Fritz Nenhauer, Coln University Germany-1

پانی کو زندگی کی بنیاد بنا کر قرآن نے ان مراحل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جہاں سے زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نین باوور۔کولون یونیورسٹی۔جرمنی

انسانی زندگی کو محض جسمانی خدوخال تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے جواس خمسہ سے بھی نوازا گیا اور بہت سی ایسی خوبیاں پیدا کی گئیں جو دوسرے جانداروں میں نہیں رکھی گئیں۔اس کے لیے ایک قلبی نفسی اور حسّی نظام وضع کیا گیا جو اس کے لیے راہ حق کا تعین کرتا ہے اسے ایک نفسیاتی اور جمالیاتی حس عطا کی گئی تا کہ وہ محض زندگی جانوروں کی طرح نہ گزارے بلکہ اس کے نفیس اور خوبصورت پہلوؤں کو بھی پہچانے اور ان سے لطف اندوز ہو۔ جمالیاتی حس کے لیے قرآن نے قرۃ العین یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک کی اصطلاح استعمال کی ہے۔اس سے مراد ہے کہ آدمی میں ایسی صلاحیت ودیعت کی گئی جس سے وہ سکون۔طمانیت اور روح پرور مسرتیں حاصل کر سکے۔

جمالیاتی تاثر حُسن کے لیے اخلاقی اقدار کا تعین کیا گیا تا کہ ان کے ذریعہ اس دنیا اور آخرت میں پرسکون اور سرور انگیز کیفیت پیدا ہو سکے۔اور انسان حقیقتاً جنت جیسا سکون دنیا میں پا سکے۔ جمالیاتی حس انسان کو وہ مقام عطا کرتی ہے جو بصورت دیگر ممکن نہ تھا۔

نفسی سطح پر مختلف خواہشات کے باوجود راہ حق دکھا دی گئی تا کہ آدمی بھٹک نہ جائے اور خواہشات کے دباؤ میں آ کر پراگندہ طور طریق نہ اپنا لے۔

اس سے مراد زندگی میں وہ خوبیاں پیدا کرنا تھا جو کہ حیات انسانی کا مقصود تھا۔

پانی چونکہ خود پاکیزگی کی علامت ہے اس لیے اس سے زندگی کی ابتدا بذات خود ایک بامقصد بنیاد تھی جسّی، نفسی اور قلبی نظام ایک پاکیزہ بامقصد زندگی گزارنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

علم۔عقل اور شعور سے زندگی کو وہ جلا بخشی گئی جو دوسرے جانداروں کے حصہ میں نہیں آتی۔ یہ نظام ایسے نظم و ضبط اور مربوط بنیادوں پر قائم ہے جو زندگی کی نشوونما اور فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہیں۔زندگی کے ان تمام مضمرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس اعلیٰ اور معیاری نظام کو پیدا کرنے والا کوئی

Marfat.com

خلاق بھی ہے جو اگر چہ ہماری جسمانی آنکھوں سے پوشیدہ ہے لیکن اپنے نظام حیات کے ذریعہ ہم پر آشکارہ ہے۔ علمی اور جمالیاتی مشاہدہ جس کا مشورہ قرآن نے ہمیں مندرجہ بالا آیت (۳۰:۲۱) میں دیا یہاں ہمیں مزید غور وفکر پر آمادہ کرتی ہے اور علم وفنون، حکمت و دانش کو بروئے کار لانے کے لیے ایسا مواد فراہم کرتی ہے جس سے ہستی باری تعالیٰ پر ایمان لے آئیں۔

جدید سائنس اس سلسلے میں ہماری خاصی مدد کرتا ہے چونکہ قرآن بذات خود ایک سائنس کی کتاب نہیں ہے اس لیے علمی تحقیقات کے ذریعے ہی ہم وہ نتائج اخذ کر سکتے جو ہماری کاوشوں کا مقصود ہیں۔ قرآن جگہ جگہ ہماری توجہ ان حقائق کی طرف مبذول کراتا ہے جو ہماری سائنٹیفک تحقیقات کا مقصود ہوتی ہیں۔ مثلاً آیات نمبر ۵۳:۲۰ اور ۱۱۔۱۰:۱۶ میں قرآن نباتاتی حیوانی اور انسانی زندگی کے مختلف مدارج کی نشاندہی کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح ابتدائے زندگی ہوئی اور کیونکہ اس کے لیے مناسب اور ضروری ماحول پیدا کیا گیا جو اس کے فروغ اور آفرنیش کے لیے مدومعاون ثابت ہوا۔

زندگی کی سب سے پرانی اور ابتدائی صورت نباتاتی دنیا میں پائی جاتی ہے یہ صورت ہمیں کروڑوں برس پہلے امیبا (Amoeba) کی شکل میں نظر آتی ہے۔

جو خلیے کی ایک جاندار (Monocelolar Organism) صورت ہے۔ اس خلیے کو بھی اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش اور حرکت کرنا پڑتی ہے۔ جس کا احساس اور شعور ہمیں جدید تحقیقات کے ذریعہ ہوتا ہے۔

لیکن محیّر العقل بات یہ ہے کہ قرآن نے ہماری توجہ اس طرف ۱۴۰۰ برس پہلے کرائی جبکہ سائنس اور اس سے متعلقہ مشاہدات اور تحقیقات کا وجود بھی نہیں تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے نہ ہوتی تو یہ علم بھی ہم تک نہ پہنچتا۔

آفاقی نظام کے متعلق بھی قرآن نے واضح اشارے دیے ہیں اور سورج، چاند، ستاروں اور کہکشاؤں کا نظام متعارف کرایا گیا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور خالق مطلق کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔

Marfat.com

تصورحیات

قرآن حکیم نے دینی اور دنیاوی حقائق کا اس خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے کہ وہ آسانی سے انسانی عقل وفہم میں آسکیں اور جن کے بارے میں زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کی گئی انہیں اشاروں اور کنائیوں سے بیان کردیا گیا ہے تاکہ آدمی خود اپنے علم کے ذریعہ گہری نگاہ سے مطالعہ کرسکے۔

ایک انداز استدلال جو آفاقی اور بنیادی حقائق کو قلب وذہن کی گہرائیوں میں سمونے کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ ''تذکیر بالاِءاللہ'' ہے۔ ''جس کے معنی ہیں کہ یہ کائنات جو ہمارے گردوپیش پھیلی ہوئی ہے۔ بخت واتفاق کی کارفرمانیوں یازمانہ ودہر کی کرتوتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک ذات گرامی کے فضل وکرم کی ارزائیاں ہیں جو ہشت وبود کے اس قافلہ ارتقا کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم کے نقطہ نظر سے اس عالم مادی کی تخلیق وآفرینش اور اس کی بقاء وارتقا کے سراسر حی وقیوم خدا کی مہربانی کا نتیجہ ہیں۔ جو حکیم وقدیر، رحیم ورحمٰن اور رب العٰلمین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں ایک متعین نظام اور خاص طرح کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس ذات بے ہمتا کے بارے میں قرآن حکیم کا موقف یہ ہے کہ اس کو منطق وفلسفہ کی سطح پر موضوع بحث مابالتزاع مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ بلکہ اس کا تعارف اس انداز سے ہو کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کا اعتراف پہلے سے نفس انسانی کی روح پر مرتسم ہے اور تاریخ کے ہر ہر دور میں اس کو کسی نہ کسی شکل میں مانا اور تسلیم کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کا موضوع یا غایت یہ نہیں کہ اس جانی بوجھی حقیقت کو اثبات کرے۔ اس کا موضوع اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلاغ کے ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے اس کی ذات کے بارے میں انسان زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرسکے۔ اور اس کی صفات گوناگوں کو تابہ حد استطاعت پہچان سکے تاکہ فرد ومعاشرے کو اس سے رشتہ وتعلق استوار کرنے میں آسانی ہو اور پھر اس علم کی روشنی میں انسان اپنے ٹھیک ٹھیک مقام اور فرائض سے واقفیت حاصل کرسکے۔

اور اس مقصد کے حصول کے لیے قرآن حکیم نے براہ راست انسان کے اس جذبہ سپاس وتشکر کو بیدار کیا ہے۔ جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے اور اس سے بجا طور پر یہ توقع وابستہ کی ہے کہ اس کے ذریعہ وہ

Marfat.com

اپنے گردو پیش پھیلی ہوئی نعمتوں پر غور کرے اور اس میں ذات حق اور اس کی جلوہ گری کا مشاہدہ کرے۔

قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس کی تخلیق کے ذریعہ انسان کے فہم وادراک میں ڈالنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں جہاں انسان کو خود اپنی تخلیق پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے وہاں اس زمین اور اس کے گردو پیش پھیلی ہوئی کائنات پر بھی تحقیق اور سوچ وفکر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ [1]

زمین اور آسمان کی تخلیق کو موضوع بحث بناتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے۔

''کہ زمین اور آسمانوں کو ہم نے اپنی قوت سے بنایا اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔ اور ہم کو اس پر قدرت حاصل ہے'' (الذاریت۔ ۴۷۔ ۴۸)

اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے

''فرش زمین کو ہم نے ہی پاؤں تلے بچھایا اور ہم کیا خوب زمین کو بچھانے والے ہیں۔ خدا ہی تو ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی برسایا اور پھر زمین سے کھانے کے لیے پھل پیدا کئے۔'' (سورۃ ابراہیم۔ ۳۲)

قرآن کریم تخلیقی پہلوؤں کی طرف ہماری توجہ مبذول کر کے ہمیں فلسفہ حُسن وحیات کو بھی سمجھنے کی دعوت دیتا ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ تخلیق کا مقصد محض کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ اس میں ایک حکمت پوشیدہ ہے جو ذہنی اور علمی صلاحیتیں بروئے کار لاکر ہی سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ تفکر وتدبر کرو۔ اس کے بغیر نہ قرآن کی عظمت اور نہ ہی تخلیق کا فلسفہ سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی جو قدرت کے شاہکاروں میں جمالیاتی پہلو میں آشکارہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقت جہاں اور جیسے حاصل ہو قلب وذہن میں سمو لینی چاہیے۔

پھر علم وحکمت اور حُسن وفلسفے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ حق وصداقت کی بات جہاں سے ملے لے لینی چاہیے۔ چونکہ تخلیق کائنات ایک ایسی حقیقت تھی جس کے مضمرات ہمیں بغیر کتب سماوی، وحی وتنزیل کے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس کو جلا، عقل وفکر، مشاہدہ اور تجربے کے ذریعہ حاصل ہوئی پھر ان عوامل نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم ان حقائق سے استفادہ حاصل کر سکیں اور سمندر کی گہرائیوں اور

۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی۔ مطالعہ قرآن ۲۶۴۔ ۲۶۳۔ صفحہ ۱

Marfat.com

آسمان کی بلندیوں کو چھو سکیں۔اور یہی علم ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کو جاننے کا سبب بنا۔

تخلیقی عمل کئی حصوں میں منقسم نظر آتا ہے قرآن حکیم اسے تین ضمروں میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ کائنات میں پھیلے ہوئے چاند، ستارے، کہکشائیں اور سیارے جن کا علم سائنس کی تمام ترقی کے باوجود ابھی انتہائی ابتدائی نوعیت کا ہے۔

۲۔ پھر زمین اور آسمان کے درمیان خلا میں پھیلی ہوئی کائنات جس کا بہت کم علم ہمیں ہمارے موجودہ سائنسی ذرائع سے مل سکا ہے۔اس لئے ہم مکمل طور پر اس حقیقت کا شعور حاصل نہیں کر سکے جس کی بدولت ہم قدرت کے شاہکاروں کو بدرجہ اتم سراہا سکیں اور ان سے مستفید ہو سکیں۔

اس کائنات کی وسعت و رفعت اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔(قرآن۔۶۔۲۰)

سائنس اور فلسفہ خواہ کتنی بھی قلابازیاں لگالیں لیکن اس تخلیق کا ایک بھرپور جائزہ لینے سے قاصر رہیں گے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سلسلے میں بھرپور کوشش نہ کی جائے۔کیونکہ یہ بھی غایت تخلیق ہے کہ اس کو جہاں تک ممکن ہو آشکارہ کیا جائے اور اسی طرح ہم خالق حقیقی کا ادراک کسی حد تک کر سکتے ہیں۔

اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں اس طرح آشکارہ کرتا ہے۔

''جلد ہی ہم انہیں ان زمینی اور آفاقی حقائق سے آگاہ کریں گے جو اب تک پوشیدہ ہیں اور بہت سے پہلو انسان کی اپنی ذات میں ایسے ہیں جن سے وہ متعارف نہیں اور انہیں جاننا ضروری ہے تا کہ یہ بات کھل جائے کہ قرآن واقعی برحق ہے۔

(قرآن ۶۳۔۳۹:۶۲)(قرآن ۴۱:۵۳)(اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز پر نگہبان ہے۔)

اس آیت کا مفہوم۔یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آفاق ارض و سما میں نشانیاں پیدا کی ہیں بہت سی تو پہلے ہی ظاہر ہو چکی ہیں اور کچھ ابھی ظاہر ہوں گی اور جوں جوں سائنس اور دوسرے علوم میں ترقی و ترویج ہوتی ہے تو ان نشانیوں کا کھل کر مظاہرہ ہوگا۔بہت سے سیارے۔کہکشاں اور چاند ستارے ابھی انسان کے علم میں نہیں ہیں اور آئندہ مستقبل میں سائنس کے علوم اور تحقیقات کے نتیجہ میں ایسے

Marfat.com

انکشافات متوقع ہیں جو علم و دانش اور فلاح و بہبود کی نئی راہیں متعین کریں گے۔

آئن سٹائن جو اس دور کا بہت بڑا سائنسدان گزرا ہے ان آفاقی وسعتوں اور رفعتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”میں جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہوں جب میں ایک ایسی عظیم طاقت کا مشاہدہ کرتا ہوں جو اس لامتناہی سلسلہ کائنات کا خالق ہے یہی میری اللہ کو سمجھنے کی بنیاد ہے۔ یہ نئے انکشافات نہ صرف انسان کے علم میں اضافہ کریں گی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وسعتوں اور رفعتوں کا احاطہ کرنے میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔

اس دنیا اور اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کائنات میں اتنی بے شمار تخلیقی نشانیاں ہیں کہ انسان اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود جو کہ ہزاروں سالوں پر ہی کیوں نہ محیط ہوں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں کہا ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی ہو جائیں اور تمام درخت قلمیں بن جائیں تب بھی اللہ کی نشانیوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہر دور میں ایسی نشانیاں انسان کے سامنے آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی ان نشانیوں پر غور و فکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ عقل و دانش اور علم و حکمت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ انسان بدلتے ہوئے افکار و نظریات کو ان نشانیوں کی روشنی میں ایک صحیح سمت دے سکے“۔ [۱]

یہاں اہل قلم حضرات پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نئی تحقیقات و دریافتوں کی روشنی میں ہستی باری تعالیٰ اور نظام کائنات کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اپنے ذرائع بروئے کار لائیں ان ذرائع میں سب سے موثر ذریعہ قلم اور کاغذ کا ہے۔

زمین اور آسمان کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ اور تقریباً یہی بات جرمن سائنسدان فان وائز سیکر کہتا ہے ”سائنس کے انکشافات ہمیں مذہب کے قریب لانے اور سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔“

اس کی قسم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اٹھائی ہے۔ اور آنحضورؐ نے بھی فرمایا ہے کہ اہل قلم کی روشنائی شہید کے خون سے بھی زیادہ پاکیزہ اور بلند مرتبہ ہے۔ ایک مفکر کا ایک گھنٹے کا غور و فکر ایک عابد کی

۱۔ آئی بنیٹ (I.Bennett) کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن، لندن

Marfat.com

۷۰ سالہ عبادت سے زیادہ اہم ہے۔

سیکولر دنیا میں بھی اہل قلم کا بہت بلند مقام ہے۔ اگر اہل قلم نہ ہوتے تو دنیا میں آنے والے انقلابات رونما نہ ہوتے فرانسیسی انقلاب۔ صنعتی انقلاب اور یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) مارکسزم اور فرائیڈ کے نفسیاتی تجزیات سب اہل قلم مفکرین کے مرہون منت ہیں۔

بہرکیف مندرجہ بالا آیتؑ (۴۱:۵۳) اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابھی اس دنیا اور اس کے گردوپیش کائنات میں بہت سی تخلیقی حقائق نے آشکارہ ہونا ہے جن سے ہمارے علم اور ذرائع ابلاغ کو مزید وسعت حاصل ہوگی۔

ان تمام حقائق کا علم اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ ہمارے ایمان اور یقین کو استحکام بخشتا ہے۔ ان آیات کا مفہوم اور ان کی علمی، ادبی اور سائینٹیفک تصریحات ہمارے شکوک کو رفع کرتی ہیں اور ہمیں قدرت کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ قرآن ایک اور جگہ فرماتا ہے" کہ اس کتاب (قرآنی۔ معلومات اور تصریحات) میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ ان تمام لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے جو سچائی اور تقویٰ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ (قرآن ۲:۲)

یہ علم انسان کے ذہنی، قلبی اور روحانی نظام میں ایک تبدیلی لاتا ہے اور اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نظام تخلیق بالحق ہے اور اس کا کوئی خالق و قیوم اور منتظم و مدبر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے جو تمہارا رب العلمین ہے۔

جہاں یہ علم ہمارے ایمان و یقین کو مستحکم کرتا ہے وہاں ہمارے قلب و نفس اور روح کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس سے تحقیق و دریافت کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جو ہمارے مشاہدات اور تجربات میں گوناگوں اضافہ کرتا ہے۔ علم و حکمت سائنس اور تکنیکی شاہراہوں پر چلنے کے قابل بناتا ہے۔ عقل سلیم کو بصیرت افروز بناتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو ہمیں قرآن مجید کی صورت میں ملا زندہ و جاوید حقائق پر مبنی ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ جو اس بحث میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقات خواہ کسی بھی نوعیت کی

Marfat.com

ہوں اور خواہ وہ کسی بھی دور میں وقوع پذیر ہوئی ہوں قرآنی حقائق اپنی جگہ مسلم ہیں۔ان کی حقانیت اٹل ہے اور سائنس کی تحقیقات انہیں کسی صورت جھٹلا نہیں سکتیں۔

قرآنی آیات سمندر کی ان گہرائیوں اور آسمان کی ان رفعتوں کا احاطہ کرتی ہیں جہاں سائنس اغلباً نہیں پہنچ سکتا۔

چاند۔ستاروں اور سورج کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ اپنے خاص انداز میں اپنے مخصوص مدار فلک میں گھوم رہے ہیں۔چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں۔یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے۔سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔(۴۰۔۳۸:۳۶ قرآن)

ان کے لیے ایک نشانی رات ہے ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں۔تو اس پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے۔یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔(۴۰۔۳۸:۳۶)

زمین کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ ”ان لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا۔ جسے یہ کھاتے ہیں۔ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کئے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔

یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے(۳۴:۳۶ قرآن)

اوپر کی آیات میں ایسے حقائق دیئے گئے ہیں جو ہزاروں برس گزرنے کے باوجود بھی اپنی اٹل بساط پر قائم ہیں۔اور ان کی گردش اور کیفیت میں کوئی تغیر بپا نہیں ہوتا۔

آدمی کبھی یہ غور نہیں کرتا کہ رات دن کیسے بدلتے ہیں اور چاند سورج کیسے گردش کرتے ہیں۔ان کے آنے اور گردش کرنے میں جو نظم وضبط اور باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ بغیر کسی ضابطہ کے ممکن نہیں ہے۔یہ تمام نظام اٹل کڑیوں میں جکڑا ہوا ہے اور کوئی کڑی ٹوٹنے نہیں پائی۔وگرنہ تمام نظام نیست و نابود ہو جاتا۔

یہ مربوط نظام اس امر کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی عظیم دانا اور مدبر کا ہاتھ کارفرما ہے۔

Marfat.com

''زمین ہر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، پانی، ہوا اور معدنیات کی فراوانی بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک نہایت سائینٹیفک طریقہ سے زمین کو سورج سے دور رکھا گیا ہے تا کہ ان عوامل کی آفرینش میں کمی نہ آنے پائے۔ اگر زمین آسمان اور سورج کے فاصلوں میں کمی بیشی ہوتی تو یہ نظام درہم برہم ہو جاتا اور انسان کی بقا اور ارتقا ممکن نہ ہوتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو دل و دماغ اور عقل سے نوازا تا کہ وہ ان حقائق کا صحیح طور سے ادراک کر سکے اور اللہ تعالیٰ کی ہستی کو اس کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ مان لے۔

اس لیے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام نظام ایک سوچے سمجھے منصوبے اور ضابطے کے تحت کام کر رہا ہے اور یہ کہنا (جیسا کہ بہت سے لادینی حلقے کہتے ہیں) کہ یہ ایک خود بخود وجود میں آیا ہوا نظام ہے عقل سے بعید ہے۔

کائنات میں نظم و ضبط اور مقصدیت کا ہونا اس بات کا عین ثبوت ہے کہ یہ ایک خالق حقیقی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد کسی اور عقلی یا منطقی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ان قرآنی آیات کا بنیادی مقصد فطرت سلیم کو اجاگر کرنا ہے تا کہ علم اور عمل میں مطابقت پیدا ہو سکے۔ اگرچہ ان فطری صلاحیتوں کا تعین انسان کی اپنی ذاتی استعداد سے بھی ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق سوجھ و بوجھ کے خزینوں سے استفادہ کرتا ہے اور اسی لحاظ سے انسان کی علمی اور عملی قوتوں کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔

جس انسان میں علمی اور عملی قوتیں بدرجہ اتم موجود ہوں وہ منبع علم سے براہ راست علم حاصل کرتا ہے اسے نبی کہتے ہیں۔ اس کے بعد صدیقین۔ صالحین۔ شہدا اور مفکرین کا شمار ہوتا ہے۔

دور جہالیہ میں نبیوں کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اور وہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے معلم کا رول ادا کرتے تھے اور تمام عمر اپنی کاوشیں علم کے پھیلانے اور عملی طور پر سوسائٹی کو بہتر بنانے کے لیے صرف کرتے تھے موجودہ دور میں عمرانی علوم کی بھرمار کے باوجود قرآنی یا الہامی علم کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جا رہی جتنی کہ اس کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ جدید معاشرے دینی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں اور آج بھی نبیوں کی

Marfat.com

اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ادوار جہالیہ میں تھی۔ لیکن چونکہ اب نبیوں اور پیغمبروں کی آمد بند ہو چکی ہے اس لیے مفکرین اور اہل قلم پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان علوم کی ترویج کے لیے کوشاں رہیں۔

قرآن حکیم نے علمی اور عملی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ایک اعلیٰ معیار کا شعور پیدا کیا ہے اور جن میں یہ شعور نہیں ہوتا انہیں مغضوب اور ضالین سے پکارا گیا ہے۔ کہا گیا ہے (قرآن: الفاتحہ: ۷) غیر المغضوب علیھم والضالین یعنی ایسے لوگ جو شعور سے عاری ہوتے ہیں وہ گمراہی اور تنزل پذیر ہو جاتے ہیں۔

انسانی زندگی کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ دوسرے علوم کے ساتھ الہامی کتب پر مبنی شعور پیدا کیا جائے اور علم وعمل کی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ تمام الہامی شریعتوں کا مقصد یہی رہا ہے کہ ایسا شعور پیدا کیا جائے جس سے ہستی باری تعالیٰ کو پہچاننے میں مدد ملے اور انسانیت کو صحیح سمت میں ڈھالا جا سکے۔ یعنی انسانی فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے حالات کا رخ صحیح سمت میں موڑا جا سکے جسے قرآن اور دیگر الہامی کتب نے متعین کیا ہے۔

یہ علم الہامی کتابوں میں موجود ہونے کے باوجود اس وقت تک پھیلایا نہیں جا سکتا جب تک کہ اہل علم اور اہل قلم لوگ اس کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش نہ کریں جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا ہے۔

''یعنی جو لوگ اجتماعی رنگ میں سوچتے ہیں ان کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حق کے چلانے اور باطل کو مٹانے اور اس کی اشاعت کرنے میں اپنی پوری کوشش کریں۔ لیکن یہ اکثر ممکن نہیں ہوتا جب تک حق کی حقانیت اور باطل کی غلطی دلائل اور براہین کے ذریعہ ثابت نہ کر دی جائے یا باطل کے مٹانے اور حق کے قائم کرنے کے لیے جان و مال کی قربانی کے ذریعے سے اعمال نہ کیے جائیں۔ اس وقت ان میں سے ہر ایک بات ایک نیکی شمار ہوتی ہے۔''

انسانی کامیابی کے لیے جہاں شعور کا فروغ و ترویج ضروری ہے وہاں ایک ایسا لائحہ عمل وضع کرنا بھی لازم ہے جو صحیح سمت میں راہ ہموار کرنے میں ہماری مدد کر سکے۔ مسلمانوں کا نصب العین قرآنی تعلیمات ہیں۔ جنہیں آنحضورؐ اور ان کے صحابہ کے دور میں ملی جامہ پہنایا گیا ہیا ور جن کے نتیجہ میں وہ

اعلیٰ میار قائم کئے گئے جو تاریخ کا سنہری باب کہلائے۔ انہی تعلیمات پر چل کر ہم موجودہ دور میں بھی اللہ کی واحدانیت اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرسکتے ہیں۔ [1]

قرآنی تعلیمات جہاں حق و باطل میں تمیز (الفرقان) کرنا سکھاتی ہیں وہاں وہ حقائق بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں جو ہمارے روزمرہ زندگی میں مشاہدے میں آتے ہیں۔

ان میں بہت سے زمینی اور آفاقی حقائق ہیں جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے نفسیاتی۔ حسّی، قلبی اور جمالیاتی پہلو بھی ہیں جن کا ادراک ہمیں زندگی کی رعنائیوں سے مستفیض ہونے میں مدد دیتا ہے۔

قرآن وقتاً فوقتاً ان صلاحیتوں کا ذکر کرتا ہے جن کا شعور ہماری حسی، نفسی اور جمالیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ خاص طور پر جواس خمسہ میں سامعہ واصرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ حواس اتنے اہم ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو ہماری زندگی ناکارہ ہو کر رہ جائے۔

حسی۔ نفسی اور قلبی نظام اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک عظیم رحمت ہے جو انسان کو اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ انسان کو ارتقائی مراحل طے کرنے میں بھی مدد دیتا ہے مزید برآں اس سے اللہ تعالیٰ کی تخلیقی قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اسے اس کی ہستی کو ثابت کرنے کے لیے بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی زمینی اور آفاقی تخلیق کو دیکھ کر جو گونا گوں حسین وجمیل رعنائیوں سے مزین ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس کا خالق خود کتنا حسین وجمیل ہوگا۔

یہ احساس ہمارے بقاء حیات کے تصور کو مزید تقویت دیتا ہے وہ ابواب ہمارے سامنے کھولتا ہے جن کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کا وجود ازلی و ابدی ہے اور اس کا حسن لازوال اور لافانی ہے اس لیے ہماری

۱۔ شاہ ولی اللہ۔ حجتہ البالغہ۔ جلد اول
صفحہ ۵۰۔ طبع نور محمدؐ۔ کراچی

Marfat.com

صلاحیتیں اور کیفیتیں بھی اس سے مزین ہوتی ہیں اور ہمیں ارتقائی مراحل طے کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

اس کے قوانین بھی اٹل ہیں جو اس کی تمام تخلیقی کارناموں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ان قوانین کی عکاسی اس کے احکامات سے ہوتی ہے جو ہمارے نفسی، قلبی اور حسی نظام کی صحت اور بقا کی بھی ضمانت دیتے ہیں۔ قدرت کے قوانین اگر اتنے اٹل نہ ہوتے تو یہ نظام متزلزل رہتا اور ہم وہ اعلیٰ معیار کی ان منازل پر نہ پہنچتے جو کہ اب ہمارے قبضہ قدرت میں ہیں۔

اس کا حسن اس نظام کی صحت اور سلامتی میں ہے جو ہمیں توانائی بخشتا ہے اس توانائی کے ذریعہ ہم علم اور عمل کے میدان میں زیادہ فعال ہو جاتے ہیں۔ اس توانائی کی تاثیر زندگی میں پاکیزگی پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

اس سے گناہ اور غلاظتوں کے داغ دھلتے ہیں اور تزکیہ نفس پیدا ہوتا ہے اور پھر ہماری تمام صلاحیتیں احسن طریق سے بروئے کار آجاتی ہیں۔ پھر ایک ایسا راستہ پیدا ہوتا ہے جو ہمیں حُسن الماب کی جانب لے جاتا ہے اور ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔

اس سے انسان کو عبودیت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کا موقع ملتا ہے جو اس کے معبود حقیقی کے قرب دیدہ ورِ رضوان کا مقام ہے۔

اگر چہ اس مقام پر فائز ہونا حُسن عبودیت کا کمال ہے لیکن یہ مقام متناہی نہیں بلکہ ارتقائی ہے کیونکہ یہاں سے ایک مقام کے بعد دوسرا مقام پیدا ہوتا رہتا ہے اور کمالات کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس تمام جدوجہد کا مقصد انسان کی زندگی کی بقا، علم وحکمت او عرفان ومعرفت ہے تو غلط نہیں ہوگا یہی مشیت ایزدی اور غائیت دین ہے۔ یہ ہی مطالعہ قرآن کا مقصود ہے اور یہی زندگی کا مطمع نظر۔

یہی حُسن کائنات ہے اور یہی حُسن مالک ارض وسما ہے یہی ہمارا مطالعہ ومشاہدہ ہے جس کی تردید نہیں ہوسکتی اگر ہم قدرت کے تخلیقی شاہکاروں کا جو تمام کائنات پر محیط ہیں مطالعہ ومشاہدہ جاری رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہ رشتہ استوار کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان

آغاز انسانیت سے قائم ہے۔ یہی رشتہ ہمیں اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ ہم اس دنیا اور آخرت میں کامیاب اور سرخرو ہوں گے۔

اگر قدرت کے یہ تخلیقی شاہکار ہمارے ارد گرد نہ ہوتے تو ہم نہ صرف صحیح بصیرت سے محروم ہوتے بلکہ ان کے نفسیاتی اور جمالیاتی تاثرات بھی ہماری زندگی پر مرتب نہ ہوتے اور ہم اس ٹھنڈک اور سرور سے محروم رہتے جس کا وعدہ ہم سے حسن الماب اور قرۃ العین کی صورت میں کیا گیا ہے۔

قدرت کے شاہکاروں کا مشاہدہ ہمارے عقلی تعطل کو توڑ دیتا ہے اور ہماری ذہنی، قلبی اور روحانی قوتوں کو فعال بنا دیتا ہے اور ہم کامیابی سے نشو ونما کے ارتقائی مراحل طے کرنے لگتے ہیں۔

قرآن حکیم کا مطالعہ بذات خود معنی خیز اور بصیرت افروز ہے یہ ان مشاہدات اور تجربات کو مزید مستحکم بناتا ہے جو سوچ وفکر۔ سائنس اور فلسفے کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔

یہ ہمیں اس راہ پر گامزن ہونے میں مدد دیتا ہے جو ہمیں ہمارے اصل مقصود کی جانب لے جاتا ہے اس کی بدولت ہمارا رب حقیقی سے وہ رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ہماری پیدائش کے وقت ہماری تخلیق کا موجب بنا اور اسی رشتے کی بدولت ہم تخلیق سے تکمیل کے مراحل طے کر پاتے ہیں

اگر ہم سمجھ و بوجھ کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہو جائیں تو تکمیل زندگی ممکن ہوگی اور ہمارا اس دنیا میں رہنا بے مقصد اور بے معنی نہ ہوگا اور جو رشتہ ہمارا اللہ تعالیٰ سے قائم ہوا ہے وہ ازلی اور دائمی سطح پر استوار ہوگا۔ اور اسی کے ذریعہ سے ہمیں خوب سے خوب تر کے عمل کو تیز تر کرنا ہوگا۔ تب ہی ہم عظمتوں تک پہنچ سکیں گے۔

والعصر
إن الإنسان لفي خسر
إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات
وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر

Marfat.com

Marfat.com

کامیابی کے لیے قرآنی لائحہ عمل ﴿باب ۱۲﴾

بے شک انسان خسارے میں ہے

والعصرْ ۝ ان الانسان لفی خسرٍ ۝ الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وتواصوا الحق ۵ وتواصوا بالصبرِ ۝

قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام کئے نیک اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں ساتھ حق کے اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں ساتھ صبر کے۔''

(سورۃ ۳۔۱: ۱۰۳)

مذکورہ بالا آیت کو اگر قرآن کا نچوڑ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں ان تمام ضروری احکامات کی ایک نہایت ہی موثر انداز میں جامع توضیح کردی گئی ہے۔ جو انسانی زندگی کی کامیابی کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔

''یہ سورۃ الفاظ کے لحاظ سے بے شک مختصر ہے مگر بلحاظ معنی اپنی تنگائے الفاظ میں فلسفہ حیات کی بیکراں وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

عصر دراصل ایک ''تاریخی عمل'' کے نتائج وعواقب کا آئینہ دار ہے ہمارے نزدیک اسی لیے قرآن کریم نے تاریخی عمل کی وضاحت کی خاطر اپنی سورۃ عصر میں عصر کی قسم کھائی ہے یہ قسم اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیکہ عصر تاریخی عمل کے نتائج وعواقب یا اقوام عالم کے عروج وزوال کے اسباب وعلل اور عوامل محرکات کی لوح محفوظ ہے۔ جس کا مشاہدہ بالحق کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے اس کے اس اصل الاصوال کا پتا چلتا ہے کہ تاریخی عمل قدرت کا ایک ناقابل تغیر وتبدل قانون مکافات ہے جس پر عمل نہ

Marfat.com

کرنے سے انسان مسلسل خسارے یا گھاٹے میں جا رہا ہے بجز ان لوگوں کے جو مومن و صالح ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین با انداز وصیت کرتے رہتے ہیں۔

وقت یا زماں (Time) کی قسم کھانا ایک بہت بڑی قسم ہے جو ان حقائق کی سنجیدگی کو نہایت جامع اور موثر انداز سے واضح کرتی ہے۔

یہ قسم اس لیے بھی گھمبیر ہے کہ اس کا تعلق زمان و مکاں سے جو براہ راست انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ [1]

اس لحاظ سے انسان گردش شب و روز کے چکر میں جکڑا ہوا ہے اور وہ اس سے کسی صورت باہر نہیں نکل سکتا۔

اس حقیقت کا اعتراف تمام مفکرین اور فلسفیوں نے بھی کیا ہے انگریزی زبان کے مشہور شاعر شیکسپیئر کا قول ہے ''کہ وقت انسانوں پر حکومت کرتا ہے وہ جہاں انسان کی ابتدائے آفرینش ہے وہاں وہ اس کی فنا کا بھی سندیسہ دیتا ہے۔'' [2]

گردش زمانہ کے اثرات برابر انسان کی جسمانی، نفسیاتی اور قلبی کیفیات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح اس کی فلاح و بہبود اور زیاں و خسارے کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ عالم زمان و مکاں کو مختلف کڑیوں میں پرو دیا گیا ہے اور وہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

زمان و مکان کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن حکیم (سورۃ الدھر یا الانسان ۱:۷۶) میں فرماتا ہے ''کہ کائنات کا سلسلہ بہت قدیم ہے اور اس وقت سے چلا آ رہا ہے جبکہ آدمی کا نام و نشاں تک بھی نہ تھا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا''

اس آیت میں انسان کی پیدائش زمان و مکان کے تناظر میں بیان کی گئی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان اپنی پیدائش کا مقصد سمجھنے اور اپنے آغاز اور انجام سے غافل نہ ہو۔

اس حقیقت کو ایک مفسر نے نہایت لطیف پیرائے میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک روز دو آدمی ایک

۱۔ ڈاکٹر نصیر ناصر۔ فلسفہ حسن۔ صفحہ ۱۴۸

۲۔ شیکسپیئر Tempest: اور 1-11-49 /11:3:Pericles

Marfat.com

قبرستان سے گزر رہے تھے۔ان میں سے ایک نے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ قبریں ہمیں کیا کہہ رہی ہیں۔دوسرے نے کہا کہ نہیں۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتی ہیں پہلے نے کہا کہ وہ کہہ رہی ہیں '' کہ ہم بھی کبھی تمہاری طرح تھے اور ایک روز تم بھی ہماری طرح ہوں گے۔''[۱]

انسان جو اپنے آغاز و انجام سے غافل ہوتا ہے اس سورۃ (۱:۷۶) کی پہلی آیت اسے متنبہ کرتی ہے یہ پیغام اس کے لیے فکر انگیز ہونا چاہیے کہ کبھی انسان کوئی قابل ذکر شے نہ تھا اور ایک دن وہ موجودہ صورت حال سے بھی محروم ہو جائے گا اور آنے والی نسلیں اسے اسی طرح بھول جائیں گی جس طرح وہ اپنے آباؤ اجداد کو بھول گیا ہے۔

ہم کہاں سے آئے۔کب آئے اور کہاں جارہے ہیں ایسے سوال ہیں جن کی گتھیوں میں انسان اب تک الجھا ہوا ہے اور تمام تر سائنسی اور فلسفیانہ کاوشوں کے باوجود ان گتھیوں کو نہیں سلجھا سکا ہے۔

انسان کی تخلیق تو بہت بعد کی بات ہے سب سے پہلے تو مادہ کا وجود اور تخلیق کائنات کے رموز سے پردہ اٹھانا ضروری ہے۔

لیکن تخلیق کائنات چونکہ براہ راست اس باب میں ہمارا موضوع سخن نہیں ہے اس لیے اس پر یہاں تفصیلی بحث نہیں ہوگی البتہ ضمناً اس بارے میں کچھ کہا جائے گا۔

تخلیق کائنات کے بارے میں قرآن مجید، انجیل مقدس اور دیگر الہامی کتب میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا گیا ہے اور جدید سائنس اور فلسفہ نے بھی اس بارے میں خاصی تحقیق کی ہے جس کے نتائج بہت سی کتب میں موجود ہیں۔

ہم نے یہاں دیکھنا ہے کہ انسان کب اور کیسے پیدا ہوا اور اس کی تخلیق کا کیا مقصد ہے کیا وہ واقعی زمان و مکاں کا اسیر ہے اور اس کا حالات کے بدلنے اور انکا اپنی تقدیر پر اثر انداز ہونے میں کیا کردار ہے یہ سوال انتہائی اہم ہیں اور ان سے نبرد آزما ہونا ہمارا مقصد ہے۔انسان کب کیسے اور کہاں پیدا ہوا اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔البتہ تخمینے، اندازے وغیرہ لگائے جاسکتے ہیں اور ایسے

۱۔شیخ محمد الغزالی: قرآن کی مضامین کے اعتبار سے تفسیر لندن قاہرہ۔

ہی ایک اندازے کے مطابق انسان پچاس ہزار سے ایک لاکھ سال کی مدت میں روئے زمین پر براجمان ہوا۔ اس کے بعد تقریباً دس ہزار سال پہلے زراعت کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کیا گیا اور اس کے بعد آبادیاں بسنی شروع ہوئیں اور انتہائی ابتدائی معاشرتی اور تہذیبی دور شروع ہوا لکھنے پڑھنے کا ہنر شاید پانچ ہزار سال پہلے شروع ہوا۔ تقریباً تین ہزار سال پہلے غور وفکر کے ساتھ فلسفے کا دور شروع ہوا اور یونانی فلسفیوں نے نئے نظریات اور خیالات کے ساتھ دنیا میں اپنی دھوم مچادی۔ سائنس کا دور تقریباً تین سو سال پہلے شروع ہوا اور نیوٹن اور آئن شٹائن جیسے سائنسدانوں نے نئے تجربات اور تحقیقات کی وساطت سے دنیائے علم وادب میں تہلکہ مچادیا۔ اس سے ذہنی افق میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور فرانس، جرمنی اور انگلستان میں ایسے انقلابات رونما ہوئے جنہوں نے سیاسی، صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی۔

تقریباً سات سو سال پہلے مسلم مفکرین نے یونانی فلسفیوں کے نظریات کا جائزہ لیا اور انہیں عربی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کیا۔ اس سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے ساتھ ایک منظّم مذہب کی بنیاد رکھی گئی جو اسلام کے نام سے مشہور ہوا اور حضرت محمدؐ کی بعثت پر قرآن مجید کے نزول کے ساتھ اسے ایک باقاعدہ منظّم دین کی حیثیت حاصل ہوئی۔

قرآن حکیم کے ارشادات اور آنحضورؐ کی عملی زندگی ان تمام خوبیوں اور خصائل کا نچوڑ ہیں جو کہ ایک کامیاب اور خوبصورت زندگی کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

اس طرح زندگی کا رخ بدلنا شروع ہوا اور وہ طور طریقے جو نہایت پسماندہ اور مشرکانہ عقائد پر مبنی تھے بدلنے شروع ہوئے۔ قرآن مجید نے نہ صرف دنیاوی زندگی کو بہتر مہذب بنانے کے طریقے بتائے بلکہ مستقبل کے لیے بھی ایک لائحہ عمل دیا جس سے آدمی کے لیے روشن اور حسین راہیں متعین ہوگئیں۔ اب یہ اختیار آدمی کو دیا گیا کہ وہ ان پر چلتا ہے کہ نہیں۔ اسے بتا دیا گیا کہ اگر اس نے یہ راہیں اختیار نہ کیں تو وہ خسارے میں رہے گا۔

آدمی کو بتا دیا گیا کہ خسارے سے بچنے کے لیے کچھ عوامل کا اختیار کرنا ضروری ہے جس کی وضاحت مذکورہ بالا سورۃ (۱۰۳) میں کر دی گئی ہے ساتھ ہی اسے ایک واضح لائحہ عمل دے دیا گیا جو اس

Marfat.com

کی کامیابی اور فلاح و بہبود کا ضامن ٹھہرا۔

کامیابی کے لیے ارتقائی مراحل کا تعین بھی ضروری ٹھہرا اور اس کے لیے اسے ایمان، ثابت قدمی، نیکی اور بھلائی کا پرچار اور صبر جیسی خوبیوں سے مزین کیا گیا۔ آدمی کو بتا دیا گیا کہ اگر تم ان خوبیوں کو اپناؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے وگرنہ زیاں و خسارہ تمہارا مقدر ہو گا۔

ارتقائی مراحل طے کرنے کے لیے آدمی میں بے شمار عقلی، قلبی اور روحانی قوتیں ودیعت کی گئیں۔ حقیقت میں ایک نہایت موثر نظام حیات وضع کیا گیا جو کامیابی اور کامرانی کے لیے قوت لا متناہی خود میں چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے ذریعہ آدمی نہ صرف بے شمار علوم حاصل کرتا ہے بلکہ بہت سے مفید اور دلچسپ مشاہدات اور تجربات سے بھی گزرتا ہے۔ ان سے نہ صرف اس کو ذہنی اور قلبی فروغ حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ روحانی اور جمالیاتی سوز و سرور بھی حاصل کرتا ہے۔

زندگی سے اس کے داغ دھبے دور کرنا بھی ایک فطری عمل ہے۔ جب تک یہ بدنما پہلو دور نہ ہوں گے زندگی حسین و جمیل نہیں ہو سکتی۔

داغ دھبوں کو دور کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کی موجودگی میں وہ اخلاقی خوبیاں اور جمالیاتی عواقب اپنائے نہیں جا سکتے جن کا عندیہ قرآن مجید نے دیا اور جن کی عملی تعبیر حضرت محمدؐ نے رحمت العالمین ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ نے بتایا کہ جس زندگی میں ہمدردی و محبت، عفو و درگزر اور عدل و احسان موجود نہ ہو وہ ایک کامیاب اور حسین زندگی نہیں ہو سکتی۔

یونانی فلسفیوں نے بھی اس قسم کا تصور پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کے لیے (Catharsis) کا لفظ استعمال کیا تھا۔ جس سے مراد زندگی سے بدنما دھبوں کو دور کرنا اور ان کی جگہ ایسے جذبات و احساسات پیدا کرنا جو کہ حسن قلب اور تخلیقی نظریات و افکار کو جنم دیں۔ لیکن چونکہ ان کے نظریات کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کوئی گہرا رابطہ نہیں تھا اس لیے انہیں مسلم مفکرین کے ہاں پذیرائی نہ مل سکی۔

اسلام نے ربوبیت کا نظریہ دے کر انسانی فکر میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنی تخلیق اور اس کی پرورش اور اس کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کرنا اور ایسا لائحہ عمل اختیار

کرنا جس سے اپنے خالق ورب کی تخلیقی قوت کا ادراک ہو سکے اور انسان اس کا احسان مند ہو سکے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ خالق زمان ومکان ہے اس لیے اس کا ایک مرتبہ ہے جس کا ادراک انسان کے لیے ضروری ہے۔ وگرنہ انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ مزید برآں قرآن مجید کی توضیحات کے مطابق یہ بھی انسان کی تخلیق کا ایک بنیادی مقصد ہے۔

عالم زمان ومکان کا ایک عظیم نظام ہے۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ اور اسی کے توسط سے ہم زمان ومکان اور 'دہر' کی توضیح کرتے ہیں۔ اس تناظر میں ربوبیت اور 'دہر' کی تشریح نصیر احمد ناصر صاحب نے یوں کی ہے۔

''چونکہ ہم شعور زمان ومکان کے اسیر ہیں۔ اس لیے عقل سلیم کے ذوق آگہی کی تسکین کے لیے اس کے زمان قدیم وسرمدی کے لیے ''دہر'' کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ دہر اصل میں ''حسن الزماں'' ہے اور اسے اس بنا پر ثبات دوام حر کی حاصل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ زندہ بالذات اور قائم بالذات ہے اور زندگی کو حرکت مدام اور قیومیت کو ثبات مدام مستلزم ہے علاوہ بریں چونکہ وہ زمان ومکان اور موت وحیات کا خالق ورب ہے اور سبحان وحمد ہے۔ اس لیے موت وہلاکت فساد وخرابی، جمود وتعطل، اضحلال وانحطاط، نیند وتکان سے مبرہ وماوراء ہے۔

دہر با حُسن الزمان جو اپنی مطلق حیثیت میں ایک حال مدام، باثبات، بے نظیر ہے اپنی اضافی حیثیت میں ایسا دوران زمانی ہے۔ جس کی ابتدا بھی خود اور انتہا بھی خود ہے۔ بالفاظ دیگر مستقبل کا آغاز بھی ہے۔ حال کا اعتبار اور ماضی کا امکان بھی ہے۔

مختصر یہ کہ دہر اپنی اضافی حیثیت میں ازل سے ابد تک ازمنہ بے شمار و بے قیاس کی ایک تعبیر ہے۔ اس کے سلسلہ امتداد کے بے شمار و بے قیاس سلسلے ہیں۔ جس کی ہر کڑی کو ان سے آفات کے سلسلے کو وقت اور سلسلہ اوقات کو عصر اور اعصار کے سلسلے کو زمان اور ازمنہ بے قیاس کے سلسلے کو دہر سے تعبیر کرتے ہیں۔''

یہ ذہنی اور آفاقی حقائق ہمیں فکر وعمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ان حقائق کو سورۃ العصر کے تناظر میں سمجھنے کے لیے متواتر نظر وفکر کی ضرورت ہے۔ امام رازی جیسے مفکر نے ان حقائق کی عملی شکل دینے کے

Marfat.com

لیے کئی سال وقف کیئے اور تب بھی ان پر پورا عبور حاصل نہ ہوا۔ بہر کیف وہ کہتے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت انہیں ایک برف فروش سے حاصل ہوئی جو آواز لگا رہا تھا کہ ''آجاؤ میری دولت پگھل رہی ہے۔''

امام رازی حیران ہوئے کہ برف کا پگھلنا دولت کے پگھلنے کے کیسے مترادف ہوسکتا ہے۔ آخر کار ان کی سمجھ میں آیا کہ وقت جس تیزی سے گزر رہا تھا وہ اس کے لیے خسارے کا باعث تھا۔ اگر اس وقت اس نے اس سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا اور برف نہ بیچی تو وہ خسارے میں ہوگا۔ یہی حال عام زندگی میں انسان کا ہے۔ اگر وہ اپنا وقت سنجیدگی سے سچائی کی تلاش میں صرف نہیں کرتا تو وہ بالآخر خسارے میں چلا جاتا ہے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ آدمی خسارے میں ہے تو اس سے مراد دنیوی لین دین یا مال و دولت کا حصول نہیں ہے بلکہ حسن و سرور کا وہ سلسلہ ہے جو غلاظتوں کے نتیجہ میں منقطع ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کا ایک انداز بیان ہے جو آدمی کو حقائق سے آگاہ کرتا ہے اور ایسا لائحہ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو دنیوی اور اخروی لحاظ سے کامیابی کا ضامن قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک نظام اخلاق وعقائد وضع کرتا ہے جو فلاح و بہبود کی راہ متعین کرتا ہے۔

ان عقائد اور اخلاقی اقدار کا ادراک نہایت ضروری ہے تاکہ یہ قلب و دماغ میں رس بس جائیں اور انسان کامیابی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

اگر ایمان اور عقائد کی دولت سے آدمی بے بہرہ ہو جائے تو ثروت اخلاق اور پاکیزگی کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

خسارے کی شکل بدی اور بدکرداری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو اسے نہ صرف اپنی نظر میں بلکہ معاشرے اور مزید برآں اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل و خوار کرتی ہے۔

اس لیے جب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں عصر یا انسانی عمل کے حوالے سے یہ کہتا ہے کہ ''انسان بلاشبہ خسارے میں ہے'' تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے قیمتی اثاثے جو اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی صحت، زندگی اور صلاحیتوں کی صورت میں عطا کیے ہیں ضائع کر رہا ہے وہ ان سے پوری طرح

Marfat.com

مستفیض نہیں ہو رہا ہے اور اپنی زندگی اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال میں نہیں لا رہا ہے۔

قرآن نے فکر و عمل کا سلسلہ اسی لیے شروع کیا اور جس پر چل کر آنحضورؐ اور ان کے صحابہؓ نے دکھا دیا کہ انسان اللہ کی برکات اور نعمتوں سے کس طرح مستفید ہو سکتا ہے۔

قرآن متنبہ کرتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور دیگر صلاحیتوں کو مذموم اخلاقی اور مشرکانہ حرکات میں ضائع کر رہے ہیں وہ دراصل گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں اور مسلسل کفران نعمت تغافل اور زیاں کاری کے عمل سے دوچار ہیں۔

بہرکیف مذکورہ بالا سورۃ آدمی کو خسارے سے بچانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جس پر عمل کرنے سے وہ دنیوی اور اخروی زیاں کاری سے بچ سکتا ہے۔

آنحضورؐ اور ان کے صحابہ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ وقت کو وقت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے اور اس کا ہر لمحہ نیکی و بہتری اور کمال و جمال کی خاطر استعمال میں لانا چاہیے۔ زندگی کے ہر لمحہ سے استفادہ کرنا اور نیکی کی راہ پر چلنا ہی کامیابی اور فلاح و بہبود ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ناشناس ہوتا ہے اور تغافل برتتا ہے وہ اپنے مقصود سے بہت دور ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کو ایک شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"رختم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و مرسالہ راہم دور شد"

(میں پاؤں سے کانٹا نکالنے گیا اور لیلیٰ مقصود نظروں سے اوجھل ہو گئی۔)

اس لیے غفلت، بے راہ روی اور ناقدر شناسی انسان کو اپنی منزل سے بہت دور کر دیتی ہے اور وہ بالآخر زیاں کاری کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہماری روزمرہ زندگی بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتی ہے جب ہم اپنی لیلیٰ مقصود یعنی قرآن مجید سے دور ہو جاتے ہیں تو قرآن مجید بھی اپنی روشنی اور برکتوں کے دروازے ہم پر بند کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے ہمیں محروم کر دیتا ہے۔

Marfat.com

اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ ہوسکتا ہے کہ حسن وسرور کے دروازے ہم پر بند ہو جائیں اور ہم اپنے رب کریم کے قرب ورضوان اور دید وحضوری سے دور ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ بار بار آدمی کو اس محرومی اور خسارے سے متنبہ کرتا ہے۔ (قرآن مجید سورۃ ۱۸: ۱۷) میں ارشادت ہوتا ہے۔

''اگر کوئی شخص (اللہ کی رضوان ورضا کے مقابلے میں) اس دنیا میں وقتی فوائد کا متلاشی ہے تو ہم اسے یہ فائدہ وقتی طور پر دے دیتے ہیں لیکن آخرت میں وہ بہت گھاٹے میں ہوگا کیونکہ اسے وہاں اللہ کے رحمتوں سے دور بھگا دیا جائے گا اور دوزخ کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔''

اس لیے اصل فائدہ انہی لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں اور ہمیشہ اس کی رضا اور رضوان کے متلاشی رہتے ہیں۔ اور اللہ کے دوست (ولی اللہ) اہل حسن وسرور ہی ہوتے ہیں۔ اور حقیقی کامیابی بھی انہی لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید (۳۰۔۴۱) میں فرما دیا ہے کہ ایسے لوگ ہی اللہ تعالیٰ کے دوست بنتے ہیں اور وہ ہر قسم کے خوف ملال اور زیاں کاری سے مبرّۃ ہوتے ہیں۔

نیز دیکھئے سورۃ الاحقاف (۱۳۔۴۶)

Marfat.com

بنہ ترازدلی کسک دل وقار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے
مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

Marfat.com

اخلاقیات: جہاد اکبر

﴿باب ۱۳﴾

قرآن کا فلسفہ اخلاق

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ

کامیاب تو وہی لوگ ہیں جو اپنی عبادات میں خود کو سرنگوں کرتے ہیں۔ لغویات سے اجتناب کرتے ہیں اور زکوٰۃ کو دلجمعی سے ادا کرتے ہیں۔ جو اپنی شرم وحیا کے محافظ ہوتے ہیں سوائے اپنی بیویوں قانونی طور پر قبضہ میں آئی ہوئی عورتوں کے لیکن جو ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (۲۳:۱۔۷)

انسانیت کا احترام اور اس کی بقا وارتقا، قرآن کا مرکزی محور ہے جس کے گرد نظام حیات کی تشکیل کی گئی ہے۔

یہ فلسفہ قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ اخلاقیات اور ان مضمرات کی وضاحت کی گئی ہے جو اس ضمن میں نمودار ہوتے ہیں اور ہماری توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔

یہ فلسفہ اتنا مربوط اور جامع ہے کہ بہت سے لادینی (سیکولر) حلقے بھی قرآن مجید کی معنویت کے

Marfat.com

قائل ہوتے نظر آتے ہیں۔

قرآنی فلسفہ ایک ایسے ضابطہ حیات کی وضاحت کرتا ہے جو انسان کو نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کی نوید دیتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی میں سرور و مسرت کے ضامن بنتے ہیں۔

ایمان و یقین اور اعتقاد وہ بنیادی عناصر ہیں جو ایک مومن کی زندگی کو متحرک کرتے ہیں۔ ان میں پختگی اور استحکام ہی زندگی کو ان خطوط پر مرتب کرتے ہیں جن کا تقاضا قرآن کرتا ہے۔

قرآن حکیم جن خوبیوں کا خصوصاً ذکر کرتا ہے اور انہیں انسانی زندگی میں اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے وہ وحدانیت، انسانیت اور اخلاقیات کے متعلق ہیں۔

اسلام کا بنیادی اصول وحدانیت ہے اور ربوبیت کی ان تمام خوبیوں کا اقرار جو کہ اللہ تعالیٰ کو خالق اور پروردگار حقیقی تصور کرنے سے ذہنی شعور میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ امور جو آدمی کو انسان بناتے ہیں۔

وحدانیت اور ربوبیت کے اعلیٰ تصور انسان کے لیے وہ راہیں متعین کرتے ہیں جن پر یقین اور عمل کرنے سے انسان انسانیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتا ہے۔

انسانیت کے اعلیٰ مراتب توحید اور اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین لانے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی اعلیٰ قدروں کو اپنانے سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ وحدانیت اور اخلاقیات انسانیت کا حسن دوبالا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس باب میں اخلاقیات پر خصوصی توجہ دی ہے۔

اخلاقی اقدار کا ادراک اور ان تمام خوبیوں کو اپنانا بہت ضروری ہے جو کہ معاشرے میں صلح و آشتی، فلاح و بہبود اور عزت و احترام قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اخلاقی اعتبار سے انکساری، میانہ روی، صبر و تحمل ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کو اعلیٰ و ارفع بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

Marfat.com

ان خوبیوں کو بیواؤں، یتیموں اور مساکین کی مدد سے بھی منسلک کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے مساکین کی مدد نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں قابل تحسین نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی نمازیں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب نہیں بنتی ہیں۔

مزید برآں دوسرے اخلاقی پہلوؤں کا احساس اور ان کا عمل اظہار بھی انسانی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

انفرادی زندگی اور معاشرے کو جو دیگر برائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے ان میں جنسی رجحانات کا پھیلاؤ، جھوٹ، دھوکہ اور فریب گھناؤنے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لیے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام خوبیاں اپنائی جائیں جو اسلام کے ضابطہ حیات میں واضح کی گئی ہیں۔

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا سر نہ صرف حکم خداوندی کے سامنے سرنگوں کرے بلکہ ان خوبیوں کو بھی اپنائے جو انسان ہونے کے ناطے سے اس کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔

ان خوبیوں کی بنا پر حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے میں مسلم بن کر رہوں گا۔''

نجات کا حصول انسان کو سکون وطمانیت اور صبر وتحمل بھی عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر (پورا) ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر صبر اور رضا کی راہ دکھلاتا ہے۔

یہ راہ وہی راہ ہے جس کے لیے مسلمان ہر رکعت میں یوں دعا کرتا ہے۔ ''اے اللہ مجھے سیدھی راہ دکھا۔''

قرآن حکیم ایک ایسا ضابطہ حیات پیش کرتا ہے جو انسان کو انسانیت اور مسلمان کو ایمان اور اعتقاد کے اعتبار سے اعلیٰ مراتب پر فائز کرتا ہے۔ اگر ہم انبیاء اور اولیائے کرام کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت خود بخود عیاں ہو جائے گی کہ ان کا کردار ان کا ایمان اور ان کی برائیوں کے خلاف استعداد کار

قرآن مجید سورۃ الماعون ۱۰۷:۱۔۷

Marfat.com

اپنے ہم عصروں سے بہت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ سچائی کو سچائی جان کر اس سے لپٹ جاتے تھے اور پاکیزگی کی وہ اعلیٰ سطح پالیتے تھے جو عام زندگی میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

اگر اس کا مطمع نظر اللہ کی رضا اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود نہ ہوتا تو وہ کوئی ایسا کارنامہ سر انجام نہ دیتے جو عام لوگوں کی زندگی میں تغیر و انقلاب کی صورت پیدا کرتا۔

انسان اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ان کے کارنامے ہی تھے جو لوگوں کو محو حیرت کر دیتے تھے اور انہیں راہ مستقیم دکھانے میں کامیاب ثابت ہوتے تھے۔ یہ ان کے کردار کی پاکیزگی، صبر و استقامت کا جذبہ اور فکر و عمل کی پختگی ہی تھی جس نے انہیں وہ مقام عطا کیا جو انسانی سعادت کی معراج قرار پایا۔

ان بزرگ ہستیوں نے جو پیمانے قائم کیے وہ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود بھی مقبولیت اور پذیرائی کا ایک قابل ستائش مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس کے قائم کیے ہوئے پیمانے تاریخ انسانی میں سنہری ابواب بن کر ابھرتے ہیں۔ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود بھی ان کے قائم کیے ہوئے سانچوں کو اگر تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں فکر و تصور کی بلندی اور کردار و سیرت کی استواری اور پاکیزگی کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں اور انسانی معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ تاریخ باوجود اپنی سرد مہریوں کے ان کو بھلا نہیں سکی۔ اور یہی صورت حال مظہر نبوت کی تحقیق و اثبات کا قابل اعتماد پیمانہ بھی ہے۔ عنایت الٰہی کی ان ارزانیوں سے جو نبوت و رسالت کی اصلاحوں سے تعبیر ہیں۔ انسان کی ذہنی و فکری شادمانیوں کا اگر اہتمام ہوا ہے اور ہر ہر دور کے مسائل کی گتھیاں اگر انہوں نے سلجھائی ہیں اور تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے بڑھایا ہے تو اپنے دعوؤں میں بلاشبہ یہ حضرات صادق تھے۔ ان کو حق کی بجانب ٹھہرانے کے لیے کسی مصنوعی منطق آرائی اور علم الکلام کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیغام کی کامیابی ان کی ذہنی و فکری بلندی اور کردار و سیرت کا غیر معمولی تفوق ہی وہ حقائق ہیں جو ان کو صداقت شعار قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

یہی وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو انسان اور مسلمان کو مسلمان بناتی ہیں اور تب انسان مسلمان بنتا ہے

Marfat.com

تو وہ ان تمام خوبیوں کا مرقع ہوتا ہے جو ہم نے مذکورہ بالا مضمون میں بیان کی ہیں۔

ان خوبیوں کی پذیرائی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنی نعمتوں سے فرماتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے صالح لوگوں کے لیے خوشخبری یوں دی گئی ہے۔

''بے شک اللہ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو انسان کو انسانیت کے اعلیٰ معراج پر پہنچانے کے لیے جہاں قرآن نے بہت سی ہدایات دی ہیں ان میں خوبیاں اور اخلاقی صفات بھی بہت اہم ہیں جو انسانی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔''

ان خوبیوں میں انکساری اور غرور و تکبر سے اجتناب اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسند ہے وہ غرور و تکبر ہے۔ کیونکہ کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اس چیز کا سزاوار نہیں کہ وہ غرور و تکبر میں مبتلا ہو۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنی ہدایات اور برکات سے محروم کر دیتا ہے جو تکبر کرتے ہیں ان پر کوئی حقیقت واضح نہیں ہوتی کیونکہ وہ دنیا ہی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔

ایسے لوگ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مگن رہتے ہیں اور اللہ اسے اللہ کی ذات اور مقصد حیات سے بخوبی آگہی نہیں ہوتی۔

پھر اللہ ایسے لوگوں کے بارے میں بتاتا ہے جو اپنی دولت اور طاقت کے گھمنڈ میں مرعوب تھے کہ وہ کسی ایسی طاقت کے ماننے سے منکر تھے جو انہیں ان کے بداعمالوں کی سزا دے سکے۔ اس لیے انہوں نے کہہ دیا کہ وہ کون ہے جو ہم سے ہماری دولت و طاقت چھین سکتا ہے وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ تھے کہ اللہ نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور وہ ہی انہیں ختم کرنے کا مجاز ہے۔

اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے کہ یہ دولت وقوت بتدریج زوال پذیر ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے جابرانہ اور متکبرانہ طرز عمل کو سخت ناپسند کیا ہے اور ایسے لوگوں کے لیے سخت سزا کی وعید ہے۔

تکبر و غرور کے مقابلے میں انکساری کا عمل انتہائی پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو

Marfat.com

کو اس کے مطابق ڈھالنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اخلاقیات نبوی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ پہلو بہت ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

رحمت العالمین کی یہ عملی صورت تھی کہ آپؐ ہر کسی ایک سے حسن اخلاق سے پیش آتے اور کسی شخص سے نفرت یا بد سلوکی نہ کرتے۔ آداب معاشرت کے ضمن میں کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت کے طلب کرنے پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ سورۃ النور آیت ۲۰۷ میں حکم دیا گیا ہے کہ جب تم دوسروں کے گھروں میں داخل ہو تو ان سے پہلے اجازت طلب کرو یہ چیز ایمان والوں کے لیے بہتر قرار دی گئی ہے۔ اور اسی طرح سلام کرنا اور اچھے انداز سے سلام کے جواب دینے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔

سورۃ النساء آیت ۸۶ میں یہ اس ہدایت کی وضاحت کی گئی ہے اور خود آنحضورؐ کی زندگی کا یہ خاصہ تھا کہ وہ سلام کیے بغیر کسی گلی یا بازار سے نہیں گزرتے تھے ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے اور اسے حسن اخلاق کا ایک اعلیٰ جزو قرار دیتے تھے لیکن موجودہ دور میں یہ امر قابل افسوس ہے کہ مسلمان سلام کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس میں شاید اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سلام کرنے میں اللہ کی برکات شامل ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم کی ہدایات اور نبی کریمؐ کی زندگی کے اطوار مسلمانوں کی زندگی میں خصوصاً نمایاں حقیقت کے حامل ہونے چاہئیں کیونکہ انہی سے تہذیب وتمدن کی بنیاد پڑتی ہے اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ کتنا متمدن ہے۔

کذب بیانی:

جھوٹ، دروغ گوئی اور کذب بیانی ایسی برائیاں ہیں جو انسانی زندگی اور معاشرتی ہم آہنگی کو بری طرح متاثر کرتی ہیں وہ بنیادی اخلاقی اقدار کے خلاف ہیں۔

جھوٹ اور وعدہ خلافی سے نہ صرف دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ معاشرتی فروغ کی راہ میں رکاوٹیں بھی حائل ہوتی ہیں۔

قرآن مجید کی سورۃ واقعہ آیت ۲۸ میں اللہ تعالیٰ جھوٹ کو ایک برا فعل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

Marfat.com

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا جو اپنی حد سے تجاوز کرنے والا ہو۔ اور جو بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔ کہ (برائے چندے) اس کی بات چل جائے تو ممکن ہے مگر بالآخر اس کی ناکامی یقینی ہے۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں ڈالتا جو (خود) جھوٹا ہو اور (اعتقاداً) کافر ہو۔

قرآن مجید (سورۃ زمر آیت ۲)

البتہ ایسے حالات میں جبکہ صلح وغیرہ کرانا مقصود ہو تو جھوٹ بولنے میں مضائقہ نہیں۔

خیانت:

خیانت بھی جھوٹ کی ایک بدترین قسم ہے جس میں انسان نہ صرف جھوٹ بولتا ہے بلکہ دھوکہ اور فریب سے دوسرے لوگوں کی امانتیں وغیرہ ہڑپ کر جاتا ہے یا کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے۔

سورۃ انفال آیت نمبر ۲۷ میں اس ضمن میں فرمایا گیا ہے۔

''اے ایمان والو تم اللہ اور رسول کے حق میں خیانت نہ کرو اور اسی طرح اپنی قابل حفاظت چیزوں میں جو تمہارے حوالے کی گئی ہوں۔

پھر سورۃ النساء میں فرمایا گیا کہ ''اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتا بلکہ اس کو مبغوض رکھتا ہے) جو بڑا خباثت کرنے والا ہو۔

اس ضمن میں آنحضورؐ کی زندگی کا ایک واقعہ انتہائی قابل ستائش ہے جو اکثر حکایات میں بیان کیا گیا ہے۔ جب آپؐ کو مکہ خیر باد کہنا پڑا تو آپؐ نے تمام وہ امانتیں جو آپ کے پاس مشرکین نے رکھی تھیں حضرت علیؓ کے حوالے کر دیں اور انہیں ان کے مالکین تک پہنچانے کی ہدایت کی اور تب آپ نے مکہ کو الوداع کہا۔

تو یہ ایک بہت عظیم واقع ہے جس سے ہر شخص کو سبق حاصل کرنا لازم ہے۔

اسی طرح وعدہ خلافی چغل خوری جھوٹی گواہی اور بہتان وغیرہ بھی، جھوٹ کی قابل مذمت

Marfat.com

صورتیں ہیں، جن سے ہر حال میں احتراز کرنا لازم ہے۔

بدگمانی، تجسس اور غیبت:

معاشرہ میں امن قائم رکھنا اور باہمی اعتماد اور احترام کی فضا قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بدگمانی، ظن اور غیبت جیسی برائیوں سے دور رہا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے خلاف تجسس اور اس کے پوشیدہ معاملات کے متعلق کھود بینی کرنے سے منع کیا ہے، ایسی حرکتوں سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بغض اور کینہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

البتہ صرف ان لوگوں کی حرکتوں پر نظر رکھی جاسکتی ہے جو قوم اور ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں۔ قرآن پاک میں ذیل کی آیت سے اس سلسلے میں نشاندہی ہوتی ہے۔

بے شک بعض گماں گناہ ہوتے ہیں'' (سورۃ الحجرات)

اور اسی طرح غیبت وغیرہ سے بھی منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دوسرے لوگوں کی زندگی پر کچھ ایسے دھبے پڑتے ہیں جن سے گندگی کے پھیلنے میں اضافہ ہوتا ہے۔

زناکاری:

زناکاری ایک بہت ہی گرا ہوا فعل ہے جس کے باعث انسان کی نفسیاتی، جنسی اور قلبی زندگی میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے باعث انسان ایک ایسے ہیجان میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اسے اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

زناکاری کے سبب ازدواجی زندگی میں اخلاص نہیں رہتا اور باہمی اعتماد اور احترام کا رشتہ قائم نہیں ہونے پاتا۔

مزید برآں ایک زانی عورت یا مرد سے شادی کے غیر صحت منداور غیر اخلاقی اثرات اولاد پر بھی پڑسکتے ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ازدواجی رشتہ ان تمام برائیوں سے پاک ہو جو زناکاری کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔

Marfat.com

چونکہ زنا کاری دو جنسوں کے درمیان رشتوں کی نوعیت اخلاقی اور روحانی پاکیزگی سے حیوانی سطح پر لے آتا ہے اس لیے قدرتی محبت اور رحمت کی وہ فضا جو میاں بیوی کے درمیان ہونی چاہیے اکثر مفقود ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''اور تمہارے (میاں بیوی) کے درمیان محبت پیدا کر دی ہے۔ (سورۃ الروم، آیت ۲۱)

اس لیے قرآن نے زنا کو صفت فاحشہ قرار دیا ہے اور اسے حرام کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو۔''

بلاشبہ یہ بہت بڑی بے حیائی کی بات ہے اور دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی بری راہ ہے۔ اسی لیے اس کے ارتکاب کی سزا بہت سخت ہے یعنی شادی شدہ افراد کے لیے سنگساری اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لیے سو کوڑے۔

یہ سزائیں سخت نوعیت کی اس لیے مقرر کی گئی ہیں تاکہ معاشرے سے قبیح برائیوں کی منح کنی کی جا سکے۔ اور انفرادی اور معاشرتی اخلاقیات کو بہتر انداز میں مرتب کیا جا سکے۔

قرآن کریم سے پہلے بھی جو الہامی کتب نازل ہوئیں ان میں زنا کاری کی سرکوبی کی واضح ہدایات کی گئی ہیں۔

انجیل قدیم میں کہا گیا ہے۔

''کہ تم زنا کاری نہیں کرو گے۔''

لیکن موجودہ دور میں خواہ یہ عیسائی یا یہودی معاشرہ ہو یا مسلم اور ہندو جنسی بے راہ روی اور فحاشی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری معاشرتی اور انفرادی زندگی ان تمام برائیوں میں بری طرح ملوث ہے جو کہ ان کے تنزل کا باعث ہیں۔

فاخرانہ لہو ولعب:

فاخرانہ لہو ولعب انسانی نفس کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی مال و دولت اور زینت و آرائش کے سبب دوسروں پر فضیلت کی آشکارہ ہو۔

فاخرانہ زندگی کا ایک ابھرتا ہوا پہلو ایسی خواہشات اور محرکات پر مشتمل ہو جو شہوات کو بھڑکاتی ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو محض لغویات اور فاحشانہ افکار کی مترشح ہوتی ہیں۔ ان کا مقصد کوئی اعلیٰ معیاری نظر و فکر کی جستجو نہیں ہوتا بلکہ وقت کا ضیاع اور تصنع و بناوٹ کا فروغ ہوتا ہے۔

ان لغویات کے باعث جدید سوسائٹی میں ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں جو تعمیری ہونے کی بجائے غیر اخلاقی اور بغیر کسی مقصد کے فروعی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس قسم کی سوچ سیرت و کردار کی پاکیزگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اخلاقیات نبویؐ:

اخلاق نبوی جو آنحضورؐ کے افعال و اعمال پر مشتمل ہے انسانیت کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً مشعل ہدایت ہے۔ انسان کی نجات ایمان اور عمل صالح پر موقوف ہے۔ اور پیغمبر اسلام کی زندگی ان دونوں خوبیوں کی مرقع ہے۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ایمان اور عمل صالح بہت زیادہ فوقیت دی ہے۔

"لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں حالانکہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

عمل صالح کی حیثیت کو سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ان اصولوں کو جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے تو عمارت جس کا قیام و تزین مقصود ہے مکمل نہیں ہو سکتی۔

اسی لیے قرآن میں ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ ضروری قرار دیا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے۔

''کہ زمانہ (اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے۔'' سورہ العصر ۴۔۱

پھر ایک اور جگہ (سورہ والتین) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ لیکن انسان (اپنی بداعمالی کی وجہ سے) بہت گھٹیا درجہ میں گر جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے ان کے لیے اجر عظیم ہے۔''

پھر ہر اس شخص کی جو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے وہ جنت کا حقدار ہے متنبہ کر دیا گیا کہ جنت پر کسی کی اجاداری نہیں ہے اور وہی ایماندار اس کے حقدار ہیں جو نیک اعمال کرتے ہیں۔

(سورۃ بقرہ:۴)

پھر اس کا اعادہ سورۃ مائدہ:۱۹ میں اس طرح کیا گیا۔

بے شک جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے واسطے انکے بخشش ہے اور ثواب بڑا۔

اس آیت میں بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ فلاح و نجات کا انحصار اس بات پر نہیں کہ انسان کسی مذہب اور ملت سے منسلک ہے بلکہ اس کے ایمان اور اعمال صالح پر موقوف ہے۔

اعمال صالح کا ذکر قرآن کریم میں بار بار کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس غفلت اور خود فریبی سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ صرف خود کو مسلمان قرار دینا ہی کافی نہ سمجھیں بلکہ اعمال صالح کو اس کا ضروری جزو مانیں۔

ایمان کے ہوتے ہوئے عمل صالح محرومی تو محض ایک فریب ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے وہاں ایمان کی کمزوری بھی اسی نسبت سے دیکھنے میں آتی ہے۔

اخلاق نبوی کا مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی زندگی میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اخلاقیات کو دی اور اعمال صالح کو ہر صورت میں انجام دیا۔

سیرۃ النبی میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

''کہ عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے خصائل اخلاق، زہد و تقویٰ عصمت و عفان، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول اور فروغ انسانیت کے صحیح طریقہ سے قائم کیے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

پیغمبر اسلام آنحضورؐ کی حیات طیبہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم تھی۔ اس کی ہر جنبش ہزاروں تصنیفات کا کام دیتی ہے اور جس کا ایک ایک اشارہ اور امر سلطانی بن جاتا ہے۔۔

دنیا میں آج جو اخلاق کا سرمایہ ہے سب انھی نقوش قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوان عدن کے نقش و نگار ہیں۔ اگرچہ پیغمبر اسلام اور دیگر انبیاء کرام کا تمام کمالات و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے لیکن آنحضورﷺ کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی اس لیے بضرورت احوال آپؐ کے تمام کمالات نبوت آپؐ کی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر ہوئے اور آپؐ کی نبوت آفتاب علم تاب کی ہر کرن دنیا کے لیے مشعل ہدایت بنی۔ اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپﷺ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُرنور ہوا۔'' [۱]

اس لیے دیگر انبیاء کرام کے کمالات میں کسی قسم کی کسر ظاہر کرنا مقصود نہیں بلکہ ان تمام اخلاقی اقدار اور پہلوؤں کا احاطہ کرنا مقصود ہے جو ہر قدم اور ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کا سبب بنتے ہیں۔

ان تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ ہونا ہماری دینی اور مذہبی ضرورت ہی نہیں بلکہ علمی، ادبی اور اخلاقی ضرورت بھی ہے۔ ان اقدار کی وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ خوبیاں پیدا کرسکیں جو اعلیٰ اخلاق کی متقاضی ہیں۔

اخلاقیات نہ صرف مذہب بلکہ تہذیب و تمدن میں اور معاشرتی فلاح و بہبود میں بھی نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی ہمہ گیر حیثیت اس حقیقت سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی معاشرہ اس

۱۔ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سلمان ندوی ''سیرت النبی''۔ صفحہ ۱۸۳

وقت تک مہذب اور متمدن نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ ان خوبیوں کا حامل نہ ہو جائے جو حسن و سرور، پاکیزگی اور اعلیٰ انسانی واخلاقی روایات کی مظہر نہ ہوں۔ یہ خوبیاں انسان کے حسی، قلبی اور نفسی نظام پر بھی اثرانداز ہوتی ہیں۔ اور انہیں اپنی جلا بخشتی ہیں۔

اللہ نے انکی آگہی انبیائے کرام اور الہامی کتب کے ذریعہ دی اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد ایک ایسا نظام تشکیل کیا جو ہماری دنیاوی اور اخروی بقا کے لیے ضروری تصور کیا گیا۔ ان خوبیوں کی مقبولیت کے باعث یہ تمام مذاہب اور خطوں میں قدر مشترک مانی جاتی ہیں۔ ان کا اطلاق ہمہ گیر ہے اور کوئی معاشرہ ان کے بغیر مہذب اور متمدن کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ایسے مربوط اور مستحکم نظام کا عندیہ دیتا ہے جسکی ابتداء غالباً حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے ادوار سے ہوئی اور تکمیل اسلام کا اخلاقی سلسلہ ایک عظیم ارتقائی سلسلہ تھا جو بسلسل کئی صدیوں کی الہامی، اخلاقی اور جمالیاتی کاوشوں سے تشکیل و تکمیل کے مراحل طے کرتا ہوا قرآن کے اوراق اور آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں نمودار ہوا۔

ایک مفکر نے اسے جمالیاتی ارتقاء اور جہاد اکبر سے تعبر کیا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی کتاب ''فلسفہ حسن'' میں کہتے ہیں:

''کہ یہ جہاد اکبر یوں ہے کہ اسکی فتح و شکست پر انسان کی حقیقی و ابدی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفس امارہ ابلیس کے جمالیاتی فریب میں آکر اس کا دوست اور انسان کا دشمن بن کر جنگ جیت جائے تو نتیجۃً انسان ظالم، سرکش، مقہور و مغضوب، ملعون اور اہل نار بن جاتا ہے۔

اہل نار وہ فرماں نصیب گناہگار مختص ہوتا ہے جو طمانیت، نور، حسن و نور اور لذت زندگی سے محروم ہو۔ اور اس پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے۔

اگر نفس لوامہ اپنے جمالیاتی جہاد میں کامیاب ہو جائے تو وہ صاحب حسن و سرور ہو جاتا ہے۔ جسے اصطلاح قرآنی میں نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ نفس مطمئنہ ہی وارث و حیثیت اللہ تعالیٰ کا دوست و

Marfat.com

مقرب شاہد، منظور نظر، کامیاب و مثال انسان ہوتا ہے۔اس کی تصدیق قرآن مجید سورۃ نور آیت ۷ میں یوں فرماتا ہے۔

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا''

اور سورۃ فتح آیت ۴ میں یوں فرمایا گیا ہے:

''اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا ہے۔''

پھر سورۃ البقرہ (آیت ۱۳) میں ارشاد ہوا:

''کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے۔نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم''۔

ان آیات اور حقائق سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ کی نظر میں ایمان اور اعمال صالح لازم و ملزوم ہیں اور دینی و دنیوی کامیابی کا دارومدار ان کے یکساں امتزاج پر ہے۔

دونوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔اور صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا بغیر اعمال صالح کے کافی نہیں ہے۔فوز و فلاح کے لیے ایمان کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا نہایت ضروری ہے۔

یہاں تک کہ نماز بھی اس وقت تک سود مند نہیں جب تک کہ انسانی معاشرے کے پسماندہ مساکین، بیواؤں اور یتیموں کی فلاح و بہبود کے لیے عملی اقدام نہ اٹھائے جائیں۔ [1]

یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لفظ عبادت کو اسلام میں بہت وسعت حاصل ہے، اس کے اندر وہ عمل داخل ہے جسکا مقصد اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔اس لیے اخلاقیات و معاملات بھی اگر نیک نیتی سے کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔

عبادات اور اخلاقیات کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان میں اخلاص نہ ہو۔اسی لیے اکثر عبادات قلبی احوال اور نفسی کیفیات سے مترشح ہیں۔اس لیے تمام امور پر خواہ وہ جسمانی، مالی یا

۱۔ دیکھیے قرآن مجید سورۃ ۱۰۷: ۷۔۱

Marfat.com

قلبی ہوں عبادات میں شامل ہیں۔

اخلاص کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ذہنی، قلبی اور روحانی پاکیزگی اس کے بغیر ممکن نہیں آنحضرت ﷺ کی ایک مشہور حدیث (بخاری شریف) ہے کہ تمام اعمال کا انحصار انسان کی نیت پر ہے۔

اور تقویٰ بھی یہی ہے کہ ہر نیک کام کرتے وقت اور برائیوں کی مدافعت کی جدوجہد میں ضمیر کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ نفس لوامہ کام بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ نفس امارہ چونکہ خواہشات اور ترغیبات کے تابع ہوتا ہے اس لیے اعمال صالح کی ادائیگی میں مسلسل مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات انسانی ضمیر کی آواز کو ہی دبوچ لیتا ہے۔ اس لیے نفس لوامہ اور نفس امارہ میں مسلسل ایک جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اور اس جنگ میں کامیابی اس کی ہی ہوتی ہے جسکا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور جو اپنی خواہشات، شہوات اور جبلتوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے۔

اس لیے قرآن پاک میں عبادات کے ضمن میں پنجگانہ نماز کے بعد سب سے زیادہ زور اخلاقیات اور معاملات پر دیا گیا ہے۔ اور ان میں قابل ذکر امور تقویٰ، اخلاص، توکل اور صبر و شکر ہیں۔

یہ وہ اعمال میں جنھیں عبادات میں اسلام کی روح اور اخلاقیات کا جوہر کہا جاسکتا ہے انسانی زندگی خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے بے روح رہتی ہے اگر اس میں یہ خوبیاں موجود نہ ہوں۔

ان خوبیوں کا ادراک اور حصول انسانی معاشرے اور تہذیب و تمدن کے حسن و جمال کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔

اعمال صالح کا ادراک اور اس کا شعور اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں حکمت و برکت کے خزینے پوشیدہ ہیں۔ بدکاری اور برے قبیح افعال کرنے سے انسان کی کچھ جبلتوں اور خواہشات کی تو تسکین ہو جاتی ہے لیکن وہ بالآخر ایسے بدنما داغ چھوڑ جاتے ہیں جو نہ صرف شخصی زندگی بلکہ معاشرتی زندگی کو بھی شرمناک کرتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات میں ایک حکمت پوشیدہ ہے اسی طرح اس بیان سے بھی اس کی اہمیت عیاں ہوتی ہے یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نظام حیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دینی اور دنیوی

Marfat.com

زندگی کے مختلف پہلواس سے متعین ہوتے ہیں۔

اعمال صالح کے مسلسل عمل سے انسان صاحب حُسن و جمال بن جاتا ہےاوراس کے احسن اعمال کا پرتواس کی پوری شخصیت پر عیاں ہوتا ہے اس کی شخصیت پر اعتماد، چہرہ نورانی ہوتا ہے اس کی شخصیت میں سرور قلب اور طمانیت نفس کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

اعمال صالح کرنے سے ایک نور کا ہالہ وجود میں آتا ہے جو انسانی زندگی کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ ”بخارات اس کے ایک قبیح و سیاہ کار شخص اپنے حسن باطن کے باعث روسیاہ ہوتا ہے اوراس کی پیشانی اور آنکھیں بے نور ہوتی ہیں۔ ایسے شخص کی نظروں میں شیطان جلوہ فگن ہوتا ہے جو اپنے شاہد کی باطنی کیفیات کے مطابق اسے جمالیاتی فریب دینے کے لیے نئے سے نئے روپ دھارتا ہے۔

کیونکہ انسانی زندگی شیطانی اثرات سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے اس لیے یہ خطرہ ہمیشہ لاحق ہوتا ہے کہ انسان کی باطنی کیفیت بدلتی رہتی ہے اور حسن و جمال پہلو روسیاہی میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

مزید برآں انسان کا اپنا نفس خواہشات اور شہوات کا دائرہ وسیع کرتا رہتا ہے اور ان کی تسلی و تشفی کے لیے تمام بدکاری کے ذرائع پیدا کرتا رہتا ہے اور انہیں خوشنما اور مزین رنگوں میں زیادہ دلکش بناتا ہے۔

نیز یہ شیطانی اثرات ہماری تمام حسی۔ قلبی اور نفسی کیفیات کو اثر انداز کرتے ہیں اور تمام انسانی نظام اخلاقیات اس سے متاثر ہوتا ہے اس لیے ان تمام کیفیات کا جائزہ لینا ضروری ہے جو ہماری زندگی کا رخ بدلتی ہیں۔

ہمارے اکثر اعمال وافعال کا انحصار ہماری اپنی حسی ونفسی کیفیات وخواہشات اور چیلنجوں پر ہے جو ہمارے نفس میں ودیعت کردی گئی ہیں ساتھ ہی وہ تمام ذرائع بھی مہیا کر دیئے گئے ہیں اور راہیں بھی متین کردی گئی ہیں جو ہمیں حسین وقبیح بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

ان کیفیات میں چند قباحتیں اتنی گھناؤنی ہیں کہ وہ فوری طور پر ہماری قوت مدافعت کو مضمحل کر دیتی ہیں اور ہمارے اخلاقیات کو پراگندہ کر دیتی ہیں ان سے بچ کر ہی ہم اپنی اخلاقی اور جمالیاتی سطح بلند

Marfat.com

کر سکتے ہیں۔ اسلام کا فلسفہ اخلاق اعلیٰ خلق و کردار اور تہذیب و تمدن کا مرقع ہے۔ اس کا جمالیاتی ذوق انسان کے نور حسن کا ارتقاء ہے۔ اور اسکا بتدریج عمل ہی حسن حیات ہے۔ اور ہمیں براہ راست ان کے زیر اثر کر دیتے ہیں اس کے نتیجہ میں خواہشات اور شہوات انسان پر قابو پالیتی ہیں اور اسے ان تمام بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہیں جو اس کو اخلاقی طور پر نحیف کر دیتی ہیں ان میں بدکاری، نفسی بے راہ روی اور قبیح پسندی سب سے بدترین افعال ہیں'' دیگر سلبی کیفیات میں قابل نفرت یہ ہیں۔ بے غیرتی، ہوس پرستی، شقاوت قلبی، ظلم، شرک، کینہ وعداوت، تکبیر واحساس کمتری وغیرہ ہیں۔

بہر حال ان تمام کیفیات کا دوبارہ اعادہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان برائیوں سے بچ سکیں جو ہماری شخصیت کو بدنما بناتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس صورت میں ہمیں پیدا کیا ہے ہم اسے خوبصورتی سے اختیار کر سکیں۔ سورۃ والتین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' کہ میں نے انسان کو ایک اچھی صورت میں بنایا ہے لیکن وہ اپنی بدکاریوں سے اپنی شکل کو خود بگاڑ دیتا ہیا اور پھر وہ جانوروں کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔''

یہ غور وفکر کا مقام ہے اور زندگی میں حُسن اور مقصدیت پیدا کرنے کا چیلنج ہے۔ یہاں ان قباحتوں سے بھی بچنے کا شعور ہونا ضروری ہے جو ہمیں اپنی طرف مائل کرتی ہیں اور ہمارے دامن کو داغدار کر دیتی ہیں یہاں اس تصادم سے بچ نکلنے کی قوت کو مضبوط کرنا بھی ضروری ہے جو معروضی حُسن کو قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ فطرت کی قائم کی ہوئی قدرتی صورت وہی شخص برقرار رکھ سکتا ہے جس میں اپنی فطری حسین حالت میں لوٹ آنے کی اضطراری امنگ ہوتی ہے۔ یہ امنگ انسان کے قلب کے فطری حسین انقلاب سے عبارت ہے''

یہ انقلاب تب ہی پیدا ہوتا ہے جب انسان ان تمام اقدار کا شعور ذہن نشین کر لیتا ہے اور اسکی زندگی میں قرآن، اخلاقیات اور تہذیب و تمدن کے دریچے کھلتے ہیں اور اسکی زندگی انکے مطابق ڈھلتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

﴿باب ۱۴﴾

اسلام اور جدیدیت

اسلام: ایک روشن خیال ضابطہ حیات

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ط ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ط فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ لا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ٥
(سورۃ ۵:۳)

''آج ہم نے تمہارے لیے مذہب کو ایک ضابطہ حیات کے طور پر مکمل کر دیا ہے۔ اور (اس شکل میں) اپنی نعمت بدرجہ اتم پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو مذہب کے طور پر منتخب کیا ہے۔''

اسلام کا ایک مذہب اور ضابطہ حیات کے طور پر انتخاب ایک ایسی نعمت ہے جسکا ذکر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس آیت میں قدرے کیفیت سرور میں کیا ہے۔

اس کا ذکر اور احساس اس لیے بھی ضروری سمجھا گیا کہ مذہب کی غایت اور کلام الٰہی کا مقصد واضح طور پر بیان کر دیا جائے۔ تا کہ لوگوں پر اس کی اہمیت واضح ہو جائے اور انہیں اس کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہو۔

لیکن اس بیان کے ساتھ یہ بھی وقتاً فوقتاً واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان پر کوئی چیز زبردستی ٹھونسی نہیں گئی ہے بلکہ اسے اس کا مکمل اختیار دیا گیا ہے کہ عقل اور خرد کے ساتھ اس کے تمام پہلوؤں کو پرکھے اور

Marfat.com

تب اپنے انتخاب کا فیصلہ کرے۔ انسان کے لیے تمام دریچے، نیکی اور بدی، تنزل اور فلاح کے راستے ظاہر کر دیئے گئے ہیں اور فیصلہ اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسے بتا دیا گیا ہے ''لا اکراہ فی الدین'' کہ دین میں کسی قسم کا جبر یا زبردستی نہیں ہے۔

یہ انسانی فطرت اور مذہب کی روح کے خلاف ہے کہ کوئی چیز زبردستی اسے اس پر ٹھونس کر قبول کرائی جائے۔ اس لیے مذکورہ بالا آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ ایک نعمت کے طور پر ہے اور تمہاری اپنی فلاح و بہبود کے لیے ہے۔

قرآن: سورۃ ۲:۲۵۶

اس آیت کی اہمیت موجودہ دور میں خصوصاً زیادہ واضح ہو جاتی ہے جہاں مختلف نظریات کی بھرمار ہے اور ہر نظریہ اپنی اہمیت اپنی افادیت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے مذہب اسلام کا نظریہ انتہائی افادی ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و خرد پر بھی مبنی ہے اور تمام مثبت اور منفی پہلو کھول کھول کر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں (۵:۳) اور دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کیا ہے کہ دین اسلام کی بدولت ایک ایسے فیضان ربوبیت کی صورت پیدا کی گئی ہے جو انسانیت کے لیے ازلی و ابدی افادیت کا باعث ہے۔ اس کے ذریعہ روحانی اور اخلاقی سطح پر نہ صرف انسان کی مکمل تربیت ہوتی ہے بلکہ معاشرتی لحاظ سے بھی یہ وہ ڈھانچہ تیار کرتا ہے جو آگے چل کر تہذیب و تمدن کے پھول کھلاتا ہے۔

مذہب اسلام کی رحمتوں اور برکتوں کا سلسلہ لامتناہی ہے اور یہ پیغمبروں۔ اولیائے کرام اور مفسرین سے ہوتا ہوا عوام الناس تک پہنچا اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں آیا۔

تاریخ انسانیت ایسے نظریات سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے مختلف ادوار میں مختلف منازل کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن مذہب اسلام ایک ایسا نظریہ ہے جس کے ہزاروں برسوں سے ایک ہی راہ کا تعین کیا ہے اور وہ راہ مستقیم ہے راہ مستقیم پر چلنے سے مراد فطرت انسانی پر چلنا ہے اور اس کے بنیادی تقاضے پورا کرنے ہیں۔

جب انسان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ راہ (مذہب) جو اس کے لیے مستعین کی گئی ہے اس کے لیے

باعث رحمت و برکت ہے تو وہ اس پر غور وفکر کرتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے۔ جو لوگ اس کی روشنی میں اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں اور جو منکر ہوتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ ولا میران الانسان بنی خسر۔ بیشک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالح کرتے ہیں۔

(قرآن۔ سورۃ العصر)

اب اعمال صالح کا فلسفہ نظام حیات کی بقا کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انسانی زندگی کے لیے ہوا۔ روشنی اور پانی اگر اسلام اعمال صالح کا درس دیتا ہے تو یہ کس طرح عقل انسانی کے خلاف ہو سکتا ہے۔ یہ عمل بذات خود فطرت انسانی کے مطابق ہے اور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ معاشرے میں امن، عدل اور فلاح و بہبود کی راہیں ہموار کی جائیں اور انہی تقاضوں کو پورا کرنے کا نام راہ مستقیم ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے ہمکنار کرتی ہے جسکا ذکر اوپر آیت نمبر ۳: ۵ میں کیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اختلاف جو خصوصاً موجودہ دور میں لادینی حلقوں کے درمیان پائے جاتے ہیں غیر ضروری اور کسی حد تک خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔

جب اسلام کہتا ہے کہ وہ ایک ایسی راہ متعین کرتا ہے جو فطرت انسانی کے مطابق ہے تو اسے عقل و خرد کے پیمانے پر بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ آیا واقعی یہ حقیقی طور پر سچ ہے اگر ان تمام عوامل کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کا دعویٰ ایسا دعویٰ نہیں جو حقیقت کے مطابق نہ ہو۔

یہ انسان کی فطرت سلیم ہے کہ وہ بیمار نہ ہو اور اپنی ہی کئی بیماریاں انسان کو اپنی زد میں لے لیتی ہیں اگر وہ نظام حیات کو اس ضابطے کے مطابق متعین نہ کرے کہ جو عقل سلیم فطرت انسانی کے مطابق ہے اس لیے قرآن حکیم کی زبان میں ہر ایسی چیز کو جو انفرادی اور معاشرتی اعتبار سے درست اور صحت مند ہو اسے معروف کہا گیا ہے اور یہ خوبیاں انسان کو ایک صحیح ضابطہ حیات پر عمل کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ اور وہ ہر چیز جو انسان کی فطرت سلیمہ کے خلاف ہو وہ منکر ہو گی اور اسلام اسے رد کرتا ہے اس معروف و منکر کا امتیاز ایک ایسا پیمانہ ہے جو راہ مستقیم پر چلنے کے لیے اس کا انتخاب ممکن بناتا ہے اور ہمیں

Marfat.com

ان تمام گھناؤنی گھاٹیوں سے دور رکھتا ہے جو روحانی اور معاشرتی امراض کا سبب بنتی ہیں۔

لیکن یہ انتخاب اتنا آسان نہیں ہے۔اس کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہوتی ہیں انسان جبلی رجحانات، خواہشات اور خیالات اور ماحول کی غلاظتیں راہ مستقیم کے انتخاب کو مشکل بنا دیتی ہیں اور انسان اس راہ سے بھٹک جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جدیدیت اور مغرب کی نئی روشنی اور لادینی حلقوں کا اثر رسوخ حالات کا دھارا دوسرے رخ میں تبدیل کرتا نظر آتا ہے۔

خصوصاً نوجوان نسلوں پر ان کے اثرات جلد اپنے منفی نتائج کے ساتھ نمودار ہوتے نظر آتے ہیں موجودہ دور کا تہذیب وتمدن کا غیر اخلاقی پہلو ان شعبہ ہائے حیات اُبھر کے نظر آتا ہے جو مذہب سے دور اور نئے جدید کلچر سے نزدیک ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں چونکہ ترجیحات زیادہ تر خواہشات کے تابع ہیں اس لیے اس راہ مستقیم پر چلنا مزید مشکل ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ قرآنی شعور رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا ادراک رکھتے ہیں وہ اس راہ سے شاذ و نادر ہی بھٹکتے ہیں اور اکثر بھلائی اور نیکی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جدید دور میں نیکی اور بھلائی کا شعور جو مذہب نے ہمیں دیا ہے اس پاکیزگی اور شدومد سے نہیں اپنایا گیا ہے جس کا کہ وہ متقاضی تھا۔ مارکس اور ڈارون کے نظریات نے خیالات اور رجحانات کا دھارا غیر مذہبی سمت میں منتقل کر دیا اور لوگوں کی اکثریت خصوصاً مغربی ممالک میں مذہبی شعور سے بے بہرہ ہوگئی۔ اس کے علاوہ تاریخی عوامل اور عیسائیت کا سخت رویہ بھی مذہب سے دوری کا باعث بنا۔ چونکہ عیسائیت نے تمام وہ نظریات مسترد کر دیئے جو سائنس اور عقل وخرد کی بنا پر وجود میں آئے تھے اس لیے مغربی ممالک کی اکثریت مذہب سے بدظن ہوگئی اور لادینی رجحانات سے متاثر ہوئی۔

اس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ مذہب کی اصل صورت مسخ ہوگئی اور اس کی خوبیاں پس پشت ڈال دی گئیں۔ عیسائیت کیساتھ ساتھ دوسرے مذاہب یعنی یہودیت اور اسلام بھی اس کی زد میں آ گئے۔ اسلام خاص طور پر بہت زیادہ فکری اور نظری بوچھاڑ میں آیا اور 9/11 سے تو اس پر متواتر ایسے حملے کئے گئے کہ اس کی نعمتیں اور رحمتیں جو تمام عالمین کے لیے ہیں کہیں نمودار ہوتی نظر نہیں آئیں۔

Marfat.com

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ غلطیاں مذہبی حلقوں سے بھی ہوئیں اور تعصب وتشدد اور انتہا پسندی کی دیواریں راہ میں حائل ہوتی گئیں جس کے باعث اسلام کا اصل تشخص جو کہ رواداری، فیاضی اور رحمدلی پر مبنی تھا بری طرح مسخ ہوا اور تا حال وہی صورت حال موجود ہے۔

مسلمان مفکرین ذرائع ابلاغ اور اہل قلم اس سلسلے میں وہ رول ادا نہیں کر سکے جس کے ذریعے اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کیا جا سکتا ان تمام عوامل سے روح اسلام اور خصوصاً وہ خوبیاں جن کی وجہ سے اسلام جانا پہچانا جاتا تھا بری طرح مجروح ہوتی نظر آتی ہیں۔ اسلام کے ایک مغربی مفکر محمد اسد نے اپنی کتاب شاہراہ مکہ میں اس امر کی اور اس کے مضمرات کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جب میں غور کرتا ہوا اس حد تک پہنچا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ زیر اور زبر کی قوم (عرب) اپنے آپ کو ان خطرات سے کب تک محفوظ رکھ سکے گی جو ہزار حیلہ اور فریب کے ساتھ ان کا محاصرہ کر رہا ہے۔ اور بغیر کسی مروت اور رعایت کے اس پر مسلط ہونے والا ہے۔ ہم ایک ایسے زمانے میں سانس لے رہے ہیں جس میں مشرق کو بڑھتے ہوئے مغرب کے اثرات بے بس کر دیا ہے خاموش اور غیر جانبدار تماشائی بن کر باقی نہیں رہ سکتا۔ ہزاروں سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی قوتیں اس وقت عالم اسلام کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ کیا عالم اسلام مغربی تہذیب کے سامنے ہتھیار ڈال کر اس اختلاط ومقابلے کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اپنی روایاتی شکل کھو دے گا بلکہ اپنی روحانی جڑوں اور سر رشتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔'' [۱]

مسلمانوں کی زبوں حالی (جس کا ذکر) قرآن سے غفلت اور موجودہ علوم سے ناواقفیت کی بنا پر ہے تو غلط نہیں ہوگا میں نے خود اپنی ایک نئی کتاب (مسلمانوں کا زوال) میں ان تمام عوامل کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جو کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث ہے اور تا حال ترقی اور فلاح وبہبود کی راہ میں حائل ہیں۔ [۲]

یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کے پیغام کو صحیح انداز میں نہ سمجھا اور نہ اس پر عمل کیا ہے

۱۔ محمد اسد۔ Road to Macca صفحہ ۱۰۴۔۱۰۳

۲۔ ان تمام عوامل کا تذکرہ اقبال سیدؔ نے اپنی کتاب ''مسلم امہ کے زوال'' میں کیا ہے۔

Marfat.com

اس لیے وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں تنزل پذیر ہوئے اور اب بے کسی اور بے بسی کی حالت میں متذبذب ہیں۔

ان حالات میں جدید دور کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنا اور مذہب اور سیکولرزم کے اختلافات کو مزید الجھانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھائے بغیر حالات مزید بدتر ہو جائیں گے اور مسلمان وہ مقام حاصل نہ کر پائیں گے جس کے لیے قرآن نے انہیں پکارا ہے۔

یہ درست ہے کہ انسان کا جسم اور اس کی نفسانی خواہشات اسے زیادہ سیکولرزم کی جانب دھکیلتی ہیں لیکن مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار کا ایک اپنا مقام ہے جو ہر معاشرے میں قابل قدر اور تشکیل و تکمیل کے لیے قائمکیا گیا ہے قرآن نے ان دونوں (مذہبی اور سکولر) کے درمیان ایک متوازن زندگی گزارنے کا سبق دیا ہے۔
دیکھیے مسلم امہ کا زوال سے[1]

یہ قابل افسوس امر ہے کہ پچھلی صدی میں یہ (مذہبی۔ اخلاقی اور روحانی) پہلو۔ ڈارون۔ مارکس اور دیگر مغربی مفکرین کے لادینی نظریات کے سبب زیادہ ہی سیکولرزم کی زد میں آ چکے ہیں اور دنیاوی زندگی کا ایک متوازن اور حسین مقام جس کا تصور قرآن نے دیا تھا اب قانونی حیثیت میں چلا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم کا پیغام اپنی جگہ حکمت وبصیرت سے بھرپور ہے اور تمام لادینی حملوں کے باوجود ایک حقیقی مقام رکھتا ہے۔ لیکن ضرورت اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مذہب کی راہ میں خود مذہب کے دعویدار حائل ہوتے رہے ہیں۔ عیسائیت نے سائنس کے ابتدائی دور میں یہ طور طریق اپنایا تھا کہ جو چیز بھی عقل اور خرد کے پیمانے پر ناپی جاتی اسے بری طرح رد کر دیا جاتا اور نہ صرف یہ کہ رد کر دیا جاتا بلکہ اس کے مفکر یا سائنسدان کو سخت سزا بھی دی جاتی۔ کئی سائنسدانوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا گیا کیونکہ ان کے خیالات اور نظریات عیسائیت کے بنیادی اصولوں کے منافی تھے۔

1- (The Decline of Muslim Ummah by Iqbal Syed Hessain,)

Marfat.com

اوراب کم وبیش یہی صورت حال پاکستان جیسے مسلم ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں ملائیت ہر اس چیز کا مخالف نظر آتا ہے جس کا تعلق عقل ودانش، علم اور سائنس یا عصری تقاضوں کے مطابق ہو۔ وہ ایسی تمام کاوشوں کو جو دنیاوی حالات کو بہتر بنانے کے لیے کی جائیں یا سائنس اور تحقیق کی دنیا میں منسلک ہوں رد کردیتے ہیں۔

قرآن کا علم جو دنیاوی امور سے متعلق ہے ان کی عقل میں نہیں آتا۔ وہ رہبانیت کے زیادہ نزدیک اور اسلام سے قدرے دور نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک انتہائی متوازن اور عقل ودانش پر مبنی دین ہے۔ یہ ایک کامیاب اور قابل عمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اسلام دنیا اور اسکے امور اور علوم سے دور رہنے کے لیے کبھی نہیں کہتا۔ لیکن ہمارے کم علم جو سنی سنائی روایات اور خرافات میں دھنسے ہوئے ہیں ان سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور جدید حقائق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور نتیجتاً تعصب تشدد اور تنگ نظری کا شکار ہوتے ہیں اور عام لوگوں کو بھی اسی گرداب میں مبتلا رکھتے ہیں۔

مغرب میں تو سائنس، فکرو نظر اور علم وتحقیق کا سلسلہ تیزی سے بڑھتا گیا اور یورپی فرانسیسی صنعتی اور سائنسی انقلاب نے اس میں مزید جان پیدا کردی اور پادریوں کو پسپا ہونا پڑا جس کے نتیجہ میں انیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس اور جدید علوم کو بہت زیادہ فروغ ملا وہاں مذہبی رجحانات کے پھیلاؤ میں کمی آئی اور چرچ کو سخت دھچکہ پہنچا۔ سیاست مذہب سے علیحدہ ہوگئی اور چرچ کا حلقہ اثر گرجا گھروں تک ہی محدود ہوکر رہ گیا۔ اس کو دیکھ کر ایک مغربی مفکر نے کہا کہ ”خدا مغرب کے لیے خدا کی ہستی سب سے زیادہ سیاسی اہمیت کی حامل تھی۔

اور اس کا سیاسی اور سماجی میدان سے نکالے جانے سے معاشرے اور سیاسی ڈھانچہ کے لیے خطرناک نتائج پیدا ہوئے“

اس طرح مغربی ممالک میں ایک ایسی فضا قائم ہوگئی جس میں مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں میں نہ صرف ذہنی اور فکری تصادم ہوا بلکہ رجحانات بھی مختلف سمتوں میں کام کرنے لگے۔ ہر ایک نے دوسرے کو موردالزام ٹھہرایا اور اپنے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ لیکن زیادہ نقصان مذہبی حلقوں کو پہنچا کیونکہ وہ

Marfat.com

عقل وخرد کے پیمانے پر اپنے موقف کا دفاع نہیں کرسکے۔‘‘ [۱]

اب یہی صورت حال مسلم ممالک میں ہے جہاں ملائیت اپنے روایتی انداز میں عقل ودانش سے بے بہرہ ایک ایسے موقف کا پرچار کررہی ہے جو کہ نہ صرف عقل وخرد سے بے بہرہ بلکہ زندگی کے موجودہ تقاضوں اور قرآن حکیم کی حکمت اور بصیرت سے بھی تہی ہے۔

اس تغیر وتبدل اور انقلاب کی دنیا میں اپنی ضد پر قائم رہنا اور عقلی دلائل سے منہ پھیرنا کہیں کی دانشمندی نہیں ہے اور یہ موقف ہمیں اپنے فکر ونظر سے نہ صرف معذرت کرتا ہے بلکہ اس مقام سے بھی دور رکھتا ہے جو قرآن حکیم نے ہمارے لیے متعین کیا ہے۔ قرآن اس دنیا کی زندگی کو بھی اتنی ترجیح دیتا ہے جتنی کہ آخرت کی زندگی کو۔ اسی لیے قرآن فرماتا ہے کہ دعا کرو تو پہلے کہو ’’ربنا اتنافی الدین حسنۃ‘‘ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس دنیا میں بہتری عطا فرما۔

مغرب میں ذہنی افق پر چونکہ علم وعقل کی یہ روشنی جلد نمودار ہوگئی حالانکہ حقیقت میں روشنی سب سے پہلے قرآن حکیم نے انسانیت کو دی تھی لیکن چونکہ مسلمان آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے گئے اور آخر کار اندھیرے اور غفلت میں غرقان ہوگئے۔ سائنس، تحقیق اور جستجو کی تلاش میں مغرب نے انسانی اور قدرتی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جس کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے دنیاوی پستی کو اپنا مقدر بنالیا اور کہا کہ وہ آخرت میں اللہ کی نعمتوں سے نوازے جائیں گے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو اس زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کہا ہے اور اسی زندگی کے ذریعے آخرت کی بہتری مشروط کی گئی ہے جو اس زندگی میں ایمان نہیں لائے گا اور نیک اعمال نہیں کرے گا اس کے لیے آخرت میں بھی کوئی حصہ نہیں ہے۔ بہرحال مشکل یہ ہے کہ ان حقائق کو کھلے دل ودماغ سے نہیں سمجھا جاتا اور ان کو عملی زندگی بہتر بنانے کے لیے نہیں اپنایا جاتا اور یہی مشکل مسلمانوں کو پسماندہ رکھے ہوئے ہے۔

مغرب نے اپنے جدید ترقی یافتہ لائحہ عمل اور فروغ علم وہنر کے ذریعے نہ صرف اس زمین پر اپنا علم بلند

۱۔ مائیکل ہیرنگٹن Michal Harrington

Marfat.com

کر دیا بلکہ ستاروں پر بھی کمند ڈال دی ہے ان کا اثر ورسوخ اب مسلم ممالک میں بھی بری طرح پھیل گیا ہے۔ کیا صنعت وحرفت کا میدان ہو یا علوم وفنون کی جستجو ان کی رہنمائی ہر جگہ تلاش کی جاتی ہے یہاں تک کہ روزمرہ کی معاشرتی اور ثقافتی امور میں بھی ان کے اثرات نظر آتے ہیں۔

شعبہ تعلیم خاص طور پر مغربی طرز تعلیم سے متاثر ہوا ہے انگریزی زبان کا اثر اور مغرب میں ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کا اثر مسلم ملکوں میں بہت تیزی سے پھیل رہا ہے مجموعی طور پر ایک ایسی فضا قائم ہوگئی ہے کہ مغربی ممالک کی نقل کئے بغیر کوئی چیز وقوع پذیر نہیں ہوتی۔

یہاں تک کہ اخلاقی ثقافتی اور معاشرتی اقدار بھی اس کی زد میں آچکی ہیں اور نوجوان خاص طور پر مغربی موسیقی، کلچر اور فیشن کے پرستار بن گئے ہیں۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے درآمد کی گئی ہو مارکیٹ میں بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

تجارت وصنعت، تہذیب وتمدن کے میدان میں ایک تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ اس نے مسلمانوں کی روایاتی اور تہذیبی اقدار کی شکل بدل دی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب ''آج مشرق وسطیٰ'' میں لکھتا ہے۔ [۱]

''دوسری جنگ عظیم کے بعد بہت سے روایتی اثرات تیل کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت کی وجہ سے کمزور ہوگئے ہیں (ان کے ساتھ مغربی طاقتوں کے اثرات بھی شامل ہیں)

قدیم مشترک تہذیبی ورثہ جس نے مختلف طبقات کو مربوط کر رکھا تھا اب ختم ہوتا جارہا ہے۔

عرب یشوخ جو تیل کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں اب مغربی مصنوعات اور تہذیب وتمدن سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس نے ان طبقوں میں بدسکونی پیدا کردی ہے جو اس طرح کا طرز زندگی اپنانے کا اختیار نہیں رکھتے۔'' [۲]

۱۔ ڈان پریٹز (Don Peretz)۔ صفحہ 103 ''The Middle East Today''

۲-Don Peretz "The Middle East Today P-103-104

Marfat.com

یہ حقائق چند ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو مسلمانوں کے زوال کے باعث بنے اور تاحال ان کے انحطاط کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اصل زوال اس وقت سے شروع ہوا جب سے مسلمان اپنی الہامی کتاب قرآن حکیم سے غافل ہوئے اور عیش پرستی میں مبتلا ہو گئے اسی طرح وہ زندگی کا مقصد بھول گئے اور انہوں نے قرآنی احکامات کو پس پشت ڈال دیا۔

قرآن سے غفلت اور مغربی تہذیب وتمدن کے اثرات مذہب سے دوری میں بھی نمودار ہوئے۔ روایتی طور پر مسلمان جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک ہوتے تھے آہستہ آہستہ اس معیار سے گرتے گئے اور اب فریب، جھوٹ اور وعدہ خلافی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ عیش وعشرت اور مالی مفادات کے لیے ہر قسم کی گراوٹ کے مرتکب ہونے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ اسلام جس کے پیروکار ہونے کا دعویٰ مسلمان کرتے ہیں کیا سبق دیتا ہے اور عملی طور پر اس کی کتنی ناقدری ہوتی ہے۔

مغرب کی اکثریت تو پہلے ہی اس فریضے سے آزاد ہو چکی ہے اب مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے کوشاں ہیں۔

بہر حال خوش قسمتی سے کچھ ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جو سنجیدگی سے اسلام کے احکامات پر عمل کرنا چاہتے ہیں لیکن کٹر اور کم علم حلقے انہیں تعصب تنگ نظری اور انتہا پسندی کے ناپسندیدہ اور غیر ضروری جھمیلوں میں گھسیٹ لیتے ہیں اور اس طرح اسلام کی صحیح روح اپنانے کی بجائے ایک مسخ شدہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس سے نہ صرف وہ اسلام کے صحیح اصولوں پر عمل نہیں کر پاتے بلکہ ایک ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں جو اسلام کے تشخص کو مسخ کر دیتا ہے۔

مغرب کے سیاستدان، ذرائع ابلاغ اور مشرقین اس صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔

بہر حال چونکہ عیش پرستی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ مغربی تہذیت وتمدن کے اثرات اور رجحانات کو مزید تقویت دے رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ روح اسلام کو سمجھا جائے اور اسے

Marfat.com

اپنی فکری اور عملی زندگی میں اپنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم (۷۰ :۶:۷) میں آدمی کو متنبہ کرتا ہے۔ کہ "یہ زندگی ہم نے تمہیں کھیل کود کے لیے نہیں دی"۔

تو زندگی کو کیوں بیکار مشغلوں میں گزارا جائے اور ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جس پر چل کر آدمی اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

قرآن حکیم۔ سورۃ ۷۰:۶

بہرحال فطری طور پر انسان کی سرشت برائیوں اور بداعمالیوں پر مبنی ہے اس لیے کلام الٰہی کا اثر ان پر کم ہی ہوتا ہے اور آدمی دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنی آخری حد کو چھو لیتا ہے۔

لیکن چونکہ ایک اچھے اور سچے مسلمان کا زندگی کا لائحہ عمل ایک لادینی آدمی کی زندگی سے قدرے مختلف ہوتا ہے اس لیے وہ جدیدیت کی دلکشی کے باوجود پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور ان تمام برائیوں سے اجتناب کرتا ہے جن کے باعث وہ سزاوار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے مذہب کا تصور دین سے مختلف نہیں ہے اور وہ روزمرہ زندگی کو محیط کرتا ہے تاکہ زندگی کا دھارا صحیح رخ میں چل سکے۔

لیکن اس کے برعکس مغرب میں مذہب کا تصور خاصا تبدیل ہو چکا ہے اور اب عیسائیت کا عام آدمی کی روزمرہ زندگی میں وہ عمل دخل نہیں جو کہ پاکستان یا سعودی عرب میں ایک عام مسلمان کی زندگی میں ہوتا ہے گزشتہ صدی میں خصوصاً فلسفہ اور نظریات میں ایسا تغیر آیا ہے کہ مغرب میں زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا ہے۔ عوام کی اکثریت نے دین کو خیرباد کہہ دیا ہے اور مادہ پرستی اپنے نکتہ عروج پر ہے۔ اچھائی اور برائی کے لیے اگرچہ سماجی فلاح و بہبود کا پیمانہ تو ہے لیکن اخلاقی اقدار کا قدرے فقدان ہے اور اخلاقیات اس شکل میں نہیں پائی جاتی جو کہ اسے مسلم معاشرے میں حاصل ہونی چاہیے۔

جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے وہ ایک دین کے طور پر ابھرا ہے یہ نہ صرف انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کا تصور دیتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی قدروں کو بھی مستحکم بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

Marfat.com

یہ انسان کے لیے ہدایت اور نور سے روشن کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مذہب اسلام کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''ہم نے تمہارے لیے تمہارے مذہب کو مکمل کر دیا ہے۔ اور (اس شکل میں) میری رحمت تمہارے لیے بدرجہ اتم پوری کردی گئی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو مذہب کے طور پر منتخب کرلیا گیا ہے۔'' (قرآن: ۵:۳)

آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ایک نور ہے (یعنی روشنی کا منبع) اور یہ اسی کو عطا ہوتا ہے جس کا دل اللہ اس کے لیے کھول دیتا ہے:

(سورۃ النور: آیت ۴۰)

یہ ایک قلبی، روحانی اور ذہنی تغیر ہے جو اس نور کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے یہ ایک انقلابی عمل ہے جو اس پیغام کے ذریعہ وجود میں آتا ہے۔

چونکہ مذہب کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے قابل عمل اقدام ہیں اس لیے ''تمام آسمانی مذاہب اپنی حقیقت اور اصل میں انسانی انقلابات ہیں جن کا مقصد انسان کی رفعت و بلندی اور خوشحالی ہے اور مذہبی مفکروں کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کے اس جوہر اور حقیقت کی حفاظت کریں اور عوام کو اس سے آشنا کریں۔

اس لیے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ مذہب انسان کی ہدایت، روشنی اور فلاح و بہبود کے لیے وضع کیا جاتا ہے اور جو مذہب اخلاقی اور روحانی اقدار اور سماجی اور معاشرتی فلاح و بہبود سے تہی دامن ہوتا ہے وہ مذہب کہلانے کے لائق نہیں اور نہ ہی وہ زندگی کا لائحہ عمل (دین) مرتب کرسکتا ہے۔

مختلف مذاہب کے فروغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء مبعوث فرمائے اور ان مذاہب کے اثرات (نور) طبعی معجزات اور فوارق کے ذریعہ لوگوں کے ذہن اور قلوب پر نقش کئے۔ کیونکہ اس دور میں عقل وخرد کا پیمانہ قدرے نچلی سطح پر تھا اس لیے مابعد الطبعاتی عوامل کا سہارا لیا گیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اگرچہ انبیاء کرام افسوں سازی اور ساحری میں اتنے طاق نہیں تھے جتنے کہ اس وقت کے جادوگر اور حیران کن کرتب دکھانے والے ساحر لیکن چونکہ ان کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے تھا اس لیے وہ بھی

Marfat.com

ایسے کمال کے معجزات دکھاتے رہے جن کے سامنے جادوگر بے بس نظر آئے۔ اور انبیاء کرام (جیسا کہ حضرت موسیٰ) اپنے مذاہب کی صداقت کو قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ لیکن اس کے باوجود عوام کی اکثریت نے ان کے پیغام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

آنحضورؐ کی بعثت کے بعد قرآن مجید نور اور رشد و ہدایت کا پختہ اور دائمی پیغام لیکر نمودار ہوا اور تاریکی کے دبیز پردوں کو چیرتا ہوا راہ راست تسلسل سے انسان کی عقل سے ہم کلام ہوا۔

انسان کی عقل کا عمل اس لیے بھی ضروری محسوس ہوا کہ جلد ہی ایک ایسا سورج طلوع ہونے والا تھا جو جہالت اور کہانت کی گہری تاریکیاں چیرنے والا تھا۔ اس لیے اور معجزوں کے مطالبوں کو رد کر دیا گیا اور معجزہ نمائی سے پرہیز کیا گیا۔ قرآن حکیم ہی کو ایک بہت بڑے معجزہ کے طور پر پیش کیا گیا۔

یہاں یہ حقیقت بھی عیاں ہونا مقصود تھی کہ جبکہ معجزے وقتی طور پر تو انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال سکتے ہیں لیکن وہ اچھائی اور برائی میں امتیاز کا وہ میار قائم نہیں کر سکتے (جسے قرآن فرقان کا نام دیتا ہے) جو ایک پختہ کسوٹی کے طور پر کام دے سکے۔

اس لیے جب آنحضورؐ سے معجزات طلب کئے گئے جس کا ذکر قرآن کی سورۃ اسرائیل ۹۳:۹۲ میں کیا گیا ہے تو آپ کو فرمایا گیا کہ ''کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں''

(سورۃ بنی اسرائیل: ۹۴)

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ آنحضورؐ کو معجزات سے بالکل نوازا نہیں گیا۔

قرآن کی سورۃ القمر آیت نمبر ۱،۲ کہتی ہے۔

''القمریت الساسه الشق''

اور چاند شق ہو گیا اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں کہ یہ ہمیشہ کا جادو ہے یہ قرآنی آیات اور معجزات سے احتراز یہ ظاہر کرتا ہے کہ آنحضورؐ کی بعثت کے ساتھ خرد و عقل کا ایک نیا باب شروع ہونے والا جس نے آگے چل کر فکر و نظر کی سطح بہت زیادہ بلند کی۔

Marfat.com

عقل و دانش کا یہ تقاضا ہے کہ نظریات اور پیغامات کو ان کی اپنی خوبیوں سے جانچا پرکھا جائے اور ان کے لیے کسی بیرونی تاثرات کا سہارا نہ لیا جائے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے احکامات کو ان کی اپنی خوبیوں کی روشنی میں پرکھنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف وحی والہام کو ان کی اپنی صفات کی روشنی میں دیکھنے کا موقع ملا بلکہ علم و عقل کو بھی ایک فعال اور موثر رول ادا کرنے کے لیے عملی میدان میں لایا گیا۔ چونکہ آنحضورؐ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یونان کے فلسفی خدا کی ذات اور نظام حیات و کائنات پر غور وفکر کرتے رہے اور ان کی تشریحات کے نتیجہ میں ایسے نتائج اخذ کرتے رہے جن کا زیادہ تر تعلق عقل و خرد، فلسفہ اور منطق سے تھا ان کے سنجیدہ غور وفکر کے نتیجہ میں کئی نظریات نے جنم لیا جو آئندہ چل کر مزید تحقیق و تدوین کا باعث بنے اور بہت سے مسلمان مفکرین نے ان کی اور اسلامی تعلیمات کی بنا پر علم و ہنر کا شعور بیدار کیا اور یہی شعور آگے چل کر یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی بنیاد بنا۔

بہرحال ہم ذکر عقل و خرد اور علم و عرفان کے ان ابواب کا کر رہے تھے جو کہ آنحضورؐ کے وقت میں ابھی پوشیدہ تھے اور جن کو روشن کرنا آنحضورؐ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے نتیجہ میں ممکن ہوا۔

اگر معجزات کے ذریعہ ہی وحی والہام کو لوگوں تک پہنچایا جاتا تو عقل و خرد کے تقاضے تشنہ رہتے اور انسان نفس اور آفاق کی دنیا میں ان تجربات اور مشاہدات سے دوچار نہ ہوتا جو علم اور سائنس کی دنیا میں مسلسل وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان آنے والے واقعات کی نشاندہی قرآن میں اس طرح کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور ہم عنقریب اطراف عالم میں اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے۔

یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن مجید حق ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے واقف ہے''

Marfat.com

(قرآن۔ السجدہ۔ ۵۳)

نیز قرآن اور آنحضورؐ کا مقصد اسلام کو محض ایک روایتی مذہب کے طور پر پیش کرنا نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی شعور پیدا کرنا اور تغیر و تبدل کے ان تجربات سے انسان کو دوچار کرنا تھا جو ذہنی و عقلی توضیحات کے ذریعہ اس کی حسی، جمالیاتی اور روحانی سطح بلند کر سکیں۔

نیز خالق حقیقی نے چاہا کہ انسان محض ایک وصول کنندہ کی حیثیت سے وحی والہام کی وصولی ہی نہ کرے بلکہ اس پر غور و فکر کر کے مذہبی تخلیقی راہیں ہموار کرے اس لیے کہ عقل و شعور کے ذریعے فن تخلیق کو فروغ دینا تھا۔ تخلیقی عمل کو بروئے کار لائے بغیر ارتقائی مراحل طے کرنا ممکن نہیں تھا اور انسانیت کے اعلیٰ معیار حاصل کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

پیغمبر اسلام نے جس مذہب کو پیش کیا وہ تغیر و تبدل کے لیے ایک انقلابی پروگرام تھا۔ اس کی جڑیں اگرچہ دائمی اور ابدی تھیں لیکن اسے ایک جدید روشن خیال اور فکر انگیز ضابطہ حیات کے طور پر پیش کیا گیا تھا اس کا مقصد زندگی میں ایک تغیر و تبدل لانا تھا جو کہ کسی شعبدہ بازی یا ساحرانہ حرکات کی وجہ سے وقوع پذیر نہ ہوا ہو بلکہ ٹھوس عقلی دلائل اور فطری تقاضوں کے مطابق ہوا۔

یہی قرآن کا سب سے بڑا اعجاز ہے اور یہی مذہب اسلام کی روح ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے جو ذہنی اور روحانی تاثیر کے اعتبار سے ایک ناقابل فراموش معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے یہ ایک ایسا دبستان ہے جس کے حسن اور نور سے پورا جہاں روشن ہو گیا ہے۔

یہی آنحضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے جو ہمیں قرآن اور اسلام کی شکل میں نظر آتا ہے۔ جہاں قرآن نور و روشنی کا منبع ہے وہاں اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو اس دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح و بہبود کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

قرآن کے ارشادات اور پیش گوئیاں خود ایک بہت بڑا ثبوت ہیں کہ کس طرح یہ کتاب نظام حیات اور واقعات کو متاثر کرتی ہے۔ پیش گوئیوں کے ضمن میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کے مستقبل کے

Marfat.com

بارے میں تمام پیش گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔ چند ایک پیش گوئیاں ہم یہاں مثال کے طور پر پیش کرر ہے ہیں۔

جیسے اہل بدر کے بارے میں فرمایا:

عنقریب یہ لوگ شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔

(قرآن سورۃ القمر ۴۵)

ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی فتح کی خبر اس وقت دی جبکہ وہ بری طرح ہزیمت خوردہ تھے۔فرمایا((الروم:۱،۲)

''الم۔اہل روم (اگر چہ) مغلوب ہو گئے ہیں لیکن جلد ہی وہ غالب ہو جائیں گے۔

اس طرح قرآن ایک اور جگہ کہا ہے کہ یہ تمام خبریں ہم تمہیں غیب سے دیتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم (سورۃ ہود:۴۹)

یہ آیات اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن کریم ایک سچی کتاب ہے اور جو منکرین اس پر یقین نہیں رکھتے وہ حقائق سے منہ پھیرتے ہیں اور خود خسارے میں ہیں۔

قرآن مجید کا تو یہ اعجاز ہے کہ اسے سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے اور انہیں حالات ے مطابق اپنے دینی اور دنیوی مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام (جو کہ قرآن مجید کے سنہری اصولوں پر مبنی ہے) کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ

''یہ جامع اور مربوط منشور ہے جو تمام نظام حیات پہ محیط ہے ان تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے جو ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا تیار کردہ مذہب ہے جس کو لوگوں کی رشد و ہدایت اور فلاح و بہبود کے لیے مکمل کیا گیا ہے۔''

(قرآن:۳:۵)

موجودہ دور میں ان تمام خصوصیات کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مادہ پرستی عام آدمی کی زندگی کا خاصہ بن چکی ہے۔اور مال و دولت کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا جاتا ہے

اور مذہب کے اخلاقی اور دائمی اصولوں سے روگردانی کی جاتی ہے اس کے نتیجہ میں معاشرہ انحطاط پذیر ہے اور دین سے دور۔

اس کتاب کو دوبارہ نئے سرے سے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دین اسلام کے اصولوں کو جدید ترقی و روشنی کے دور میں روشناس کرایا جائے اور عوام الناس کو بتایا جائے کہ جب کہ اسلام دینوی زندگی کو رد نہیں کرتا لیکن اس سے پیدا ہونے والی برائیوں سے بھی برابر انسان کو متنبہ کرتا ہے تا کہ زندگی کا صحیح رخ اختیار کیا جائے اور صحیح اصول اپنائے جائیں۔

بہر حال یہ وقت کا تقاضا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کو بطور مذہب اور دین صحیح انداز اور صحیح رنگ میں پیش کیا جائے تا کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے لیے اسے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ تمام غلط فہمیاں اور تعصبات کم سمجھی اور کم علمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

جدیدیت اور مغرب کی روشنی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حالات کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور خوبیاں جہاں بھی ہوں وہاں سے لی جائیں۔

اسلام کو ایک دقیانوسی مذہب کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے جبکہ اس کے تمام مثبت پہلو اس کے ترقی یافتہ اور روشن افزوں ہیں اور تمام حالات سے مطابقت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے ناطے سے ہمیں تمام اوصاف و خصائل سے استفادہ کرنا ہوگا خواہ وہ مغرب میں ہوں یا مشرق میں۔ پیغمبر اسلام آنحضورؐ نے خود فرمایا ہے کہ اگر علم کی خاطر تمہیں چین بھی جانا پڑے تو وہاں جاؤ۔ تو مسئلہ تمام علم اور عمل کا ہے کیونکہ علم اور عمل کے ذریعہ ہی زندگی کی اعلیٰ منازل تک پہنچا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کا پیمانہ بہر حال ہمیں اپنے سامنے رکھنا ہوگا کیونکہ یہ ایک قابل اعتماد فطری معیار ہے اور اسی معیار سے ہم عدل اور ظلم، حق اور باطل اور خیر و شر میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا توضیحات سے ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن بطور مذہب اور ضابطہ حیات ایک مکمل کتاب ہے اور اس میں وہ تمام عقلی علمی اور فطری عوامل موجود ہیں جن سے دانش و حکمت اور علم و فرقان کے عمل کو جاری رکھا جا سکے اور اس طرح زندگی اپنے معراج کمال کو پہنچ جائے۔

Marfat.com

Marfat.com

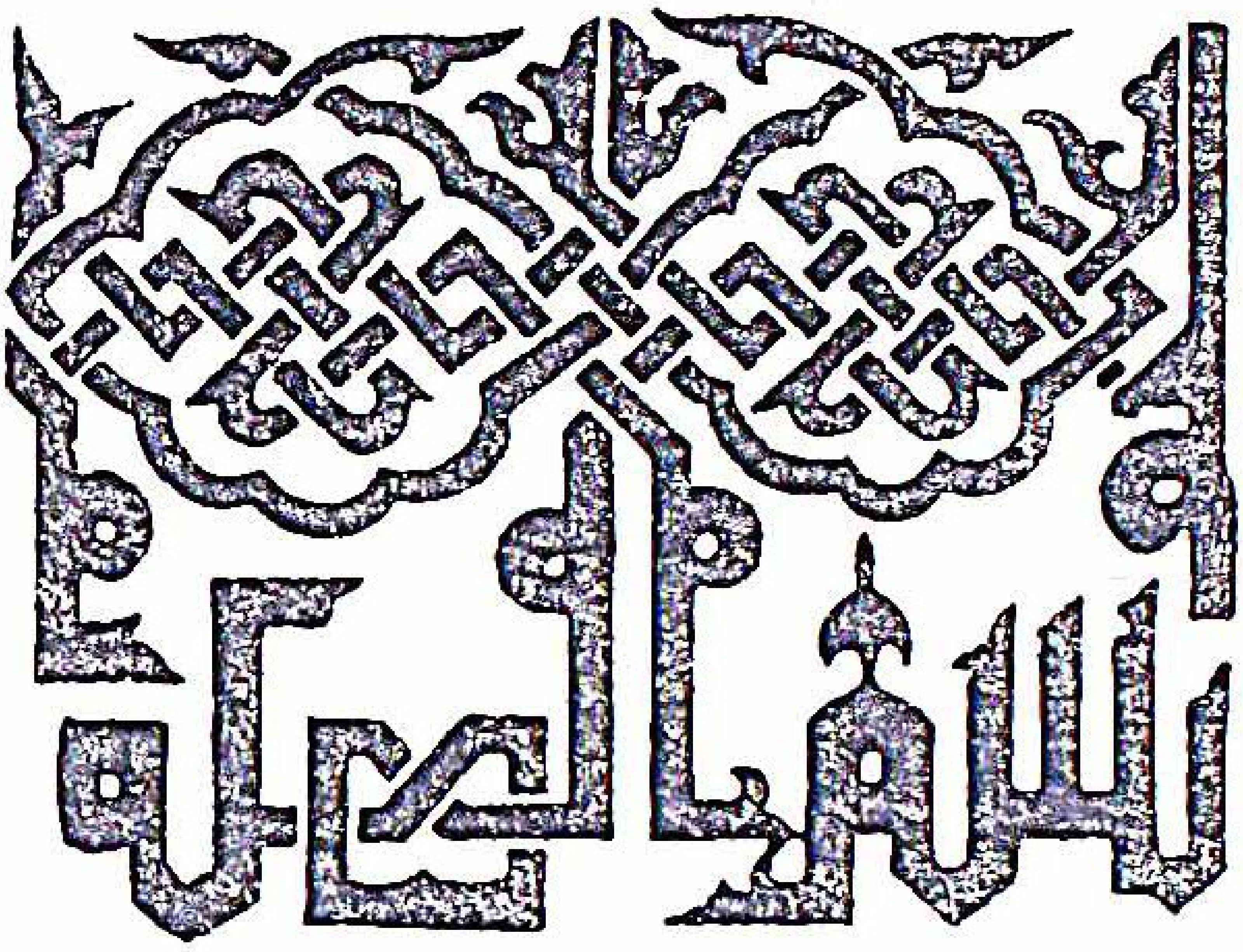

Marfat.com

Marfat.com

حُسن اور امن دین کی اساس ہیں

قرآن۔۸۲

''تم دیکھو گے کہ منکرین حق میں سب سے زیادہ مومنین کے مخالف یہودی اور مشرکین (مکہ) ہوں گے۔اور تم دیکھو گے کہ سب سے زیادہ دوستی کے روادار وہ لوگ ہوں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے خود کو علم کے حصول کے لیے وقف کر دیا ہے اور انہوں نے دنیا کو بھی ترک کر دیا ہے اور وہ غرور و تکبر بھی نہیں کرتے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دیگر مذاہب کے پیروکاروں (یہودی۔مشرکین مکہ اور عیسائیوں) کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض یعنی یہودی اور مشرکین مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ان کے شدید مخالف ہیں جبکہ عیسائی اس کے برعکس ایسا مخالفانہ رویہ نہیں اپناتے اور علم و دانش میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ان جداگانہ خصوصیات کا ذکر اس لیے کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے خصائل سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ ان سے ان کی مخصوص روش کی روشنی میں اپنے معاملات طے کر لیں۔یہ حیران کن بات ہے کہ جن خصوصیات کا ذکر آج سے چودہ سو برس پہلے کر دیا گیا وہ آج بھی ان لوگوں میں اسی طرح موجود ہیں۔اگرچہ وقت کے ساتھ یہودیوں نے بھی علوم و فنون میں خاصی پیش رفت کی ہے لیکن مسلمانوں کے خلاف ان کی مخاصمت اسی طرح قائم ہے فلسطین اور دیگر عرب علاقوں میں جس طرح مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے وہ ان آیات کی عکاسی کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں عیسائیوں میں ہمدردی اور رواداری کا جذبہ زیاد دیکھنے میں آتا ہے اور وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بھی زیادہ متحرک نظر آتے ہیں۔

یہودیت۔عیسائیت اور اسلام دنیا کے سب سے قدیم مذاہب میں شمار ہوتے ہیں اور ان کا اثر و رسوخ بھی دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔مزید براں تینوں مذاہب میں کئی ایسی اقدار ہیں جنہیں مشترکہ ورثہ کا حصہ تصور کیا جا سکتا ہے۔خاص طور پر سچائی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ایسے عقیدے ہیں جو تینوں میں مشترک ہیں۔ان کے علاوہ اخلاقیات،حق گوئی اور کئی اقدار اور فرائض جو انسانیت اور وحدانیت سے متعلق ہیں ان مذاہب کو ایک دوسرے سے منسلک کیئے ہوئے ہیں۔

اسلام ذہنی، قلبی اور روحانی طور پر اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے سر کو جھکانے کا نام ہے اسلام یہ سبق دیتا ہیکہ انسان ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ تمام خوبیاں اپنی ذات میں پیدا کرے جو اشرف المخلوقات بناتی ہیں اور نتیجتاً خلیفہ فی الارض کا مرتبہ عطا کرتی ہیں یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور اسی لیے اس کی تخلیق کی گئی تھی۔

اگر انسان ان خوبیوں کو نہیں اپناتا اور وحدانیت اور انسانیت کے بنیادی اصولوں پر نہیں چلتا تو وہ انسانیت کے مرتبے سے گر جاتا ہے اور اسفل السافلین بن جاتا ہے۔

تمام آفاقی مذاہب کا یہی نقطہ نظر ہے اور یہی ان کا مشترکہ ورثہ ہے اگر چہ فکر و نظر کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ نظریات میں بھی تبدیلی آتی گئی اور عیسائیت میں تو توحید کا تصور کسی حد تک مسخ ہوتا نظر آیا جب اس کے پیروکاروں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔

اسی طرح یہودیوں نے بھی حضرت عزیز کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور وحدانیت کا بنیادی تصور بگاڑ دیا۔

مسلمانوں میں بھی اگر چہ کچھ ایسے فرقے نمودار ہو گئے جنہوں نے پیغمبر اسلام آنحضورؐ کو اللہ کے برابر مرتبہ دے دیا اور سمجھا کہ آنحضورؐ کی بزرگی اور فضیلت اللہ سے کم نہیں۔

بہر کیف یہ موقف غالب نہ ہو سکا اور سعودی عرب میں اور ہندوپاک دیوبندی اثرات کے بعد

Marfat.com

اس عقیدے کو صحیح خطوط پر مستحکم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے لیکن جو لوگ مختلف عقیدوں کے گرویدہ ہیں وہ ان پر برابر ڈٹے ہوئے ہیں۔

حالانکہ قرآن مجید میں ایسے عقائد کی کئی جگہ واضح طور پر نفی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''کہہ دو کہ اللہ ایک ہے اور وہ سب سے بلند اور بالاتر ہے اور تمام ملاوٹوں سے مبرا۔ اس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے'' (قرآن سورۃ اخلاص)

اسی طرح ایک اور آیت میں حضرت ابراہیم علیہ کی زبانی یہ فرمایا گیا ہے کہ ''دیکھو جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا کہ کیا تم اور دیوتوں کی پوجا کرتے ہو اور انہیں خدا سمجھتے ہو حالانکہ یہ بات حقیقت کے برخلاف ہے اور تم ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو''

(قرآن۔۷۴:۶)

حضرت ابراہیم کی طرح دوسرے تمام پیغمبروں نے جیسا کہ حضرت موسیٰ۔ عیسیٰ اور آنحضورؐ نے مشترکہ موقف کو قطعی طور پر اختیار کیا اور شرک کو سب سے بڑا گناہ اور برائی قرار دیا۔

مسلمانوں کے لیے اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ان تمام مذاہب کا جوہر ہے جو حضرت ابراہیم سے شروع ہوا اور تاقیامت قائم رہے گا۔

قرآن کریم (سورۃ الشوریٰ۔ آیت ۱۳) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا علم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار گزرتی ہے۔''

یہاں اس بات کی کھل کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ دین اسلام وہی دین ہے جو پہلے نبیوں اور پیغمبروں کو دیا گیا تھا۔ دین تو ایک ہے لیکن اس کی وضاحتیں اور توجیہات مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے کر دی گئی ہیں۔ جس کا حکم ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجا ہے جس کی تاکید ہم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہ بات مشرکین

Marfat.com

کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ (قرآن مجید الشوریٰ ۱۲۔۴۲)

دین سے مراد یہاں ایک ضابطہ حیات ہے جو کہ ہر قوم کے لیے زندگی گزارنے کے لیے مقرر کردیا گیا ہے۔ شرع لکم سے مراد شریعت کے اصول ہیں جس سے مراد قوانین اور ان کا نفاذ ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک اس سے مراد آئین ہے جو کہ ریاست کی مشینری کو چلانے کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔

اس دین اور اس میں دیئے گئے قوانین اور آئین کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے قائم رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

دین حق کو ماننے سے مراد اللہ اور آخرت پر ایمان لانا اور حرام وحلال میں تمیز کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا اس کے لازمی جزو ہیں۔

اقامت دین کے بعد دوسری اہم بات جس کی طرف اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے وہ دین میں تفرقہ کے بارے میں ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ دین میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دین کی جڑیں کھوکھلی ہوں گی اور مسلمانوں میں اتحاد نظم اور ضبط کی کمی ہوگی جو آخرکار ان کی اور دین کی کمزوری کا باعث ہوگا یہ حکم آج کل کے حالات میں بڑھتی ہوئی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہر مسلم معاشرہ نہ صرف بے راہ روی کا شکار ہے بلکہ تفرقہ بازی۔ تعصب اور انتہا پسندی کے سبب پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ اس لیے اس ارشاد عالیہ کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو سکے اور دین اسلام کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جاسکے۔[۱]

اس لیے دین کے بنیادی اصول جن پر دین اسلام قائم ہے تمام مذاہب کے مشترک ورثہ ہیں اور یہی دین اسلام کی روح ہے۔

ہر وہ مذہب (خصوصاً یہودیت اور عیسائیت) جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے رسول مبعوث کیا وحدانیت پر مبنی تھا اور ان تمام انبیاء کرام نے اللہ کی وحدانیت کی طرف دعوت دی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

۱۔ مزید تشریحات اس باب کے آخر میں دیکھیے

Marfat.com

''اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف وحی کی کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں ہے بس صرف میری ہی عبادت کرو''

(سورۃ الانبیاء۔۲۵)

پھر سورۃ آل عمران (آیت ۶۴) میں فرمایا ''اے محمدؐ! آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے ہم کسی کی بادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب قرار نہ دے پھر بھی اگر وہ لوگ حق ماننے سے انکار کریں تو تم (ہمارے) اس (اقرار) پر گواہ رہو کہ ہم (تو اس حقیقت کے ماننے والے ہیں)

اگر تم نہ مانو تو تم جانو۔''

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بھی رسول اللہ کی طرف سے مبعوث ہوا اس نے توحید کا ہی پیغام دیا اور توحید سے انکار ایک غیر مذہبی فعل گردانا گیا۔

بعد میں مذاہب میں جتنی قباحتیں اور اختلافات پیدا ہوئے وہ اس عقیدے کے متزلزل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے اور انہوں نے مذہب کی اصل صورت بگاڑ دی۔

بیشتر قباحتیں رعونتوں کے سبب پیدا ہوئیں جو دین کے بنیادی اصولوں سے انحراف اور مخصوص مفادات کے تحت وجود میں آئیں۔ مزید برآں الہامی کلام اور صحیفوں میں تحریفیں کر دی گئیں جن کے باعث ابہام اور غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس سے وہ دین جو مختلف مذاہب کی صورت میں نازل ہوا تھا اپنی اصل خدوخال بدلتا نظر آیا۔

آنحضورؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس بدلتی صورتحال کو درست کیا جائے اور دین کو اس کے اصل رنگ میں پیش کیا جائے۔

فرمایا گیا بلاشبہ دین (برحق اور قابل قبول)

اللہ کے نزدیک اسلام ہے اہل کتاب نے جو اختلافات کئے اور اسلام کو باطل کہا وہ تو ایسی

Marfat.com

جہالت کے بعد کہ ان کو اسلام کے بارے میں حق ہونے کی دلیل مل چکی ہے یہ محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی خاطر اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کردے گا تو بے شک اللہ تعالیٰ اس کا بہت جلد حساب لینے والا ہے پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے خوامخواہ کی حجتیں نکالیں تو آپ فرما دیجیے کہ میں نے اور میری پیروی کرنے والوں نے اپنے آپ کو اللہ کے آگے سرنگوں کردیا۔

(سورۃ آل عمران۔۲۰)

اس لیے مذاہب کی مختلف اشکال کے باوجود دین کی ہم آہنگی اور یکسوئی پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور اختلافات کو دور کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں جو اختلافات پیدا ہوئے وہ دین کو متزلزل کرتے رہے اور جو استحکام اور بقا اس کا مقصود تھا وہ اسے حاصل نہ ہوسکا۔

موجودہ دور میں یہ صورت حال زیادہ قبیح ہوگئی ہے اور اختلافات صرف مذاہب کے مابین ہی نہیں بلکہ مذہبوں میں اندرونی طور پر بھی پائے جاتے ہیں یہ اختلافات آج کل مسلمانوں میں بہت زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ تشدد۔تعصب اور انتہاپسندی کے چنگل میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور خود اپنے مذہب اور دین کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مرتبہ تفرقات اور اختلافات کے خطرات سے متنبہ کیا ہے سورۃ الشوریٰ (۱۵:۱۳) میں دوبارہ ایک دین کو قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور دین کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے مشترک اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔تمام شریعتوں میں بنیادی اصول مشترک ہیں اور انہیں اپنانے میں ہی دین اور دنیا کی فلاح ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین مقبول ہے اور کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔

اسلام کے لیے بنیادی اصول جس پر دین کا تمام تر ڈھانچہ قائم ہے توحید اور ربوبیت کی بنیادی خصوصیات ہیں جن کو جاننا اور ان پر یقین رکھنا ہر مسلمان کے لازم ہے۔یہاں کسی قسم کی گنجائش کا جواز

Marfat.com

نہیں ہے۔عیسائی جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اسلام کے احاطہ دین سے نکل جاتے ہیں بلاشبہ ہی یہی اصول حضرت ابراہیم سے نکلنے والے تمام ادیاں کا بنیادی جزو ہے اور اسی کو مان کر اور اسی پر چل کر ہم دائرہ اسلام میں رہ سکتے ہیں اور یہی روح اسلام ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اسلام کو جو چیز عیسائیت اور دیگر مذاہب سے جدا کرتی ہے وہ اس کا عقیدہ توحید ہے اس لیے اس عقیدے کو سمجھنا اور اسے اپنی زندگی میں اپنانا ایک مسلمان کیلیے بہت ضروری ہے۔

قرآن مجید۔آل عمران۔۸۵

جیسا کہ ایک عالم دین نے فرمایا کہ جو شخص ''معاشرہ توحید کے اسرار کو سمجھ لیتا ہے اور اس کے تقاضوں کو پوری طرح اپنا لیتا ہے تو گویا وہ اپنا رشتہ اس ماخذ حیات اس منبع نور سے جوڑ لیتا ہے جس نے اس پوری کائنات کو بنایا اور ارتقاء بخشا ہے اور جب وہ شرک کے ارتکاب سے اس رشتے کو توڑ لیتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کی روشنی۔ہدایت اور توفیق سے منہ موڑ لیا ہے توحید کے اس پہلو پر اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس عقیدے کا تعلق نفس انسانیت کے فروغ اور ارتقاء سے ہے۔

اور شرک کا نفس انسانیت کی پستی اور انحطاط سے''۔

قرآن حکیم فرماتا ہے (سورۃ الحج۔۳۱)

''اور جو شخص خدا کے ساتھ شریک ٹھہرائے وہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی آسمان کی بلندیوں سے گر پڑے اور اس گوشت پوست کو پرندے اچک لے جائیں اور کہیں دور پھینک دیں۔''

بہر کیف مذکورہ بالا توضیحات سے یہ حقیقت خاصی حد تک عیاں ہوگئی ہے کہ دین اسلام ہمیں توحید کی دعوت دیتا ہے جو بذات خود ایک دائمی اور ازلی حقیقت ہے اور اس کی دنیا بھر میں پھیلتی ہوئی صفات ہمیں اس کی ہمہ گیر افادیت اور اہمیت سے آگاہ کرتی ہیں یہ عقیدہ اپنی ہدایت کی بدولت پورے عالم

۔مولانا حنیف ندوی۔''مطالعہ قرآن۔صفحہ ۲۰۵

انسانی کے لیے باعث رحمت و برکت بھی ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھرپور انداز میں پیش

Marfat.com

کرتا ہے اس لیے اسکا دائرہ کسی خاص حلقے یا مذہب تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔اس کی برکات اور اور فیوض سے ہم سب لوگ یکساں مستفیض ہوتے ہیں۔

آخر میں ہم قرآن مجید کی زبان میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔

''کہ اے اہل کتاب! آؤ کہ جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے تسلیم کی جاتی ہے اس پر متفق ہو جائیں۔یعنی یہ کہ ہم خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو کارساز نہ سمجھے۔

اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو کہہ دیجیے ''تم گواہ رہو کہ ہم تو مکمل طور پر خدا کے فرمان بردار ہیں۔''

دین کا مقصد مسلمانوں میں ایک عالمگیر برادری قائم کرنا تھا اور اس کے لیے اس نے واضح اصول پیش کیے اور تشدد، تفرقہ بازی اور غیر اخلاقی حرکات کی ممانعت کی ہے اس ضمن میں چند قرآنی آیات کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی فرماتے ہیں:

۱۸۔ یہ آیت (۱۰۔۴۹) دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں وہ اخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔اس حکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا ہے جن سے اس کی پوری روح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا۔دوسرے یہ کہ زکواۃ دیتا رہوں گا۔تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔(بخاری، کتاب الایمان)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر'' بخاری، کتاب الایمان، سند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالک نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے:۔

Marfat.com

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے'' (مسلم ،کتاب البرّ والصلہ ، ترمذی، ابواب البرّ والصلہ)

حضرت ابوسعید خذریؓ اور حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شریعت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر نہ کرے'' (مسند احمد)

حضرت سہل بن سعد ساعدی آپ گا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ ''گروہ اہل ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے'' (مسند احمد) اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک اور حدیث میں ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے'' مومنوں کی مثال آپس کی محبت، وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم وشفقت کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو سارا جسم اس پر بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (بخاری مسلم)

ایک اور حدیث میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ ''مومن ایک دوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے'' (بخاری، کتاب الادب، ترمذی، ابواب البرّ والصلہ ۔

۱۹۔ پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ضروری ہدایات دینے کے بعد اہل ایمان کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ دین کے مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کو خدا سے ڈرتے ہوئے اپنے آپس کے تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب آگے کی دو آیتوں میں ان بڑی بڑی برائیوں کے سدباب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر حملہ ایک دوسرے کی دل آزاری ایک دوسرے سے بدگمانی اور ایک دوسرے کے عیوب کا تجسس درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جن سے آپس کی عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر ان سے بڑے بڑے فتنے رونما ہوتے

Marfat.com

ہیں۔اس سلسلے میں جو احکام آگے کی آیتوں میں دیئے گئے ہیں اور ان کی جو تشریحات احادیث میں ملتی ہیں ان کی بنا پر ایک مفصل قانون ہتک عزت (Law of libel) مرتب کیا جا سکتا ہے مغربی قوانین ہتک عزت اس معاملے میں اتنے ناقص ہیں کہ ایک شخص ان کے تحت دعویٰ کر کے اپنی عزت کچھ اور کھو آتا ہے۔اسلامی قانون اس کے برعکس ہر شخص کی ایک بنیادی عزت کا قائل ہے جس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔قطع نظر اس سے کہ حملہ واقعیت پر مبنی ہو یا نہ ہو اور جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کی کوئی ''حیثیت عرفی'' ہو یا نہ ہو۔مجرد یہ بات کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی تذلیل کی ہے اسے مجرم بنا دینے کے لیے کافی ہے الا یہ کہ اس تذلیل کا کوئی شرعی جواز ثابت کر دیا جائے۔

مذاق اڑانے سے مراد محض زبان ہی سے کس کا مذاق اڑانا نہیں ہے بلکہ کسی کی نقل اتارنا، اس کی طرف اشارے کرنا، اس کی بات پر یا اس کے کام یا اس کی صورت یا اس کے لباس پر ہنسنا، یا اس کے کسی نقص یا عیب کی طرف لوگوں کو اس طرح توجہ دلانا کہ دوسرے اس پر ہنسیں، یہ سب بھی مذاق اڑانے میں داخل ہیں۔اصل ممانعت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی کسی نہ کسی طور پر تضحیک کرے کیونکہ اس تضحیک میں لازماً اپنی بڑائی اور دوسرے کی تذلیل و تحقیر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو اخلاقاً سخت معیوب ہیں اور مزید برآں اس سے دوسرے شخص کی دل آزاری بھی ہوتی ہے جس سے معاشرے میں فساد رونما ہوتا ہے۔اسی بنا پر اس فعل کو حرام کیا گیا ہے۔

مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے لیے عورتوں کا مذاق اڑانا یا عورتوں کے لیے مردوں کا مذاق اڑانا جائز ہے۔دراصل جس وجہ سے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سرے سے مخلوط سوسائٹی کا قائل نہیں ہے۔ایک دوسرے کی تضحیک عموماً بے تکلف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے اور اسلام میں یہ گنجائش رکھی ہی نہیں گئی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔اس لیے اس بات کو ایک مسلم معاشرے میں قابل تصور نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک مجلس میں مرد کسی عورت کا مذاق اڑائیں یا عورتیں کسی مرد کا مذاق اڑائیں گی۔

Marfat.com

۲۱۔اصل میں لفظ لمز استعمال ہوا ہے س کے اندر طعن وتشنیع کے علاوہ متعدد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب چینی کرنا اور کھلم کھلا یا زیرلب یا اشاروں سے کسی کو نشانہ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال بھی چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔ کلام الٰہی کی بلاغت یہ ہے کہ لا یلمز بعضکم بعضا (ایک دوسرے پر طعن نہ کرو)۔

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

دل ودماغ کے ارتقائی مراحل

ولقد حلقنا انسان و نتلم ما تو وسوس به نفسه ونحن اقرب الیه من حبل ابور

(۵۰:۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کے دماغ (دل) میں کیسے خیالات جنم لیتے ہیں۔ اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں''

اللہ تعالیٰ کی قربت اور محبت انسان کے لیے ایک لازوال تحفہ ہے۔ اس کا علم ہمیں قرآن مجید کے ذریعہ ہی ملتا ہے۔

یہ اس تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ نظام حیات وجود میں آیا اور تا قیامت جاری وساری ہے اسی کی بدولت اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں اور عنایتیں انسان کے حصے میں آتی ہیں۔ اسی کی بدولت تمام حیاتیاتی انواع (Species) روز آفرینش سے اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی ہیں۔

بقائے حیات کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا نظام وضع کیا جو نہ صرف اپنی ضروریات کے مطابق پھلتا پھولتا ہے بلکہ وہ قدرت کے ان بنیادی دھاروں سے بھی منسلک رہتا ہے جہاں سے اسے اپنی غذا

Marfat.com

کے لیے ضروری مواد حاصل ہوتا ہے اس طرح اگر دیکھا جائے تو ذرہ ذرہ نظام قدرت میں پرو دیا گیا ہے اور وہ اپنی فطرت اور جبلت کے مطابق مصروف عمل ہے۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے نہایت اعلیٰ درجہ کی خصوصیات سے نوازا ہے جو دوسری انواع کے حصے میں نہیں آتی ہیں۔

اس تخلیقی عمل کی روحانی نفسیاتی اور مادی لحاظ سے توجیحات قرآن مجید نے وقتاً فوقتاً کی ہیں ان خواص اور خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بدولت انسان معراج کامل تک پہنچتا ہے دل و دماغ انہی اجزا میں سے ہیں جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

دل و دماغ کے ذریعہ ہی انسان کا اللہ سے ایک ایسا رشتہ قائم ہوتا ہے جو اسے انسان کی شہ رگ سے بھی نزدیک کر دیتا ہے یہ رشتہ انسان کے دل و دماغ کو وسعتیں بخشتا ہے اور وہ عظیم مرتبہ عطا کرتا ہے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک ایسی شے بنانے والا ہوں جو بلند ہوگی۔ کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے وجود میں آئے گی اور اس میں اپنی روح کے ذریعہ ایسی صفات پیدا کروں گا جو تم پر بھی سبقت لے جائے گی اس پر فرشتوں نے اپنے شکوک کا اظہار کیا لیکن جلد ہی ان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ واقعی جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ درست تھا۔[۱]

انسان کے متعلق اسی حقیقت کا اظہار سورۃ مومنون آیت ۱۳۔۱۴ میں اس طرح کیا گیا۔

''خود ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا پھر نطفے کو لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنائی۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا۔ پھر اس کو ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔''

اللہ سب سے بہتر بڑا بابرکت ہے۔

یہاں تخلیقی عمل میں جتنے ضروری مراحل پیش آئے ان کا ذکر کر دیا گیا ہے

قرآن سورۃ حجر۔ ۲۸۔۲۹

Marfat.com

اس کے بعد سب سے اہم چیز جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں ڈالی وہ روح تھی۔ جس کے ذریعے اسے بقا حاصل ہوئی اور وہ تمام رفعتیں اور رشتے جن کی وجہ سے وہ اللہ کا محبوب ترین تخلیقی کارنامہ قرار دیا گیا۔

پھر اللہ نے انسان کو اپنے سب سے زیادہ قریبی درجہ پر جگہ دی۔ وہ اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہو گیا۔ اور اس قربت کے سبب اس کے لیے وہ تمام دریچے کھول دیئے جو حسن و جمال پاکیزگی اور بالیدگی کے لیے ضروری تھے۔

جن لوگوں میں اللہ کی قربت سے لطف اندوز ہونے کی حِس اور شعور پیدا ہوا وہ معراج کمال تک پہنچ گئے اور جو شعور اور آگہی سے محروم رہے وہ اسفل السافلین بن گئے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ خالق حقیقی ہے اس لیے وہ جانتا ہے کہ کون سے جسمانی عناصر اور روحانی تراکیب کی بدولت انسان صاحب حُسن وسرور بنتا ہے اور کون سے عناصر انسان کی دنیوی اخروی نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

خدا اور بندے کے درمیان جو رشتہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قلبی اور روحانی روابط کے ذریعے قائم کیا اس کے لیے قرآنی آیات میں اشارے دیئے ہیں وہ نفس مطمعنہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے صحیح رشتہ قائم کرنے سے انسان ''عبادالرحمٰن'' بنتے ہیں جس کا ذکر سورۃ الفرقان (۲۵) میں کیا گیا ہے۔

انسان ناکام اس لیے ہوتا ہے کہ وہ قرآنی آیات اور نظام حیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتا اور ان حقائق کا ادراک نہیں کرتا جو اس کے لیے حسن وسرور کی راہیں متعین کرتے ہیں۔

قرآنی آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس رشتے کو سمجھا جائے جو انسان کو انسان بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ان حقائق کو سمجھے بغیر ہم اللہ تعالیٰ کی ہستی سے آشنا نہیں ہو سکتے اور وہ رشتہ قائم نہیں کر سکتے جس کی خاطر انسان کو پیدا کیا گیا اور جس کے ذریعہ نظام حیات کو جاری رکھنا مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ جب دل و دماغ کے ذریعہ انسان کے نزدیک آتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو

حقیقی معنوں میں اپنا خالق حقیقی رازق۔ پروردگار سمجھے۔اور خواہ کیسے بھی مشکل حالات ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد نہ مانگے اور کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہ سمجھے۔غوث و دستگیر گنج بخش اور داتا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہوسکتی ہے اس ضمن میں ان صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو رازق و کارساز۔ مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا ہوگا ورنہ اللہ سے وہ رشتہ قائم نہیں ہوسکتا جس کی خواہش قرآن مجید نے اپنی آیات میں کی ہے۔

اس خواہش کا احترام کرنے سے ہی ہم اللہ سے ہم کلام ہوسکتے ہیں اور ہم نظری کی توقع کرسکتے ہیں۔

اللہ جب ہم سے اتنا قریب ہے اور ہماری بقا اور ارتقاء حیات کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی توقع کرتا ہے کہ ہم اس کی وحدانیت اور ربوبیت کو تسلیم کریں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو وہ قرب جسکا مذکورہ بالا آیت میں ذکر کیا گیا ہے اپنے معنی کھودے اور شاید دوری میں منتقل ہو جائیگا۔اس لیے اللہ کا بندہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں بہت محتاط رویے کی ضرورت ہے اور تمام برائیوں سے جیسا کہ وہ کفر و شرک، ظلم و جہل اور کذب و تکذیب حق میں ظاہر ہوتی ہیں بچنے کی ضرورت ہے۔

انسان فطرتاً ایک بندہ ہے اور حکمرانی اور بادشاہت خدا کی ہوتی ہے۔لیکن زندگی کی رنگینیوں اور سرمستیوں میں آدمی جلد ہی اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔اس کے اندر کی شیطانیت اس کو وہ کام کرنے کے لیے اکساتی ہے جو منشائے ایزدی کے خلاف ہوتا ہے اور اس طرح انسان اللہ کے قرب سے دور ہو جاتا ہے اگرچہ ہمارے دل و دماغ اور عقل سلیم فطری طور پر ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہوتے ہیں لیکن ہم کم وبیش ان کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اس لیے ماہرین نفسیات اور دماغ پیمائی کرنے والے ماہرین اب یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ دماغ کا مطالعہ بھی اسی جدوجہد سے کیا جائے جیسا کہ ہم دوسرے جسمانی اعضاء کا کرتے ہیں دماغ کا مطالعہ نظر و فکر اور ذہنی، قلبی اور روحانی بالیدگی کے لیے انتہائی اہم موضوع ہے۔

اس سے ہمیں اس امر کا بھی علم ہوتا ہے کہ ہم کس سمت میں اپنا رخ بدلنے کے اہل ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نظام حیات اور کائنات کا خالق و مالک ہی نہیں بلکہ اس کا ناظم اور محرک بھی ہے یہ اسی کی تخلیقانہ کاوشوں اور سوچ و فکر کا ماخذ ہے کہ یہ کائنات اور اس میں بسنے والے ہمیں اس شکل میں نظر آتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو اس کی کوئی اور شکل ہو سکتی تھی یا کوئی بگاڑ کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔

کائنات کا فطری نظام اس چیز کا متقاضی ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہو اور یہ سلسلہ ایسی خوبصورتی سے چلتا رہے جیسا کہ اس نے تخلیق کرتے وقت کیا ہے مزید برآں وہ ان امکانات کا بھی جائزہ لے رہا ہے جو اس کے فروغ اور نشو و نما کے لیے اس نے اس میں ودیعت کیے ہیں۔

زمین۔ آسمان اور انسان کے نظام حیات کا سلسلہ نہایت دلچسپ مراحل سے گزرتا ہے اور یہ ہمیں اس کے مختلف مدارج میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

پچھلے پچاس برسوں میں سائنسی علوم میں حیرت انگیز پیش رفت ہوئی اور اس کے باعث ایسے ذہنی اور قلبی دریچے کھلے جنہوں نے انسانی فکر و نظر کو مزید روشنی فراہم کی ہے تحقیق و دریافت کے نتائج نے قرآن مجید کی ان آیات کو واضح کرنے میں خاصی مدد کی ہے جو کہ عام ذہن میں داخل ہونے میں قدرے دقت پیش آتی تھی۔ سائنسی حقائق کی روشنی میں ان آیات کی وضاحت کرنا اب قدرے آسان ہو گیا ہے۔

قرآن کریم جن ذہنی، قلبی اور مابعد الطبیعاتی امور کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے وہ عام حالات میں پھر سوچ و فکر کے انسانی دماغ میں جگہ نہیں پاتے اس لیے انہیں عقلی دلائل اور سائنسی حقائق کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قرآن کی کئی آیتوں نے سائنسدانوں کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ زمین و آسمان، سیاروں اور کہکشاؤں کی دنیا کا سراغ لگائیں اور ان کے اثرات نظام حیات پر مرتب ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا انسان کی شہ رگ سے نزدیک ہونا بھی ایک ایسی ہی حقیقت ہے جو ابھی سائنسی تحقیق اور ان کے نتائج کی منتظر ہے۔ سائنسی تحقیقات کے بعد ہی ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کی طبعی کیفیت کیا ہے۔ اگرچہ الہامی کلام اور قرآنی آیات کسی سائنسی تحقیق کی محتاج نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی حقانیت اور صداقت کا دار و مدار سائنسی تحقیق و دریافت پر ہے۔ باسوائے اس کے کہ تحقیق و دریافت کی روشنی میں ان

Marfat.com

کی وضاحت میں آسانی ہوتی ہے اور کئی چیزیں جو آسانی سے انسانی دماغ میں داخل نہیں ہوتیں ان کی مدد سے واضح ہو جاتی ہیں۔

بعض اوقات مختلف حالات میں قرآن اشاروں اور کنائیوں کی زبان استعمال کرتا ہے جسے آسانی سے نہیں سمجھا جاسکتا اور عام آدمی اس پر اتنا زیادہ غور و فکر بھی نہیں کرتا کہ وہ انہیں بخوبی سمجھ سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی وضاحت عام زبان میں ہو جو موجودہ دور میں بغیر کسی الجھن کے حل ہو سکے۔

جس دور میں قرآن نازل ہوا اس وقت انسان کی زبان میں کئی سگنل یا اشارے ہوتے تھے۔ اور تمام فصاحت و بلاغت کے باوجود قرآن نے بھی بعض اوقات کچھ اشاروں سے کچھ پیغامات دیئے ہیں۔ ان پیغامات میں ایسے مضمرات موجود تھے جو غور و فکر کے متقاضی تھے اور اللہ تعالیٰ کی منشا تھی کہ انسان اپنی عقلی اور قلبی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لائے اور کلام الٰہی پر غور و فکر کرے۔ اور یہ غور و فکر ذہنی دریچوں کو کھولے بغیر ممکن نہیں تھا۔

اس لیے جب قرآن کہتا ہے کہ اللہ آدمی کی شہ رگ سے بھی قریب ہے تو اس کا بھی کچھ مطلب ہے اور اسی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور اگر ممکن ہو تو سائنس اور نفسیات کے جدید علوم سے بھی مدد لینا ہوگی تا کہ اس آیت کا مطلب ہم اس کی گہرائی میں جا کر اخذ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دماغ دیا۔ عقل دی اور اس کے ساتھ زبان بھی دی تا کہ وہ تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر حکمت و دانش کے دریچوں میں جھانک سکے۔

سائنسدانوں نے حال ہی میں انسانی دماغ میں ایک ایسا لوتھڑا (Module) دریافت کیا ہے جو خدا اور بندے کی قربت کا تعین کرتا ہے اسے سائنسدان خدائی لوتھڑا یا (God Module) کہتے ہیں۔ اس سے مذکورہ بالا قرآنی آیت (۵۰:۱۶) کے مضمرات مزید آشکارا ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اللہ کی قربت کے لیے خالق حقیقی نے نہ صرف روحانی طور پر بلکہ طبعی لحاظ سے بھی یہ صلاحیت آدمی میں ودیعت کی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کو سمجھے اور جہاں تک ممکن ہو اس کی قربت حاصل کرے۔ قرآنی زبان میں یہی مدعا زندگی ہے۔ قرآن کی یہ آیت (۵۰:۱۶) نہ صرف ہمیں اللہ سے

Marfat.com

قربت کا تصور مستحکم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے بلکہ ہمارے اعتماد اور ذوق میں بھی اضافہ کرتی ہے ہمیں یہ تسکین ہوتی ہے کہ ہم اس دنیا میں تنہا نہیں بلکہ ہمارا خالق ہمارے ساتھ ہے اور ہماری معاونت کے لیے ہمارے بہت نزدیک ہے جہاں اس سے سوز و سرور ملتا ہے وہاں یہ ہمیں معرفت و حکمت کے رموز سے آگاہ کرتا ہے۔ قلبی اور روحانی طمانیت کے ساتھ جمالیات ذوق و شوق میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس عمل سے ہمارے قلب و نظر میں پاکیزگی بھی پیدا ہوتی ہے۔

ایک صاحب نظر کے خیال میں اس کلام سے قلبی امراض کو شفا بھی ملتی ہے۔ کور ذوق۔ بدذوقی شقاوت۔ غرور تکبر۔ حسد و عصبیت جیسی بیماریوں سے بھی نجات ملتی ہے۔ اللہ سے قربت کا خیال ہی ایک بہت خوشگوار اور ایمان افروز فعل ہے جس سے آدمی کو ذہنی۔ قلبی اور روحانی تقویت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ آدمی اس کو پختہ یقین کے ساتھ اپناتے اور زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالے۔

یہ تصور انسان کی بقا اور ارتقا کا بھی ضامن ہوسکتا ہے اور اسے صاحب حسن و سرور بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

Marfat.com

Marfat.com

ثلث

قال اللہ تبارک و تعالیٰ

قل اللھم مالک الملک تؤتی

الملک من تشاء وتنزع

الملک ممن تشاء وتعز من تشاء

وتذل من تشاء بیدک الخیر

انک علی کل شئ قدیر

مشقہ محمد علی المکی

Marfat.com

Marfat.com

عقل سلیم اور عقل طاغوتی

باب ۱۷

قرآن کریم کی تخلیقی خصوصیات

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ الشَّیۡطٰنُ یَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ ○

(سورہ ۹: ۳۲)

فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ○

''اور جب میں نے آدمی کو اس کی شکل مکمل کر دی اور اس میں اپنی روح پھونک دی تو میں نے حکم دیا کہ اس کے آگے جھک جاؤ اور سجدہ بجالاؤ'' (سورۃ ۲۹: ۱۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدمیت اور مقصد حیات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اس کے علاوہ سورۃ سجدہ کی آیات ۷۔۹ میں تخلیق کے عمل کی کچھ وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''اس نے (خدا نے) انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے جوہر سے چلائی جو حقیر پانی کے مانند ہے اس کو اس سے درست کیا۔ اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ اور تم کو کان دیئے آنکھیں دیں اور دل دیا۔ اور تم لوگ کم ہی شکریہ ادا کرتے ہو۔

(۹۔۷: ۳۲)

یہاں اللہ تعالیٰ نے اس تخلیقی عمل کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعہ انسان کا وجود دیکھنے میں آیا۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے جو بے شمار خصائل اور خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کو متحرک رکھنے کے لیے ایک مربوط جسی۔ نفسیاتی اور جنسی نظام قائم کیا گیا۔ جنہیں دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کے لیے اجزائے

Marfat.com

جسی کی تکمیل کے بعد اس میں اپنی روح پھونک دی۔

اس نظام کا کمال یہ تھا کہ خود انسان کے اندر تناسل کی طاقت رکھ دی گئی تا کہ نظام حیات چلتا رہے۔

پھر اپنی روح کے ذریعہ اس میں زندگی، شعور اور عقل پیدا کر دیئے جس سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔

پھر انسانوں کی نشو و نما اور بالیدگی کے لیے ایسی قلبی۔ عقلی اور روحانی نظام قائم کرا دیا جسکی بدولت انسان حسن معراج کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائے۔

''یہ آیات قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہیں جو انسان اول کی براہ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون (Darwin) کے زمانے سے سائنسدان حضرات اس تصور پر بہت ناک چڑھاتے تھے۔ اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دیتے تھے۔ لیکن انسان کی نہ سہی۔ تمام انواع حیوانی کی نہ سہی اولین جرثومہ حیات کی براہ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہ چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو اگر نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے۔ حالانکہ صرف ایک خلیہ والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اس سے لاکھوں درجہ غیر سائنٹیفک بات ہے جتنا نظریہ ارتقا کے قائلین نظریہ تخلیق کو ٹھہراتے ہیں۔

اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ بات مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے اور پھر اسکی نسل تناسل کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔

اس بات کو مان لینے سے اور بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارو بینیت کے علمبر داروں کی ساری سائنٹیفک قادبازیوں کے باوجود ان کے نظریہ ارتقاء میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں''۔

یہ تخلیقی عمل ایک نہایت سمجھے بوجھے خوبصورت انداز میں شروع ہوا اور اسی حسین و تندرست حالت

میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو ایک احسن،خوبصورت شکل میں پیدا کیا۔(**لقد خلق الانسان فی احسن تقویم**: سورۃ(۹۵:۴))

انسان کو بہترین شکل دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف طبعی حواس اس میں ودیعت کئے جن سے اس میں دیکھنے۔سننے اور سونگھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ اس کے ساتھ اپنی روح بھی اس میں پھونک دی تاکہ انسان میں وہ تمام خواص پیدا ہوں جو حقیقت میں اسے عملی طور پر حسین اور فعال بنا دیں۔ [۱]

روح انسان میں وہ تمام خوبیاں پیدا کر دیتی ہے جو اس کی جمالیاتی،اخلاقی،قلبی اور روحانی اقدار کا رنگ نکھارتی ہیں یہ اقدار اس شعور کو بیدار کرتی ہیں جو انسانی شخصیت کو دوبالا کرتی ہیں۔

ان آیات میں ایسے طبی اور حسی عطیات کا ذکر کیا گیا ہے جو ہماری سوچ۔فکر کو متحرک کرتے ہیں۔

قلبی اور علمی لحاظ سے جو شعور آدمی کو حاصل ہوتا ہے وہ اس کی زندگی میں مقصدیت اور طمانیت پیدا کرتا ہے مقصدیت اور طمانیت کے بغیر زندگی بے معنی ہے انسان کا طبعی جسم مادی چیلنجوں کے تحت نشوونما پاتا ہے اور اس کی روح شعور اور عقل کے ذریعہ سوچ وفکر اور تفکر وتدبر کے دریچے کھولتی ہے انسانی جسم مادی قوانین کے تحت برسرپیکار رہتا ہے اور ترقی وتنزل کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اپنے انجام تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا انجام آخر کار فنا ہو جانا ہے لیکن اس کے برعکس انسان ی روح ایسی خوبیوں سے متصف ہوتی ہے جو اعلیٰ معیاری اقدار کی عکاسی کرتی ہیں اور زندگی کو وجدان۔بالیدگی اور عقل سلیم عطا کرتی ہیں۔ان خوبیوں کے باعث انسانی زندگی میں نکھار آتا ہے اور ربوبیت کا بھرپور انداز میں اظہار ہوتا ہے۔

ان خوبیوں کو ہم انسان کے حسی۔قلبی اور نفسی نظام میں جڑا ہوا پاتے ہیں اور حالات وواقعات کے ساتھ ان کی تاثیر ظاہر ہوتی رہتی ہے قدرت کے یہ عطیات ہمیں اپنی گوناگوں خوبیوں کے ساتھ ہر

۱۔اس ضمن میں مزید تصریحات کے لیے دیکھئے۔مولانا مودودی
تفہیم القرآن جلد چہارم،صفحہ ۴۰۔حاشیہ ۱۳۔۱۴

Marfat.com

جگہ نظر آتے ہیں بشرطیکہ ہم ان سے استفادہ کرنے کا شعور اور ارادہ رکھتے ہوں۔ اس کے ذریعہ ہماری شخصیت میں وسعت ورفعت پیدا ہوتی ہے اور نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرنے میں خصوصی مدد ملتی ہے۔

یہ حسی۔ قلبی اور نفسی نظام اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ اس میں پھلنے پھولنے اور انسان میں تخلیقی خدمات اور تخلیقات پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے نیز اس میں جذبات کو تحریک دینے اور گرمانے اور جمالیاتی اور روحانی قلبی اور فطری وظائف بطریق احسن سرانجام دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس نظام کا مطالعہ دلچسپ ہیاور انتہائی فکر انگیز بھی اس سے عقل و دانش کے دریچے کھلتے ہیں اور انسان کی مجموعی صلاحیتوں میں بھرپور اضافہ ہوتا ہے۔ یہ نظام نہ صرف انسان کی فطری صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اسے تہذیب اور شائستگی کی خوبیوں سے بھی مزین کرتا ہے۔

نیز اس نظام کا مطالعہ ہم پر ایسی کیفیات کا بھی انکشاف کرتا ہے جو ہمیں اپنے رب اور خالق سے ایک رشتہ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں یہ رشتہ دائمی ہے اور اس کا سبب وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں پھونک دی ہے جوں جوں انسان ان کیفیات کا مشاہدہ کرتا ہے اس کا علم اور شعور اجاگر ہوتا ہے اور وہ اس لائیفک رشتے میں پختگی سے بندھ جاتا ہے اس رشتے کے قائم ہونے سے نہ صرف زندگی کی بے مائیگی اور محرومی کا احساس ختم ہوتا ہے بلکہ حسن و سرور کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے جو انسانی زندگی کو خوبصورت اور بامعنی بنا دیتا ہے۔

یہ رشتہ ہمیں اپنے رب رحیم کی ذات کا ادراک دیتا ہے اور ربوبیت کی ان صفات کو آشکارا کرتا ہے جو جدید دور کے سیکولر کلچر میں دبی رہتی ہیں جدید تہذیب میں مادہ پرستی اور اخلاقی انحطاط قلبی اور روحانی اقدار کو خاص حد تک پامال کر دیتے ہیں اور اس نظر و فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان اپنے خالق حقیقی تک پہنچنے کا متحمل ہوتا ہے۔

اس نظام سے استفادہ کرنے اور فطری صلاحیتیں اجاگر کرنے میں عقل سلیم اہم کردار ادا کرتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا انسان کے لیے ایک عظیم تحفہ ہے جو اسے دوسری مخلوقات پر برتری عطا کرتا ہے اگر چہ عقل کے کئی منفی پہلو بھی ہیں لیکن عقل سلیم انسان کو ان سے جداگانہ حیثیت دیتی ہے اور اس گندگی اور شرارت

سے دور رکھتی ہے جو شیطانیت کے زیر اثر انسان کو پراگندہ کر دیتی ہے عموماً شیطان کے قرب میں آ کر اور ظلم وجہل اور خدا فراموشی کے چنگل میں پھنس کر انسانی عقل اپنی فطری خوبیوں سے محروم ہو جاتی ہے اور وہ کچھ کر گزرتی ہے جو انسان کے لیے خسارہ اور شرمندگی کا باعث بنتا ہے۔

حالانکہ عقل کو بھی اللہ تعالیٰ نے حسین اور نورانی بنایا تھا لیکن اس میں پھسلنے کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جس کے سبب وہ راہ حق سے بھٹک جاتی ہے اور اس پاکیزگی سے محروم ہو جاتی ہے جو اسکا مقدر ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ بندے کو بندگی کی سطح سے گرا دیتا ہے اور وہ نہ صرف وحی وتنزیل کے اعلیٰ معارف کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے بلکہ کئی ایسی گتھیوں میں الجھ جاتا ہے جو تمام عمر اس سے نہیں سلجھتیں۔ ایسی عقل طاغوتی دلائل کا سہارا لیتی ہے اور خود پسندی اور خود فریبی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس ضمن میں عقل سلیم اور عقل طاغوتی میں امتیاز کرنا بہت ضروری ہے وگرنہ انسان اپنے خالق حقیقی سے وہ رشتہ قائم نہیں کر سکتا جو اس کا مقصود ہوتا ہے۔ [1]

عقل طاغوتی جب انسان کو بھٹکاتی ہے تو کئی ایسے خیالات اور نظریات جنم لیتے ہیں جو لادینیت اور سیکولرازم کی مختلف شکلوں میں نظر آتے ہیں ماضی اور حال میں ایسے کئی فلسفی اور مفکرین دیکھنے میں آتے ہیں جو دانشمند ہونے کے باوجود ظن پرستی کے چنگل میں پھنس گئے۔ ان لوگوں نے نہ صرف ہستی باری تعالیٰ پر شک وشبہات کا اظہار کیا بلکہ راسخ عقیدہ کے مالک علماء سے بھی بحث ومباحثہ میں اپنے مخصوص انداز میں منطقی اور عقلی دلائل پیش کرتے رہے۔ حق پرستوں کے مقابلے میں ظن وقیاس کے پیروکار ہمیشہ الجھتے رہے اور اپنے دلائل سے گمراہی کی نئی راہیں کھولتے رہے۔ امام غزالی نے ایسے فلسفیوں کی اپنی کتاب میں خوب سرزنش کی ہے اور ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ لادینیت کے علمبردار ہیں۔ [2]

انسان کا اپنا وجود اور نظام کائنات خود اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ ہستی باری تعالیٰ کا وجود دائمی اور ازلی ہے اور اس کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو عقل طاغوتی کے اثر میں راہ حق سے بھٹک جاتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر نصیر ناصر فلسفہ حسن۔ صفحہ ۹۶

۲۔ امام غزالی ''تحفۃ الفلاسفہ''

انسان کی بقا اور ارتقاء کا منبع بھی ذات باری تعالیٰ ہے اور اسی سے انسان کی ذات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے لیکن اس سے مستفیض وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو عقل سلیم اور قلبی و روحانی صلاحیتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لاتے ہیں۔

اگرچہ قیاس وظن کے تحت سوچ وفکر کے مالک فلاسفہ اور مفکرین ان فیوض سے کما حقہ، استفادہ نہیں کر پاتے جو کہ حسن وسرور کا باعث ہوتے ہیں۔ [1]

حالانکہ ان تمام حقائق کا مفہوم اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا کہ وہ بنا لیتے ہیں۔

ان تمام حقائق کا ادراک حقیقت میں ایک انسانی ضرورت ہے جو اس کی فروغ حیات کے لیے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اس (شعور) سے نہ صرف آدمی کو علم حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ اس کی صحت و سلامتی اور بالیدگی وآسودگی کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس ادراک کیذریعے ہمیں نہ صرف ربوبیت کی خصوصیات سے آگہی ہوتی ہے بلکہ کئی ایسے انسانی پہلو بھی ہم پر آشکارا ہوتے ہیں جو بصورت دیگر ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ انسانی فلاح و بہبود کا تصور اور قلبی و روحانی حسن وسرور اسی شعور کے ذریعہ ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ قرآنی کلام کا مفہوم سمجھنے سے محبت و ہمدردی اور سوز وساز آرزومندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کلام کا مقصد ہر قسم کی خیر وخوبی اور نیکی اور بھلائی کی راہیں ہموار کرنا ہے۔ اگر یہ خوبیاں اور ان کا شعور انسان میں پیدا نہ ہو تو انسان اور جانور میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

انسانی پیدائش چونکہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں ہے اس لیے اس میں وہ تمام صفات اور خوبیاں رکھ دی گئی ہیں جو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کرتی ہیں۔ اگرچہ شیطانیت کے تحت سوچ رکھنے والے لوگ اسفل السافلین بن جاتے ہیں کیونکہ اعمال کا دائرہ وضع کرتے وقت وہ اس پگڈنڈی پر قائم نہیں رہتے جو تقویٰ اور انسانیت کی اعلیٰ منزل کے لیے متعین کی گئی ہے۔

پھر انسان میں ایک بہت بڑی خوبی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے رحمت کی اور ہمدردی کی خوبی ہے۔ آنحضورؐ کو رحمت اللعالمین کہا گیا ہے۔ ہر رحمت ان کی لامحدود طور پر کون ومکاں پر پھیلی ہوئی

۱۔ امام غزالی۔ تحفۃ الفلاسفہ

Marfat.com

ہے کسی کو دکھ نہ دینا اور ہر قسم کی تکلیف خود برداشت کرنا ان کا لائحہ عمل تھا۔ یہ خوبی خلق عظیم کہلائی اور روحانی اور جمالیاتی حسن کے لیے لازم قرار دی گئی۔

انسانوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً اس خوبی سے متصف ہونا ایک قطعی بنیادی خوبی تصور کی گئی ہے۔ لیکن عملی زندگی میں مسلمان خاص طور پر موجودہ دور میں بہت شقی القلب دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ تشدد۔ شدت پسندی۔ اور تنگ نظری مسلمانوں کے کلچر اور طرز حیات کا حصہ بن گئے ہیں۔ کیا ان تمام برائیوں کے باوجود بھی ہم آقائے جہاں رحمت اللعالمین آنحضورؐ کے پیروکار کہلا سکتے ہیں۔

انسان کو زندگی دیکر اللہ تعالیٰ نے حیوانوں کی طرح نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے ان خوبیوں سے مزین کیا گیا تاکہ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں ربوبیت اور انسانیت کے لازم پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے گزارے۔ عقل سلیم اختیار کرے اور عقل طاغوتی سے اجتناب کرے۔

ڈاکٹر نصیر نے اس کے لیے حسن کاری کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جمالیاتی تخلیق (Aesthetic artistic creation) ہے جس کو انسان ''اپنے خون جگر، حُسن، جذبہ و احساس، حُسن فکر، حُسن ہنرمندی اور عقل سے مزید حسین بناتا ہے۔

اگر انسان کی پیدائش کا یہی مقصد ہے جسے ہم نے مذکورہ بالا الفاظ میں بیان کیا ہے تو اس سے بہتر اور کونسا تصور ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کو بناتے وقت ذہن میں رکھا تھا۔

یہاں ہم ربوبیت پر بھی مزید روشنی ڈال دیں کیونکہ اس کے بغیر انسانیت ممکن نہیں ہے۔ اس کی (وضاحت) کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

''روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز ایک صاحب شخصیت ہستی، صاحب انا ہستی اور حامل

Marfat.com

خلافت ہستی بنتا ہے اس روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی ملک ہے اور اس کی ذات پاک کی طرف اس کا انتساب اسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اس کی چیز کہلاتی ہے یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے۔ اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آئے ہیں۔

''ربوبیت دراصل ایک فکر انگیز قرآنی مطالعہ ہے اور اس کا مطلب ہے اپنی تخلیق کی اس سوز محبت کے ساتھ پرورش ونگہداشت کرنا جس طرح ماں کی ممتا اپنی اولاد کی پرورش ونگہداشت کرتی ہے۔ نیز اس کی استعدادوں کو اس طرح قوت سے فعل میں لانا وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے''۔ [۱]

انسان میں اپنی روح پھونکنے کے بعد اور اسے تمام خوبیوں سے مزین کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے خلیفہ فی الارضی بنا دیا اور اس پر بھاری ذمہ داری عائد کر دی کہ اسے اپنے اعمال کا مکلّف بنا دیا گیا۔ ہر اچھا اور برا عمل اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ چھوٹے سے چھوٹی اچھائی اور برائی کے لیے اسے جواب دہ بنا دیا گیا ہے۔ (قرآن۔ سورۃ ۵۔ ۹۹:۱)

اُسے تقدیر کا بھی نام دیا گیا ہے۔ تقدیر کو بنانے یا بدلنے سے مراد ایک ایسا انقلابی قدم اٹھانا ہوتا ہے جو فکر ونظر، نذیر وشعور کے دھارے بدل کے رکھ دے اور انسان کی معراج کمال پر پہنچا دے۔

تقدیر کو اللہ کی رضا بھی کہا گیا ہے اور اس سے مراد وہ حالات وواقعات ہیں جو انسان کی زندگی می رونما ہوتے ہیں۔ یہ ایک مافوق الفطری حقیقت سمجھی جاتی ہے اس کا شعور جہاں ہمیں نامساعد حالات سے برسرپیکار ہونے کا سبق دیتا ہے وہ ہمیں ایسی تخلیقی کاوشوں کے لیے بھی تیار کرتا ہے جو عموماً ہماری

۱۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر۔ فلسفہ حسن۔ صفحہ ۹۷

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الحجر، حواشی ۱۷۔ ۱۹

دسترس سے باہر ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کا نظام چونکہ اس کی مرضی اور منشا کے مطابق چل رہا ہے اور ہم اس کا ایک معمولی سا جزو ہیں اس لیے وہ ہماری زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

یہاں آدمی کا یہ گھمنڈ بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ وہ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے کئی موقعوں پر اسے ہزیمت برداشت کرنا پڑتی ہے جو وہ اپنی قسمت کا جزو سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ان حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتا جو مابعد الطبعی طاقت نے ہمارے گرد قائم کر رکھی ہیں قرآن آدمی اور دوسری مخلوقات (جنوں وغیرہ) کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اگر طاقت رکھتے ہیں تو ان قیود سے نکل کر دکھائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے گرد قائم کر رکھی ہیں۔[1]

قرآن کا یہ چیلنج (۵۵:۳۳) انسان کو اسکی بے بسی کا احساس بھی دلاتا ہے کہ آدمی واقعی تمام صلاحیتوں کے باوجود وہ غیر معمولی اور مافوق الطبعی طاقت نہیں رکھتا جس کی بدولت وہ اللہ کی حدود سے بھاگ نکلے اور اس کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔

یہ آیت منکرین حق کے لیے بھی ایک کھلا چیلنج ہے کہ وہ کہاں تک اللہ کے احکامات کی نافرمانی کریں گے۔ آخر کار ایک دن تو پکڑے ہی جائیں گے۔ وہ نہ ہی موت سے بچ سکتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں حساب کتاب سے۔

یہاں آدمی کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ خود سمجھے کہ حق کیا ہے اور ازندگی کا کونسا رخ آدمی کو صحیح سمت میں لے جا سکتا ہے۔ سرکشی، بغاوت اور تکذیب حق کا سلسلہ خسارے کا سودا ہے۔

اب ان حقائق کا ادراک کرنا اور ان پر ایمان لانا یا نہ لانا انسان کے اپنے بس میں ہے اور تقدیر یہاں حائل نہیں ہوتی۔

بہر کیف انسان کی تخلیق اور نشو و نما میں اللہ کا پیدا کیا ہوا حسی۔ قلبی اور نفسیاتی نظام ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس کی زندگی کے خدوخال سنوارنے یا بگاڑنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے اس نظام کو جاری ساری رکھنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا انسان کا ایک فریضہ ہے۔ جس کو بطریق احسن پورا کر کے وہ ان خوبیوں سے مزین ہو سکتا ہے جو اس کے مقدر کی زینت ہوتی ہیں۔

۱۔ قرآن مجید = ۵۵:۳۳

Marfat.com

قلبی نظام دل و دماغ پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنے دقیق اور پیچیدہ نظام کے باعث انسان کے اعمال اور اس کی تقدیر کا جائزہ لیتا رہتا ہے اس کی بدوت کاروان حیات چلتا رہتا ہے اور منزل مقصود کی جانب رواں دواں نظر آتا ہے۔

پھر اس نظام میں نفس امارہ اور نفس لوامہ کی جنگ جاری رہتی ہے۔ برائی اور اس پر سرزنش کا عمل جاری رہتا ہے اور تنبیہ کرتا رہتا ہیکہ آدمی کہاں بھٹک رہا ہے۔ جو شخص نفس لوامہ کی آواز سن لیتا ہے وہ بھٹکنے سے بچ جاتا ہے اور اعلیٰ مراتب حاصل کر لیتا ہے اور نفس مطمئنہ کا مالک بن جاتا ہے۔

لیکن انسان اکثر اپنے فیصلے جلد بازی میں عقل طاغوتی اور بھٹکی ہوئی خواہشات کے زیر اثر کرتا ہے اور اس طرح راہ حق سے بھٹک جاتا ہے اور تقدیر کی تاریکیوں میں دب کے رہ جاتا ہے۔ حالانکہ تقدیر اس کی مختلف بھی ہوسکتی ہے۔

ہمارا دینی اور ذہنی شعور جہاں ہمارے قلب ونظر کو وسعت بخشتا ہے وہاں وہ عالم انفس و آفاق کا مشاہدہ کرنے میں بھی راہ ہموار کرتا ہے اس مطالعہ سے حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو ہمارے ذہن اور روح کی غذا بنتے ہیں۔

نیز دین کا مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کی منزل مقصود کا تعین کرے اور اسے وہاں پہنچنے میں اس کی رہنمائی کرے۔

دین اصل میں مشیعت الٰہی اور فطرت کے تقاضوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ایک احسن طریق کار ہے دین کا مقصد یہ ہیکہ انسان علم وشعور کے ذریعہ اپنی دینوی واخروی زندگی کو حسین بنائے اور زندگی حسین راستے پر چل کر حسن الماب میں پہنچ جائے۔

''یعنی پہلے اس نے براہ راست اپنے تخلیقی عمل (Direct Creation) سے انسان کو پیدا کیا اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفہ سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور وتعقل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے

Marfat.com

کہ آئندہ مزید انسانوں کی پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ آیت قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہے جو انسان اول کی براہ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون کے زمانہ سے سائنس دان حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں لیکن انسان کی نہ سہی تمام انواع حیوانی کی نہ سہی اولین جرثومہ حیات کی براہ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغویات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے حالاں کہ صرف ایک خلیہ (CO) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اس سے لاکھوں درجہ غیر سائنٹیفک بات ہے جتنا نظریہ ارتقاء کے قائلین نظریہ تخلیق کو ٹھیراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کر حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا۔ تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباعت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے اور پھر اس کی نسل تناسل (Procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے علمبرداروں کی ساری سائنٹیفک شاعری کے باوجود ان کے نظریہ ارتقاء میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔

(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل، آل عمران، حاشیہ ۵۳، النساء حاشیہ، الانعام، حاشیہ ۶۳، جلد دوم الاعراف حاشیہ ۱۰۔ ۱۴۵، الحجر حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۵، المومنون، حواشی ۱۲۔ ۱۳۔

Marfat.com

Marfat.com

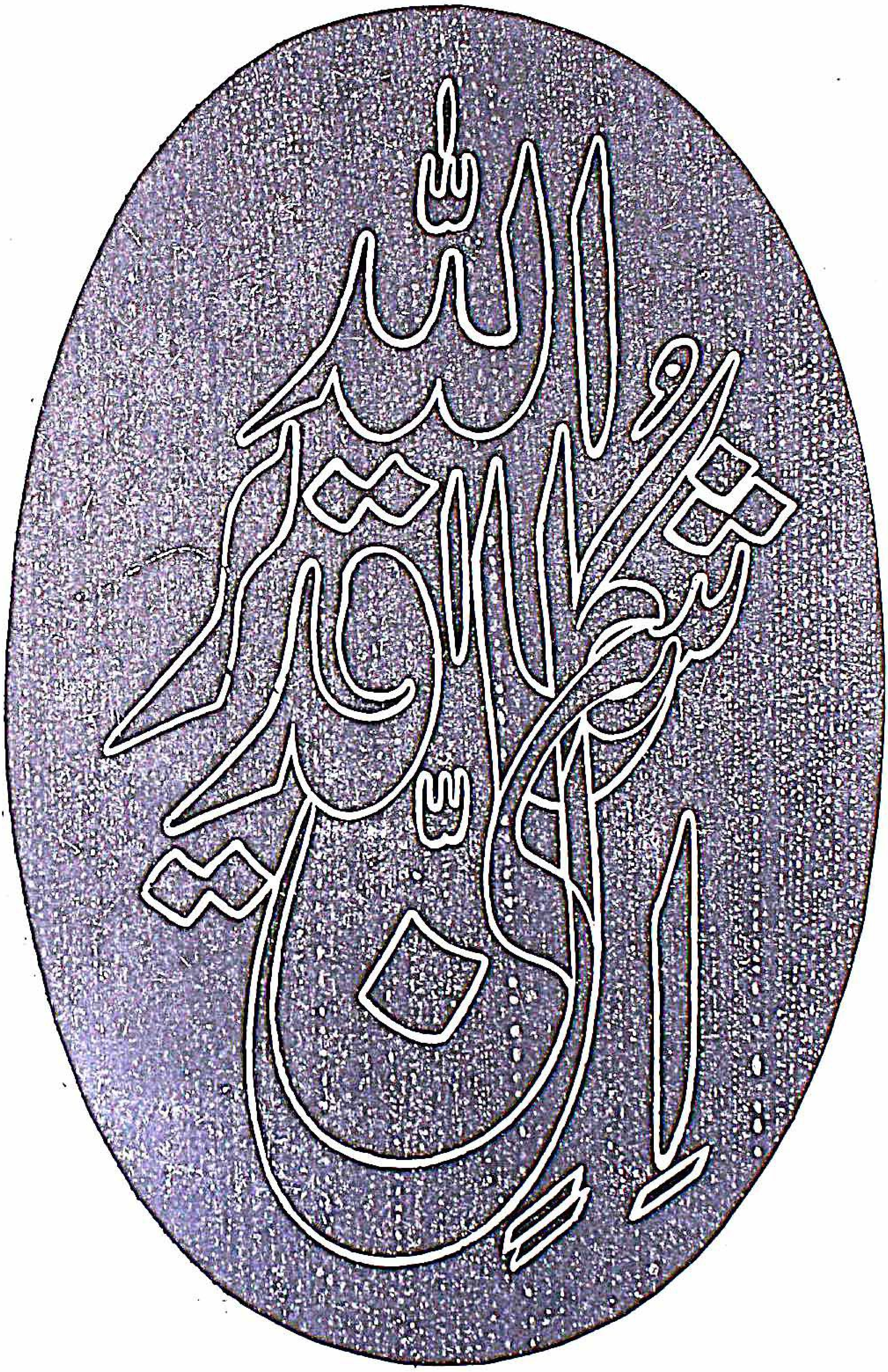

Marfat.com

Marfat.com

روحانی تجربات اور مکاشفات ﴿باب ۱۸﴾

ذکر الٰہی انسانی زندگی کا سرمایہ

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (آیت ۶۲:۱۰)

''اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ○ (آیت ۲۹:۴۵)

''بے شک نماز برائیوں اور قبیح حرکات سے باز رکھتی ہے''۔

یہ دونوں قرآنی آیات انسان کی زندگی میں سکون۔ طمانیت۔ نیکی اور بھلائی پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ فلاح و بہبود کا کن عوامل پر انحصار ہے۔

انسان کی کامیابی اللہ کے ذکر اور نماز میں ہے۔ نماز بذات خود ذکر کی ایک اعلیٰ اور حسین شکل ہے۔

ذکر کو اس لیے اسلام کا مغز اور روح قرار دیا گیا ہے یہ انسان کو اللہ کے نزدیک کرنے کا ایک بہت کامیاب ذریعہ ہے۔ اس سے نہ صرف انسان کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے بلکہ ایسی طمانیت۔ مسرت اور سرور حاصل ہوتا ہے جو کسی اور ذریعہ سے حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگرچہ دنیاوی زندگی میں ایسے کئی الملغو ذرائع بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو وقتی خوشی مہیا کرتے ہیں لیکن بالآخر ان کے اثرات مستقل اور دیرپا نہیں ہوتے۔

ذکر کی کئی شکلیں ہیں اور سب سے اعلیٰ و ارفع قرآن مجید کا پڑھنا اور اس پر عمل کرنا ہے چونکہ نماز میں قرآن کریم کا باقاعدہ تسلسل کے ساتھ ذکر ہوتا ہے اس لیے اسے بہترین اور سب سے حسین شکل قرار

Marfat.com

دیا گیا ہے۔

جوں جوں انسان حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہستی میں اپنا ایمان و یقین پیدا کرتا ہے اس کا ذکر کا عمل تیز تر ہو جاتا ہے اور وہ اپنا بیشتر وقت اللہ کے ذکر میں صرف کرتا ہے۔ علاوہ ازیں دنیاوی زندگی کو قرآن مجید میں لہو ولعب اور دھوکے کی پونجی کے مترادف قرار دیا گیا ہے اس لیے ذکر کا مرتبہ اسی نسبت سے مستحکم ہو جاتا ہے۔ ہم جوں جوں ذکر اللہ کا سلسلہ تیز تر کرتے ہیں ہمارے لیے طمانیت و مسرت کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔

عبادات یں ذکر و افکار کا عمل قرآن سنت سے ماخوذ ہے۔ ذکر و اذکار کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ وہ اللہ کا قرب دینے کے ساتھ انسان کو قلبی اور روحانی طمانیت بھی دیتا ہے۔

یہاں کئی لطیف جمالیاتی اور نفسیاتی پہلو بھی مخفی ہیں جو ذکر اللہ کے عمل کے ساتھ آہستہ آہستہ واضح ہوتے رہے ہیں۔ شیخ سہل عبداللہ بن تستریؒ فرماتیہیں کہ اگر ہر حرف کے لیے بندے کو ایک ہزار فہم عطا کئے جائیں تب بھی اس کی رسائی کتاب کی ان گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی جو کہ اس میں مخفی ہیں۔ کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس لیے یہ اس کی صفات کا مظہر ہے اس کلام کے ذکر سے انسان ان خوبیوں سے متصف ہوتا ہے جو اس کی آیات میں بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح اللہ کی خوبیاں لامحدود ہیں اسی طرح اس کے کلام کے مفاہیم بھی بے شمار ہیں اور انکا جائزہ لینے کے لیے ہمیں بار بار انکا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ذکر کرنیوالوں کے دلوں کو کھول دیتا ہے تو وہ قرآن مجید کے مفاہم بھی حسب توفیق سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور فکر آفرین سلسلہ ہے۔

قرآن فہمی کے لیے انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ قرآن سننا اور پڑھنا ضروری ہے بعض علماء کے نزدیک اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ سننے والا یہ تصور کرے کہ وہ اسے براہ راست اور اس کے رسولؐ کے ذرائع سے سن رہا ہے دوسرا درجہ یہ ہے سننے والا سمجھے کہ یہ کلام حضرت جبرائیلؑ اسے سنا رہے ہیں اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ گویا حق تعالیٰ اسے یہ کلام سنا رہے ہیں۔

ان درجات کا تعین خود قرآن کی آیات سے ہوتا ہے۔ قرآن فہمی کے لیے قلب سلیم کا ہونا لازمی

Marfat.com

ہے قلب سلیم سے مراد ایک ایسا دل ہے جس میں اللہ ہر وقت موجود ہے اور جو گندگی اور قبیح خیالات سے محفوظ ہو۔ قلب سلیم کے ساتھ تدبر و تفکر کا سفر بھی بروئیکار لایا جائے تاکہ غور و فکر کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے دل نہیں اکتاتا بلکہ وہ زیادہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے اسے نظریہ محبت بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی دید و شنید دونوں ہی باعث سعادت و برکت ہوتی ہیں۔

ہم کلامی اور ہمنظری ایک بنیادی ضرورت ہے جس کی موجودگی محبت کا شعلہ جلائے رکھتی ہے قرآن کریم کا ذکر نہ صرف تفکر و تدبر میں اضافے کا باعث بنتا ہے یہ بالآخر انتہائی فکر انگیز اور ایمان افروز بھی ثابت ہوتا ہے۔ تفکر و تدبر کے علاوہ استقامت بندگی، ذوق و شوق اور توکل و اخلاص ذکر کی شدت اور محبت میں اضافہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بڑائی صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر شے اس کا ذکر کرتی ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے ''کہ کائنات اور اس کی اشیاء اپنے خالق و رب کی تسبیح کرتی رہتی ہیں لیکن انسان کو اس حقیقت کا فہم اور ادراک نہیں ہے۔'' ؎۱

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک اور جگہ (البقرہ ۱۶۵:۲) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا اس کے شریک بنالیتے ہیں ان سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے ہیں اور جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ سے شدید تر یعنی سب (مخلوقات) سے زیادہ اور شدید ترین محبت کرتے ہیں۔ ؎۲

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہر شے اپنے مقدور کے مطابق کچھ شعور رکھتی ہے اور اللہ کے ذکر میں محو رہتی ہے۔ لیکن انسان جو عقلی اور قلبی اعتبار سے تمام مخلوقات سے اعلیٰ و ارفع ہے اس خوبی میں قدرے پیچھے رہ

۱۔ قرآن مجید ۸: ۲۲

۲۔ قرآن مجید ۱۶۵:۲

Marfat.com

جاتا ہے وہ لوگ جو زندگی کی رنگینیوں سے مسحور ہو کر اپنے خالق و ربّ کریم کو بھول جاتے ہیں وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

جدید دور کی سائنس بھی اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ کائنات اور اس کی تخلیقات میں ایک خاص قسم کا شعور پایا جاتا ہے جو انہیں ایسے احوال و ظروف کے مطابق زندگی گزارنے اور اللہ کا ادراک رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اب آشکارا ہو چکی ہے کہ نباتات میں زندگی اور اس کا شعور اور احساس ہوتا ہے، ان میں جنسی جبلت اور مذکر و مونث کی تقسیم بھی موجود ہے جس کی طرف قرآن نے آج سے چودہ سو برس پہلے اشارہ کر دیا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان، حیوان اور نباتات کے نظام حیات میں کچھ قدریں مشترک ہیں جن میں شعور اور جنسی جبلت کسی نہ کسی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان اقدار پر زندگی کی بقا اور ارتقاء کا دارومدار ہے۔ انہی کی بدولت توالد و تناسل کا سلسلہ جاری و ساری ہے وگرنہ زندگی کبھی کی ختم ہو گئی ہوتی۔

بہر حال یہ زندگی کی ہی بدولت ہیکہ انسان شعور و ادراک سے متصف ہونے کے بعد ارتقاء کے بہت سے مراحل کامیابی سے طے کرتا ہے اور اپنے رب حقیقی کو پہچانتا ہے۔ یہ شعور ہی کی بدولت ہیکہ عالم حیات میں انسان اللہ کو پہچاننے کے ساتھ ان خوبیوں کا بھی ادراک رکھتا ہے جو اس کی تشکیل و تکمیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پھر وہ ان ہی کی بدولت ایک ایسے مرتبے پر فائز ہوتا ہے جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

انسانی زندگی کا بنیادی مقصد قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کی پہچان اور پرستش ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''

عبادت کا تصور اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک آدمی میں یہ شعور نہ پیدا ہو جائے کہ وہ کس کی مخلوق ہے اور کس نظام حیات میں منسلک ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے کہ وہ اپنے تمام حسی۔ نفسی اور قلبی صلاحیتوں کو ہستی باری تعالیٰ کو سمجھنے کا ادراک پیدا کرے اور اس کی خاطر خواہ انداز میں پرستش کرے۔ ذکر چونکہ پرستش کا لازمی جزو ہے اس لیے اس کے بغیر پرستش اور عبادات کے مضمرات کو مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

Marfat.com

حسی قلبی اور نفسی نظام کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے پراگندہ خیالات کا جائزہ لے اور قبیح انداز فکر کو بدلے۔ شعور وادراک کا سلسلہ اسے ان عوامل سے دور رہنے کی ترغیب دیتا ہے جو کہ تزکیہ اور پاکیزگی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ قرآنی سمت میں سوچے بغیر ذکر اور عبادات کا سلسلہ بھی جاری نہیں ہوسکتا۔

محبت کا جذبہ جہاں انسان کو اپنی بیوی اور اولاد کی طرف راغب کرتا ہے وہاں وہ دوسری مخلوقات سے ہمدردی وشفقت اور اپنے خالق کو سمجھنے اور اس کی پرستش کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ یہ جذبہ شعور کو اجاگر کرتا ہیاور نفسی۔ جمالیاتی اور باطنی نظام کی اصلاح کی بھی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے محبت کا محرک صرف جنسی جذبہ ہی نہیں بلکہ وہ تقدس و لطافت ہے جو ذکر الٰہی اور ایمان و آگہی کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں محبت کا ایک شدید جذبہ کارفرما ہے۔ اگر وہ انسانوں۔ حیوانوں اور دیگر مخلوقات سے محبت نہ کرتا تو نظام حیات کا بقاء اور ارتقاء ممکن نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے رب اللعالمین ہونے کے اس طے سے اپنی شان اور ربوبیت نہ صرف انسانوں، حیوانوں، جنوں اور فرشتوں پر آشکارا ی بلکہ تمام دیگر مخلوقات اسی کی رہن منت ہیں اور اسی کی بدولت اپنی حیات سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی کا عطیہ ہے کہ سورج اپنی شعائیں دنیا میں ہر سو بکھیر رہا ہے۔ چاند اپنی روشنی سے دنیا کو منور کر رہا ہے اور ہوا، پانی اور قدرتی کمالات بنی نوع انسانی کو ہر لحہ مستفیض کر رہے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت آڑے نہ آئے تو انسانوں کے بداعمال دنیا کو کبھی کا تباہ کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہم ہمدردی اور محبت کو ہمیشہ اپنائے رکھیں۔ حضرت معین الدین چشتیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''انسان کو چاہئے کہ سورج کی سی گرمائش، دریا کی سی سخاوت اور زمین کی سی تواضع وشفقت اختیار کرے۔''

یہ سبق ہمیں بہت واضح طور پر آنحضورؐ کی زندگی سے ملتا ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ''رحمت اللعالمین'' بنا کر تمام جہانوں کے لیے بھیجا۔ آپؐ اپنی محبت وشفقت کی وجہ سے تمام انسانوں کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئے۔

Marfat.com

رب العالمین کی محبت اور شفقت جو تمام رحمتوں اور محبتوں کا منبع ہے تمام دنیا پر محیط ہے اور اس کی برکتیں اور نعمتیں لامحدود اور بے شمار ہیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلمیں تب بھی اللہ کی رحمت و محبت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا کہ اس کی محبت و رحمت کے چند مخصوص مذہبی گروہ یا جنونی جنگجو حقدار ہیں قطعی غلط ہے۔ ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور دوسروں کو موردالزام ٹھہراتے وقت اپنے نقائص اور برائیوں کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

ایک شخص دعا کر رہا تھا کہ اے اللہ اپنا کرم صرف مجھ پر اور آنحضورؐ پر ہی کر اور کسی اور شخص پر نہ کر جب آنحضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ اللہ کی رحمتوں کو تم نے محدود کر دیا ہے وہ تو بے حد وسیع اور بے شمار ہیں۔ الفتح الربانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے ''سب انسان اللہ کے عیال ہیں۔ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے۔

ان حقائق کا ذکر ہم نے یہاں اس لیے کر دیا ہے کہ آج کل مسلم معاشرے میں خصوصاً پاکستان میں تشدد۔ جنگ و جدل اور مار کوٹ کا بازار گرم ہے اور مسلمان ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اگر ہم آنحضورؐ کے پیرو کار ہیں اور اللہ کی محبت کے طلبگار تو ان اعمال کا کیا جواز ہے اور ہم کس طرح ایک اچھے مسلمان یا انسان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں ہمارے نزدیک ذکر اذکار اور عبادات کے ساتھ ایک صالح اور پر امن انسانی معاشرے کا قیام بھی بہت ضروری ہے۔ یہ قرآن اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے انحراف ہوگا اگر ہم ایسے معاشرے کے قائم کرنے میں ناکام ہو جائیں تو ہماری عقیدت اور عبادت ناکارہ ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن (سورۃ ۱۰۷:۱-۷) میں فرمایا ہے کہ جو نمازی بیواؤں اور یتیموں کو کھانا نہیں کھلاتے اور ہمدردی و شفقت کی ترغیب نہیں دیتے ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے چہروں پر مار دی جاتی ہیں۔

ذکر اللہ اور عبادات کا اصل مقصد ہی اللہ اور اس کے بندوں سے محبت کرنا ہے اور یہی محبت انسان کو ان رحمتوں اور برکتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے جو اگر یہ رحمت آفاقی ہو تو انسان کو نہ صرف اس دنیا میں خوبصورت زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے بلکہ عالم آخرت میں بھی اس کے مراتب بلند کرتی ہے۔

Marfat.com

ذکر اللہ اور عشق الٰہی ہی دین اور ایمان کی جان ہیں اور اسی سے انسان کی روح اور جسم کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور زندگی حسین و منور ہو جاتی ہے۔

ہمارے استاد جناب نصیر احمد ناصر صاحب کی زبان میں "اسی کی بدولت انسان صاحب دید و نظر، صاحب عقل سلیم، صاحب نفس مطمنہ، صاحب حسن و سرور اور صاحب جمال و جلال بنتا ہے۔

بالفاظ دیگر اسی میں انسان کی ابدی و حقیقی سعادت و کامیابی اور فضیلت و عظمت کا راز مضمر ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کا ذکر خواہ وہ نماز، روزہ، قرآن خوانی یا دیگر فلاحی امور کی شکل میں ہو ایک نہایت اعلیٰ وارفع عمل ہے۔ اس کو بجالانے کے لیے انسان کو ذہنی، قلبی اور روحانی طور پر تیار ہونا پڑتا ہے اس کے بغیر وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے اس کی تخلیق وجود میں آئی ہے۔

ذکر الٰہی کے عمل ہی سے انسان کو روحانی اور قلبی طمانیت اور سلامتی ملتی ہے اور اس کی زندگی ایک غیر مرئی قوت سے معمور ہو جاتی ہے اس سے بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ انسان کا باطنی نظام یعنی اس کے حسی۔ نفسی اور قلبی خواص بطریق احسن کام کرنے لگتا ہے قلبی نظام کو مزید مستحکم بنیادوں پر جاری و ساری رکھنے کی زیادہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور انسان ارتقائی مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزرتا رہتا ہے۔ ان ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان "ہم کلامی اور ہم نظری" کی سعادت بھی حاصل کر لیتا ہے یہ ایک نہایت اعلیٰ وارفع مقام ہے اور یہاں پہنچ کر انسان اللہ کے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ خدا خود اسکے ہاتھ۔ آنکھیں اور دل بن جاتا ہے اور اس کی شہ رگ سے بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قلبی معراج ہے جو اس عمل کا نتیجہ ہے۔ آنحضورؐ سے جب کسی نے پوچھا کہ مومنین اور مجاہدین میں سب سے اعلیٰ مرتبہ کس کو حاصل ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ جو "اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرے گا"۔[2]

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں

۱۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر۔ "فلسفہ حسن۔ صفحہ ۱۸۳۔۱۸۲

۲۔ منیر احمد۔

کرتا ان دونوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ زندہ اور مردے میں ہوتا ہے"۔[1]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے "جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں ان ہی کے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ اللہ کی یاد سے دلوں کو تسلی و تشفی ملتی ہے۔[2]

یہ ایک ایسے راز کی بات ہے جس کا انکشاف قرآن مجید نے ۱۴۰۰ سال پہلے کیا اور جس کی تصدیق جدید سائنس طبیعات نفسیات کی زبان میں اب کر رہا ہے۔

لیکن یہ مکاشفات اور تجربات اس شخص کے حصے میں آتے ہیں جو ان ارشادات کو اپنے دل و دماغ میں اتار لیتا ہے۔

جدید نفسیاتی تجربات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو یاد کرنے والے لوگ اپنی ذہنی اور جسمانی بیماریوں پر جلد قابو پا لیتے ہیں مقابلتاً ان مریضوں کے جو اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں رکھتے اور الہامی کلام کو رد کر دیتے ہیں۔

اس لیے قرآن کا ماڈل ایک انتہائی موثر اور قابل عمل نمونہ ہے۔ جس پر عمل کرنے سے انسان نہ صرف بے شمار برائیوں اور بیماریوں سے نجات حاصل کرتا ہے بلکہ ایک ایسا مرتبہ کا بھی سزاوار ہوتا ہے جو اسے قرب الٰہی اور خوشنودی خداوندی عطا کرتا ہے یہی ایک کامیاب زندگی کا خاصہ ہے جو انسان کو اس ماڈل پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں کہ "جس شخص کا دل اللہ کے نور سے منور ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ یہ (اللہ کا ذکر) ایک ایسا نور ہے جس کی بدولت انسان اپنی حیوانی خواہشات پر قابو پاتا ہے اور برائیوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ذکر انسان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔[3]

۱۔ البخاری "کتاب الدعویٰ" ۲۸: ۱۱

۲۔ قرآن مجید ۲۸: ۱۳

۳۔ جلال الدین رومی۔ مثنوی مولانا رومی

Marfat.com

ذکر الٰہی کو جاری رکھنے کے لیے قرآن مجید میں کئی جگہ مختلف طریقے بیان کیےگئے ہیں ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تم مجھے یاد کرو اور میں تمہیں یاد رکھوں گا''

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد کیا گیا۔

''جب تم نماز اور دیگر عبادات سے فارغ ہو جاؤ تو پیچھے بیٹھے رہو اور ہر صورت میں یاد رکھو۔''

حضرت ابن باسؓ نے فرمایا کہ اللہ کو یاد کرنا تمام دوسری عبادات سے بہتر عبادت ہے۔ حضرت امام شمس الدین ابن القیوم فرماتے ہیں۔

''جو لوگ اللہ کی وحدانیت میں یقین رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں یہ یاد ان کے دلوں کو منور کرتی ہے یہ یاد ان کی قلبی اور روحانی افزائش کا باعث بنتی ہے اس کی محبت ہی اصل محبت ہے جو ہر طور تلاش کی جانی چاہیے۔

اللہ کی محبت ہی وحدانیت اور ربوبیت کے راز آشکارا کرتی ہے۔ ابن سینا کہتے ہیں کہ یہی سچائی کا ذریعہ ہے اور یہی انسان کی خواہشات اور معروضات کی معراج ہے قرآن کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور یہ ایک فطری امر ہے اور اسی محبت سے دوسری محبتیں جنم لیتی ہیں اور برگ و بار لاتی ہیں۔

انسانوں سے محبت کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے محبت دائمی اور مستقل ہے اور یہ تمام محبتوں سے زیادہ اعلیٰ و ارفع اور اشد و افضل ہے۔ اور اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے بندے اس سے سب سے زیادہ محبت کریں اور ان کی محبت اپنے رب کے لیے خالص اور سچی ہو۔

Marfat.com

Marfat.com

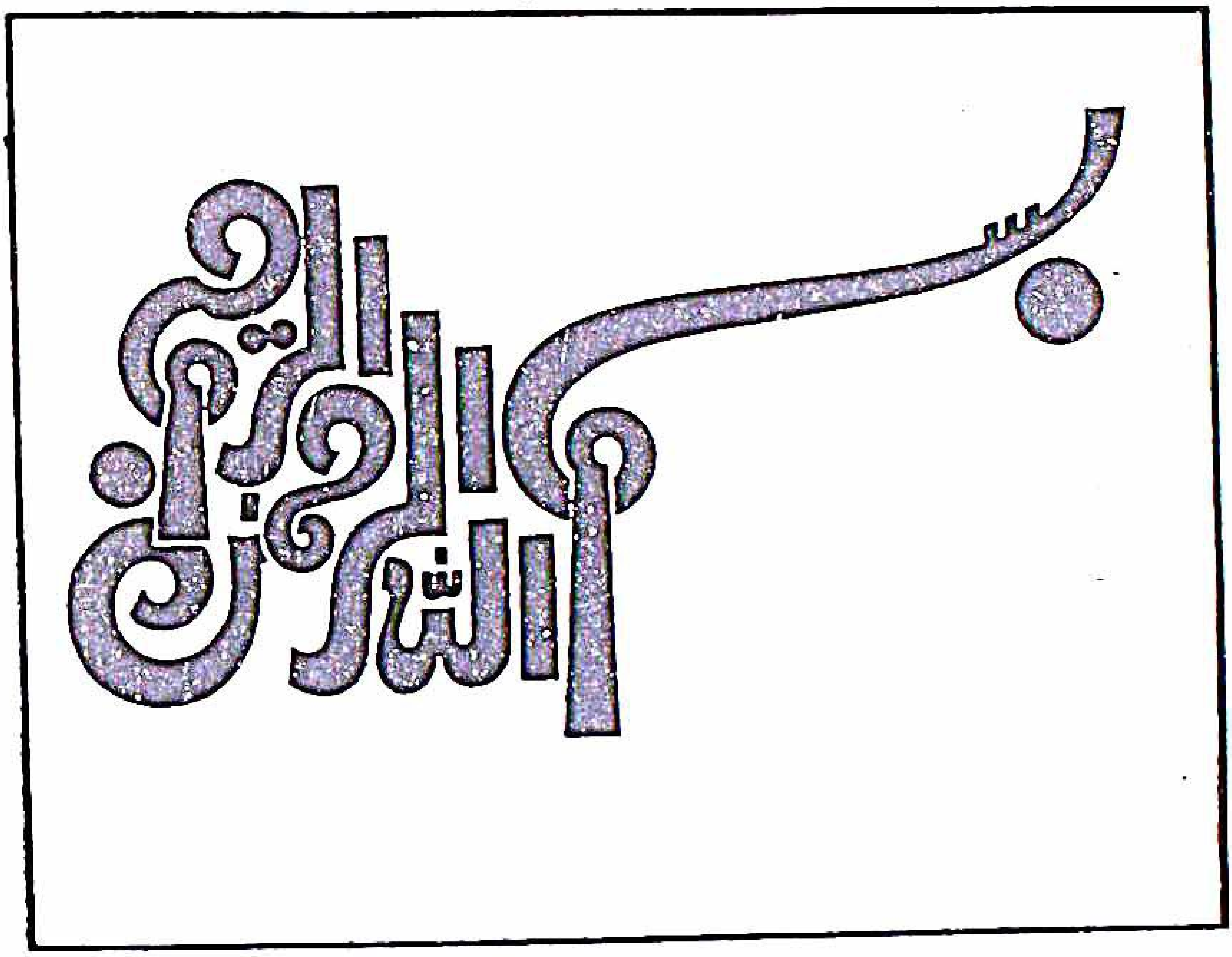

Marfat.com

Marfat.com

تدبر فی القرآن

﴿باب ۱۹﴾

قرآن فہمی سے قرآن فروشی تک

تدبر فی القرآن ایک انتہائی اہم موضع ہے جسکی قرآن حکیم میں متواتر واضح انداز میں ہدایت کی گئی ہے۔اس کتاب میں بھی ہم نے اس ہدایت پر خصوصاً زور دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ قرآن حکیم کو محض ثواب کی خاطر پڑھنے سے وہ مقصد حل نہیں ہوتا جسکی غرض سے قرآن حکیم کا نزول ہوا تھا۔

اسکا مقصد نہایت اعلیٰ اور رافع تھا جسے مسلمانوں نے کم وبیش پس پشت ڈال دیا ہے وہ اب اسے شادی بیاہ کے موقعوں پر یا بیماریوں اور مصائب کو دور کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔اور وہ بھی ناظرہ بغیر جانے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

ایک عالم دین (ڈاکٹر مرتضیٰ ملک) نے ایک مرتبہ اپنے خطبہ میں کہا کہ مسلمان ثواب کی خاطر قرآن کی بوریاں بھر رہے ہیں جنکے وزن تلے وہ خود ہی دب جائیں گے۔قیامت کے روز شاید ان کو یہ ثواب تو مل جائیگا لیکن اس دنیا میں وہ غرض وغائیت پوری ہوتی نظر نہیں آتی جو کہ قرآن کے نزول کی اصل وجہ تھی۔قرآن کا مقصد رُشد وہدایت، علم وعمل اور فلاح و بہبود تھا۔اسکا نصب العین، اخلاقی وروحانی اقداء سے مزین ہونا اور عظمت کے بلند مراتب حاصل کرنا تھا جن سے مسلمان دور بہت دور تذبذب اور تنزل کی گہرائیوں میں گرتے نظر آتے ہیں۔مسلمانوں کے معروضی حالات کا جائزہ ایک ناخوشگوار تاثر چھوڑتا ہے جو دل ودماغ کو مضمحل کرتا ہے۔قرآن سے غفلت کے سبب مسلمان نہ صرف اصل مقصد سے دور ہوتے گئے انکی انفرادی واجتماعی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی سے تہی ہوتی گئی۔علمی، عملی امور قرآن حکیم کی روشنی میں اپنی معنویت کھو چکے تھے۔

نظام وحی اور تنزیل قرآن سے ایسے مضمرات وجود میں آتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف

پہلوؤں کو بلدتے ہوئے حالات میں اثر انداز کرتے ہیں۔اس تنزیل سے ایسا نظام وجود میں آتا ہے جو تعلیم وتربیت اور رشد و ہدایت کے اہم کام سرانجام دیتا ہے۔اگر ہم اس نظام سے تغافل وتعامل برتیں تو نتائج انتہائی غیر تسلی بخش ہوں گے۔ہم نہ صرف قرآن کریم کا اصل معنی سمجھنے سے قاصر ہوں گے بلکہ اس راہ پر بھی چلنے میں ناکام رہیں گے جسکا تعین بنیادی طور پر ہمارے لئے کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ہی ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تک چلتا رہا۔اس دورانیے میں بہت سے صحائف، کتب اور انبیاء بھیجے گئے جو بنی نوع انسان کے لئے رشد و ہدایت کی روشن راہیں ہموار کرتے رہے۔یہ راہیں محض آخرت میں ثواب اکٹھا کرنے کی خاطر وضع نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس دنیا میں اطاعت وطمانیت سے بھرپور زندگی گزارنا بھی انکی غرض وغایت میں شامل تھا موجودہ دور میں مسلمانوں کی اکثریت اس خاص غرض و غائیت سے غافل ہو گئی ہے اور مسلمان لہو ولعب کی رنگینیوں میں مسحور ہو کر قرآن کے اصل مطالب سے بے بہرہ ہو گئے ہیں۔

قرآن غلافوں میں لپیٹ کر الماریوں کی زینت بنانے کیلئے نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ رشد و ہدایت اور دنیاوی اور آخروی کامیابی کیلئے نازل کیا گیا تھا۔قرآن کریم کی سوجھ بوجھ اور شعور سے ہی آدمی اپنی زندگی کو فعال اور متحرک بنا سکتا ہے۔وگرنا روحانی اخلاقی اعتبار سے زندگی جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہے اور اپنی معنویت اور مقصد کھو بیٹھتی ہے۔

قرآن کی تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ ان تمام امور کا جائزہ لیتا ہے جو زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں سے منسلک ہیں۔حسی، قلبی اور نفسی نظام اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو متحرک کرتا ہے اور علمی اور عملی نتائج کی تخلیق میں معاون ثابت ہوتا ہے۔نفسی اور اخلاقی جہاد کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ جہاد اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک کہ عقلی اور عملی ذرائع کو احسن طریق سے استعمال میں نہ لایا جائے اور قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے بھی ان ذرائع کو بروئے کار لانا نہایت ضروری ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید کا شعور نہ صرف ہمارے علمی وعملی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے وہ ہمارے باطنی، نفسی اور روحانی نظام کو بھی نہایت مثبت انداز میں متاثر کرتا ہے۔ اس کی تاثیر سے نہ صرف ہماری سوچ کے دھارے صحیح سمت کا رخ کرتے ہیں وہ قلبی طہارت اور پاکیزگی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس سے دل و دماغ کی قساوت وشقاوت بھی دور ہوتی ہے۔ اور اطاعت وسعادت پیدا ہوتی ہے۔ قرآن قلب سعید کا باعث بنتا ہے اور اس رحمت وبرکت سے سوتے پھوٹتے ہیں جو ''کشت حیات'' کو سیراب کرتے ہیں اس دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ یہی اصل ثواب ہے جو دنیا اور آخرت میں ہمارا احسن ونور ہوگا۔ اور جو ہماری کامیابی کا ضامن ثابت ہوگا۔ اس ثواب کے ذریعہ ہم حق الیقین کے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہماری روح وقلب وسلامتی وطمانیت، سرور وٹھنڈک (جیسے قرآن قرۃ العین کہتا ہے) ملتی ہے۔

ہم نے قرآنی شعور اور دنیا وآخرت میں اسکی برکات کا اپنی کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے یہاں ایک عالم دین کی کچھ ارشادات مزید وضاحت کے لئے درج کر رہے ہیں۔

۱۔ دیکھئے اقبال سید حسین کی کتابوں کی فہرست

۲۔ علامہ عبدالوحید خاں ''مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان'' اردو بازار لاہور

Marfat.com

Marfat.com

تدبر القرآن سے بعد و مغائرت

اسرائیلیات و روایات کی کثرت فلسفہ یونان و ایران کے اثرات اور تاویلات کے بیان نے مسلمانوں کے قلوب میں مقاصد و مہمات قرآنی سے غلفت و مہجوری پیدا کر دی۔ مذہب اسلام میں جس قدر الجھنیں اور موشگافیاں پیدا ہوتی گئیں اور روح جہاد و اجتہاد حقیقی مردہ ہوتی گئی مذہب کا ایک جامد و غیر متحرک تخیل مسلمانوں کے دماغ میں پیدا ہوتا رہا۔ مذہب سیاست اور خلافت و سلطنت کی علیحدگی اور پاپائیت (مشیخیت) و قیصریت کے متوازی نظام نے مسلمانوں کے سامنے دین و دنیا کا ایک عجیب تخیل پیش کر دیا۔ مذہب مذہب سیاست کی باہمی مغائرت کا لازمی نتیجہ دینی و دینوی مقاصد کی ایک دوسرے سے علیحدگی تھا۔ علماء و صوفیاء اسلام نیمذہب اسلام کا ایک راہبانہ تخیل قائم کر لیا اور دین سے جماعتی نظام اور دستور حیات انسانی کو علیحدہ کر کے اس کو حصول جنت کا ایک ذریعہ سمجھ لیا۔ دنیا اور خدا کی زمین پر بسنے والے انسانوں کے مسائل دینوی کے حل کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح جماعتی نظام اسلامی کا تخیل انفرادی مقصد نجات اخروی میں گم ہو گیا۔ اطاعت خداوندی کا لازمی و فطری نتیجہ نجات آخروی اور راحت ابدی ہے لیکن استخلاف فی الارض سے ہرگز یہ منشاء ایزدی نہ تھا کہ انسان ارضی نظام حیات اور زمینی مسائل کو پس پشت ڈال کر صرف حضور جنت کو اپنا مقصد بنا لے گا اور فرائض و اوامر کی ادائیگی کو نصب العین بنانے کے بجائے ہر کام کو محض ثواب حاصل کرنے کی غرض سے کرے گا۔ لیکن بہر حال یہ سب کچھ ہوا جب مسائل حیات انسانی اور مہمات سیاسیات ملکی کا حل کرنا ہی مقصود نہ ہو۔ اور ان امورات دینوی کو دنیا داروں اور ملوک و سلاطین کے سپرد کر دیا گیا ہو تو قرآن کریم پر غور و تدبر کرنے ہی سے کیا فائدہ؟ اس کو سمجھ کر پڑھنے اور آیات بنیات کے اسرار و خفایا کی تحقیق و تدقیق میں محنت جانفشانی سے کیا حاصل؟ جب مقصد بہت کافی وافر ہے۔ پھر اگر متمنیان جنت نے تلاوت لفظی کو اپنا شعار بنا لیا تو مقام تحیر ہی کیا ہے۔ گزشتہ کم و بیش ایک ہزار برس میں معافی دینے کا یہی سبب ہے یہی نہیں بلکہ بیشتر علماء کا خیال تو یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جب امام ابو حنیفہ کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا اور دینوی مسائل کو حل کرنے کے لیے جس قدر مسائل کا قرآن کریم استنباط استخراج ضروری تھا۔ امام موصوف نے بہم پہنچا

Marfat.com

دیا تو اب مزید غور وفکر کی کیا ضرورت؟ لہٰذا نہ صرف عوام بلکہ علماء وفقہا تک جو قرآن کریم پر تدبر کرنے کی تمام صلاحتیں رکھتے ہیں صرف الفاظ کلام کی تلاوت کو کافی سمجھ لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اہل علم حضرات نے فکر واجتہاد سے منہ موڑ کر قرآن کریم کو عملیات ووظائف کی کتاب سمجھ لیا اور دوسری طرف عربی زبان صرف عرب اور مصر میں محدود ہو کر رہ گئی ورنہ اگر مسلمانوں کے لیے نماز وقرآن کا سمجھنا لازمی کر دیا جاتا تو اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان عربی پڑھتا اور اس طرح تمام مسلمانان عالم میں ایک انسانی وحدت قائم ہو جاتی جو وحدت امت کے لیے از حد ضروری ہے غور کیجیے دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں روزانہ تلاوت کلام الٰہی کی بھینی بھینی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ قراء حفاظ لاکھوں کی تعداد میں ہر سال قرآن کریم کے دور ختم کرتے ہیں۔ کروڑوں انسانوں کی زبانوں پر ہر شب وروز میں کم از کم پانچ مرتبہ آیات الٰہی کا ورد رہتا ہے خانقاہوں اور زاویوں میں اسماء الٰہیکے ذکر اور حلقوں کی آوازیں دور دور تک فضا میں گونجتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ تلاوت وقرائیت کلام الٰہی مسلمان دنیا کے کسی حصے پر بھی امامت وامارت انسانی کے منصب پر فائز وسرفراز نہیں ہیں اور دوسری طاغوتی طاقتوں کے غلام بنے ہوئے ہیں تو اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے دستور العمل اور ضابطہ حیات کی کتاب الحکمت سے درس حیات لینا چھوڑ دیا ہے اور اس کے اسرار ومعانی وفکر کرنے کو گناہ سمجھ لیا ہے۔

حیات از حکمت قرآن نہ گیری ۔۔۔ نہ بند صوفی وملا اسیری

ترا کارے بہ ایاتش جز ایں نیست ۔۔۔ کہ از یٰسین او رآساں بمیری

خداوند تعالیٰ نے انسان کو کائنات کی ہر شے پر غور کرنے اور اس سے اپنے لیے سبق مہیا کرنے کی نصیحت کی۔ قرآن کریم میں موجودات عالم کے مختلف عناصر کو انسان کے سامنے رکھ کر اس کو ان کی حقیقت سے آشنا کیا، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر تمام انسانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ آیات الٰہی پر غور کریں اور اپنے لیے روشنی تلاش کریں۔

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا یہی نصب العین تھا وہ تلاوت کلام مصرف بہ خاطر ثواب نہ کرتے تھے۔ نہ محض قرات الفاظ ان کا شعار تھا بلکہ وہ آیت الٰہی کے مطالب پر کامل غور وفکر کرنے کی کوشش

Marfat.com

کرتے تھے۔ بعض صحابہ کرام نے ایک ایک آیت پر آٹھ برس تک غور فرمایا۔ یہ حضرت قرآن کریم کے احکام کو حرز جان و سرمایہ روح و ایمان سمجھتے تھے اور سوتے جاگتے ہر دم قرآن کریم کو بحث و مناظر یا خطابت و بلاغت حاصل کرنے کی غرض سے نہیں پڑھتے تھے اور نہ مجموعہ شعر و سخن سمجھ کر بلکہ اپنی حیات کے ہر نفس میں اس سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

لیکن جتنا زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں نے ہر شے سے اس کی صفات کو علیحدہ کر کے صرف ذات کو نصب العین بنالیا اور اس ذات کے قرب و وصل ہی کو اپنی منزل قرار دے لی۔ حالانکہ ان صفات کو حاصل کرنے کی کوشش کئے بغیر ذات سے تقرب کی نمابے کار ہے۔ خود اپنے اندر کرم و رحم پیدا کئے بغیر کریم و رحیم، سے وصل کی خواہش عبث محض ہے۔ عشق کا نصب العین ہی صفات محبوب کو اپنے اندر جذب کرنا ہے۔ مگر ان مسلمانوں نے جس طرح صفات الٰہیہ کی تقلید کرنے اور "تخلقوا باخلاق اللہ" پر عمل کرنے کے بجائے صرف ذات خدواندی کو محبوب و معشوق مجاز میں اختیار کئے جاتے ہیں بلکہ بہتوں نے تو عشق مجاز کو عشق الٰہی کا ذریعہ قرار دیا۔ اور جس طرح رسول کریم کے اسوہ حسنہ اور حیات مبارک کے اصولوں پر گامزن ہونے کے بجائے آپ کی ذات ہی کو نصب العین بنا کر اس کے تقرب و وصل میں خاک چھاننے کو عشق رسول سے تعبیر کیا۔ بالکل اسی طرح صفات اشیاء سے نا آشنا و بیگا۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کے حقائق و معارف کو پس پشت ڈال کر صرف الفاظ ولسان اور فصاحت و بلاغت قرآن کو اصل قرآن سمجھ لیا اور محض کاغذ و روشنائی کے مجموعہ اوراق کو اصل کتاب سمجھ کر اس کے ساتھ عشق و محبت کو کافی سمجھ لیا۔ اس طرح اس قدر توجہ کی کہ الفاظ قرآن کو سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی تختیوں اور حریروں دیبا پر سونے چاندی کے پانی سے لکھ ڈالا۔ مسجد کی محرابوں قبروں کے کتبوں اور محلات کے صحنوں تک پر کندہ کر دیا۔ اس کی آیتیں، کلمات اور حروف تک شمار کر ڈالے بلکہ یہ تک بھی گن لیا گیا کہ اس میں کتنے الف، کتنے بے اور کتنے دوسرے حروف ہیں اعراب تک کا شمار کر ڈالا، قرآن کریم مجموعہ شعر و سخن سمجھ کر اس کے بدائع و ضائع فصاحت و بلاغت، قصص و امثال، اعراب و الفاظ، مبہات و متشابہات اور مفردات و خواص پر ہزاروں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ لیکن خود قرآن نے جس امر پر زور دیا تھا وہ اب

Marfat.com

تک تشنہ تکمیل ہے۔

ابتدائی زمانہ اسلام میں آیات قرآنی کا ذکر وورد صحابہ کرام کی زبانوں پر رہتا تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے اور بیٹھتے ان کی زبانوں پر کلام الٰہی جاری رہتا تھا لیکن ان کا ذکر فکر سے وابستہ رہتا تھا۔ وہ آیات الٰہی کو تلاوت الفاظ کی غرض سے نہیں پڑھتے تھے بلکہ فرصت وسکون کے لمحات میں تمام دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر وہ آیات الٰہی کو پڑھتے اور ہزاروں بار پڑھتے مگر ساتھ ہی اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اعمال کی بنیاد اسی ذکر اور فکر پر قائم تھی۔ جس عمل کی بنیاد اس قدر مستحکم ہو اس کی نتائج کا فلاح وکامرانی سے ہم کنار ہونا یقینی ہے۔ آج اگر مسلمانوں کی تمام مساعی لا حاصل اور ان کی تمام جدو جہد لا حاصل ہیں تو اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ ان کے اعمال کی بنیادیں قرآنی ذکر وفکر پر قائم نہیں ہیں۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں (اقبال)

اسلام ایک زندہ جسم (Organism) کے مانند ہے جس طرح جسم کا کوئی عضو اس سے علیحدہ ہو کر اپنا فعل نہیں کرسکتا آنکھ جسم سے علیحدہ ہو کر دیکھ سکتی ہے نہ کان سن سکتا ہے غرض یہ کہ جسم سے علیحدہ ہوتے ہی جس طرح عضو اپنی صفات سے محروم ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام کا کوئی جزو پورے نظام سے علیحدہ ہو کر اپنے اثرات ونتائج مرتب نہیں کرسکتا۔ جس عمل کی بنیاد ذکر وفکر پر نہ ہو وہ محض سعی لا حاصل ہے اور جس فکر وعمل کے ساتھ ذکر وانقاء الٰہی وابستہ نہ ہو اس کا حاصل محض چنگیزیت ہے۔ اسی طرح جو ذکر فکر وعمل کی نعمت سے محروم ہو وہ محض رہبانیت ہے اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بدم
ذکر؟ ذوق و شوق را داون ادب — کار جان است ایں نہ کار کام و لب (اقبال)

علماء نے جب دیکھا کہ قرآن کریم سے دلچسپی کم ہو رہی ہے تو انہوں نے صحیح راستہ تجویز کرنے

کے بجائے ایسے طریقے ایجاد کئے جو رسول ﷺ کے زمانے میں بھی جاری نہ تھے۔ ترنم کے ساتھ قرات پڑھنے کے رواج نہ ابتدائی زمانہ اسلام میں تھا نہ آج عرب میں سوائے بعض حصوں کے ہے۔ آج قرآن کریم کا سب سے بڑا مصرف یہ ہے کہ اس کو ریشم کے بہترین خلافوں میں بند کر کے رکھ دیا جائے، صبح کو چوم کر اس کے الفاظ کو پڑھ لیا جائے بچوں کی بیماری میں اس کے اوراق کی ہوا بیمار کو لگا دی جائے عالم نزع میں حیات جاوید بخشنے والی کتاب کے قلب یعنی سورۃ یٰسین کو پڑھ کر سنا دیا جائے تا کہ موت با آسانی واقع ہو جائے۔ اس کی وہ آیتیں جس کے بار کو اٹھانے کی پہاڑوں مین بھی ہمت نہ ہوتی تھی اور جس کے متعلق خداوندی تعالیٰ نے فرمایا ہے ''اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو دیکھتا کہ وہ خشیتہ الٰہی سے کانپ اٹھتا اور لرز جاتا'' کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ کر بیماروں کی شفاء محبوب کی تسخیر اور مقدمہ میں کامیابی کے حصول کے لیے دے دی جایا کریں۔

اسرار الحروف

اس سے بڑھ کر تعب واستہزاء قرآن کے ساتھ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی آیات محکمات کو جن کے نزول کا ایک خاص مقصد اور نصب العین تھا اور جن کو پہنچانے کے لیے انبیاء کرام مبعوث ہوئے تھے۔ تعویذوں اور گنڈوں کی شکل میں لکھ کر اور اور اد وظائف کے ذریعہ چلے کھینچ کر ان کو انسان کی معمولی اغراض دینوی کو پورا کرنے کے لیے کام میں لایا جائے۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشند

کہ جبریل امین را دل خراشند

آنحضرت، خلافت راشدہ اور بنوامیہ کے دور تک قرآن کریم کو ان مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ (بقول امام حسن بصری) عمرو بن عاص کے مشورے سے امیر معاویہ کے لشکر نے قرآن کریم کو نیزوں پر اٹھا کر اسلام میں پہلی بدعت قائم کی تھی کہ قرآن کریم کو انہوں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جو مقاصد قرآنی میں داخل نہ تھا۔ اس وقت تک مسلمانوں کے تخیل میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آیات قرآن پر تدبر، تفکر اور ان پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنے کے علاوہ ان کو دیگر

Marfat.com

مادی اغراض کے پورا کرنے کے لیے بھی کام میں لایا جاسکتا ہے۔

صحابہ کرام یا رسول مقبول اگر کسی آیت کو بعض ایسے مواقع پر استعمال کرتے یا دوسروں کو استعمال کرنے کی ہدایت کرتے بھی تھے تو محض دعا کے طور سے اس زمانے میں آیات کو استعمال کرنے والا ان کے مطالب سے بے خبر نہ ہوتا تھا بلکہ ان کے معانی کو ذہن میں رکھ کر حسب موقعہ آیات کو پڑھ لیتا تھا تاکہ انسان کی قوت خیال وفکر کو اس سے مدد مل سکے۔ اس شکل میں قرآن کے الفاظ کے اسرار وخواص سے کچھ مطلب نہیں۔ بلکہ ان الفاظ کے مطالب سے خیال ونظر اصلاح اور اپنے ارادوں اور امیدوں میں مدد حاصل کرنا ہے جیسا کہ پہلے، سحر، کے سلسلے میں عرض کیا گیا ہے انسان کے خیال ونظر میں ایک قوت ہے یہ قوت ارادی، خیال کی یکسوئی اور مرکزیت سے ترقی حاصل کرتی ہے اس لیے صرف قوت ارادی کو مضبوط کرنے کے لیے حسب موقعہ اگر کسی آیت کا ذکر اس کے مطالب کو ذہن میں رکھ کر کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ مثلاً اگر کسی خوف وہراس کے وقت کوئی شخص ''لاخوف علیھم ولا ہم یحزنون'' کو بار بار پڑھے یا کسی خطرے کی حالت میں ''حسبی اللہ ونعم الوکیل کا'' ورد کرے اور ساتھ ہی ان کے مطالب پر پورا غور وفکر کرتا رہے تو یہ فعل مباح ہے اس میں، فکر وذکر کی باہمی وابستگی قائم ہے۔ اسی طریقے کی چند مثالیں صحابہ کرام کے ______ کی تلواروں پر لکھ کر باندھ لیا گیا ہو یا جھنڈوں پر ایرانی بادشاہوں کی طرح اسماء الٰہی کو لکھ کر لٹکا دیا گیا ہو تاکہ ان الفاظ کی برکت سے دشمن غالب نہ ہو سکے نہ کبھی عشق ومحبت کو پورا کرنے اور محبوب یا کسی حاکم کو مسخر کرنے کے لیے آیت انا فتحنا کے چلے کھینچے جاتے تھے اس زمانے میں بھی چوریاں ہوتی تھیں اور چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے لیکن کبھی سورۃ یٰسین کے الفاظ سے چوری کا پتہ اور چور کا نام نہ معلوم کیا جاتا تھا۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کی تشریح ہمارے ذمہ ہے ''ثم ان علینا بیانہ'' لیکن اس کی پوری تشریحات توضیحات کا مطالعہ کرو اس کی تمام سورتوں، آیتوں اور ان کے ہر لفظ پر غور وفکر کرو کہیں اس کا اشارہ تک نہ ملے گا۔ کہ الفاظ قرآنی میں خدا نے کوئی ساحرانہ یا مافوق الطبیعت اثرات وخواص مخفی رکھے ہیں الفاظ خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں ذریعہ کو مقصود بالذات سمجھ لینا تمام فتنوں کی جڑ ہے

Marfat.com

قرآن کریم کسی نئی زبان میں نازل نہ ہوا تھا جس کے الفاظ میں خاص طور سے کوئی مخفی طاقت موجودہ ہوتی ہے۔ وہی عربی زبان جس کو ابوجہل اور ابولہب بھی استعمال کرتے تھے اور یہود ونصاریٰ بھی، قرآن کریم کا ذریعہ نزول تھی۔ پھر جب قرآن کریم نے کہیں اپنے دعوےٰ کا ذکر تک نہیں کیا کہ اس کے الفاظ کو نقل کر کے ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ عویذ بھی بنا لیا کرو اور جسمانی ونفسانی خواہشات کے پورا کرنے میں بھی استعمال کرلیا کرو تو ہم کو کیا حق ہے کہ اس کے لیے نئے مقاصد تلاش کریں؟

پھر اگر تھوڑی دیر کے لیے فرض بھی کرلیا جائے کہ اسرار الحروف وخواص الفاظ کی کوئی حقیقت ہے یا کم از کم قوت خیال (۱) کو آیات الٰہی پر مشق اور چلوں کے ذریعہ بڑھا کر کچھ اثرات مرتب کیے جاسکتے ہیں تو اس میں کیا شک ہے کہ یہ قرآن کریم کی قابل احترام پر عظمت آیات کی سب سے بڑی تذلیل و توہین ہے کہ ان کو ایسی اغراض کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا ان کی سب سے بڑی توہین ہے مثلاً اگر انسان کو جانوروں کے بجائے کھیتوں اور چکروں میں چلایا جائے اور اس کو ریگستانوں میں اونٹ کے بجائے بار برداری کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کے جواز میں یہ دلیل دی جائے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے وہ بیلوں اور اونٹوں سے بہتر کام کرسکتا ہے تو کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا حالانکہ انسان میں بے شمار قوتیں مخفی موجود ہیں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ اس کی تخلیق کا یہ مقصد نہیں ہے۔ اس قسم کے کاموں کے لیے قدرت نے جانوروں کو پیدا کیا ہے جن سے وہ کام لیتا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ مسلمانوں کا یہ طرز عمل کس حد تک روا ہے۔ (۲)

ہم اپنے ان دعوؤں کی تائید میں علامہ ابن خلدون کے مندرجہ ذیل اقتباس کو پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اسرار الحروف کا یہ غیر اسلامی طریقہ مسلمانوں میں کب اور کس طرح پیدا ہوا۔

”علم اسرار الحروف ان دنوں کیمیا کہلاتا ہے جس کو درحقیقت طلسمات کہنا چاہیے۔ عام میں تصرف کرنے والے متصوفین نے اپنے علم تصوف کے لیے یہ نام رکھ لیا ہے۔ گویا عام لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے یہ علم مسلمانوں میں اس وقت ظاہر ہوا جبکہ اسلام کا زمانہ گزر گیا اور خالی صوفیوں کا زمانہ آیا اور ان کو شوق ہوا کہ حواس کے حجاب درمیان سے اٹھا کر حواس کی قوت پیدا کریں۔ اپنے فن کی

کتابیں اور اصطلاحات مرتب کریں اور خیال کیا کہ ارواح فلکی اور کوبکی مظاہر اسماء الٰہی ہیں اور اسرار حروف تمام اسماء الٰہی میں جاری وساری ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تمام مخلوقات ومکونات میں بھی اسرار حروف کی نیرنگیاں موجود ہیں۔ غرضیکہ اس طرح پر فرقہ صوفیہ میں علم اسرار الحروف پیدا ہو جو درحقیقت علم کیمیا کی فرع ہے نہ جس کا ٹھیک ٹھیک موضوع معلوم ہے نہ مسائل کی کوئی حد وانتہا ہے بونی اور ابن العربی وغیرہ کی اس فن میں بہت سی تالیفات ہیں جن کا ماحصل ان کے نزدیک اسماء حسنی اور کلمات الٰہیہ کے ذریعہ سے جن میں پراسرار حروف شامل ہیں عالم طبیعت کی تصرف کرنا۔'' (۳)

علامہ ابن خلدون اگر چہ ''اسراف الحروف'' اور ''سحر'' کی طاقت اور حقیقت کے قائل ہیں مگر ان دونوں کو ناجائز سمجھتے چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہ اپنے طریقہ سحری کے مطابق ان دعاؤں سے کام لیتے ہیں جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں انہوں نے دعاؤں کے لیے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کو ایک منکر طریقہ سے تقسیم کر رکھا ہے اور روحانیت کواکب سے انہیں متعلق کر کے اعمال طلسمی پورے کرتے ہیں مسلمۃ المجریطی نے کتاب الغایہ میں ایسا ہی کیا ہے اور بونی اپنی کتاب انماط میں بھی اسی طریقہ پر چلا ہے۔ چنانچہ دونوں کتابوں کے دیکھنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کیونکہ انماط میں دعاؤں کو ساعات کواکب کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور غلبہ میں دعاؤں کو کواکب کے ساتھ مخصوص کر کے قیامات کواکب، یعنی زکوٰۃ ان کا نام رکھا ہے۔ مطلب تقریباً دونوں کا ایک ہی ہے یعنی دعائیں کواکب سے مخصوص ہیں یا نسبت رکھتی ہیں'' (۴)

اسلام سے قبل مصر اور بابل میں خواص کواکب کا عقیدہ عام طور سے مانا جاتا تھا۔ ان کے خیال سے افعال انسانی گردش کواکب سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اسلام نے اس عقیدے کو باطل قرار دیا اور ستاروں کی گردش کے اثرات کے تسلیم کرنے کو ناجائز بتایا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار وزبوں

Marfat.com

لیکن خلاف بنو عباس کے زمانے میں علم نجوم مسلمانوں میں عام ہو گیا خلفاء نے گردش کواکب کو اس قدر حق سمجھا کہ مکانات و باغات کی تعمیر وغیرہ میں علم نجوم کے مطابق ساعت کے اچھے یا برے ہونے کو معلوک کیا جائے لگا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

سب سے پہلے مربع کا تعویذ یونان کے ایک ریاض داں سوکو پولس نے ایجاد کیا تھا اس کے بعد کارنی لیس نے سات نقش بنائے اور سات ستاروں سے الگ الگ منسوب کیا۔ مسلمانوں نے خواص کو اکب کے علوم کو جب اختیار کیا تو بڑا غضب یہ کیا کہ آیات قرآنی کو ان کے خواص کے مطابق مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا اور عناصر کی طرح مزاج حروف کی بھی آتشی، بدی، آبی اور خا کی چار قسمیں کر ڈالیں، حروف ہوزھی کی رو سے ہر قسم کو سات سات حروف میں تقسیم کیا۔ ہر قسم کے خواص علیحدہ علیحدہ مقرر کیے اور پھر حروف کے اعداد ابجد کے اصول کے مطابق نکالنے شروع کیے۔ اس طرح بیرونی علوم سی متاثر ہو کر مسلمانوں نے قرآن کریم کو سحری وطلسماتی جدول اور کاہنی بساط عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ آیات الٰہی سے استخارے، فالنامے، رم، جفر تک نکالنے شروع کر دیئے اور حروف قرآن کریم کو نصب العین بنانے کو ''عمل'' سے تعبیر کرنے کے بجائے ان ''افعال''، ''طلسم''، ''کو عمل''، کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اور ایسے شخ کو 'عامل' کے نام سے پکارنا شروع کر دیا گیا۔ آج ان عاملوں کی قرآن فروشی کی دکان، بنی اسرائیل کے کاہنوں سے بھی زیادہ زور سے چل رہی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی امراض و حوارث کے تناسب کے لحاظ سے قیمتیں مقرر ہیں۔ مسلمان قوم کی اس قرآن فروشی پر بھی جس قدر آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

از شکر فیہائے آل قرآن فروش دیدہ ام روح الامیں را در خروس

زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ نزد اد ام الکتاب افسانہ (اقبال)

Marfat.com

Marfat.com

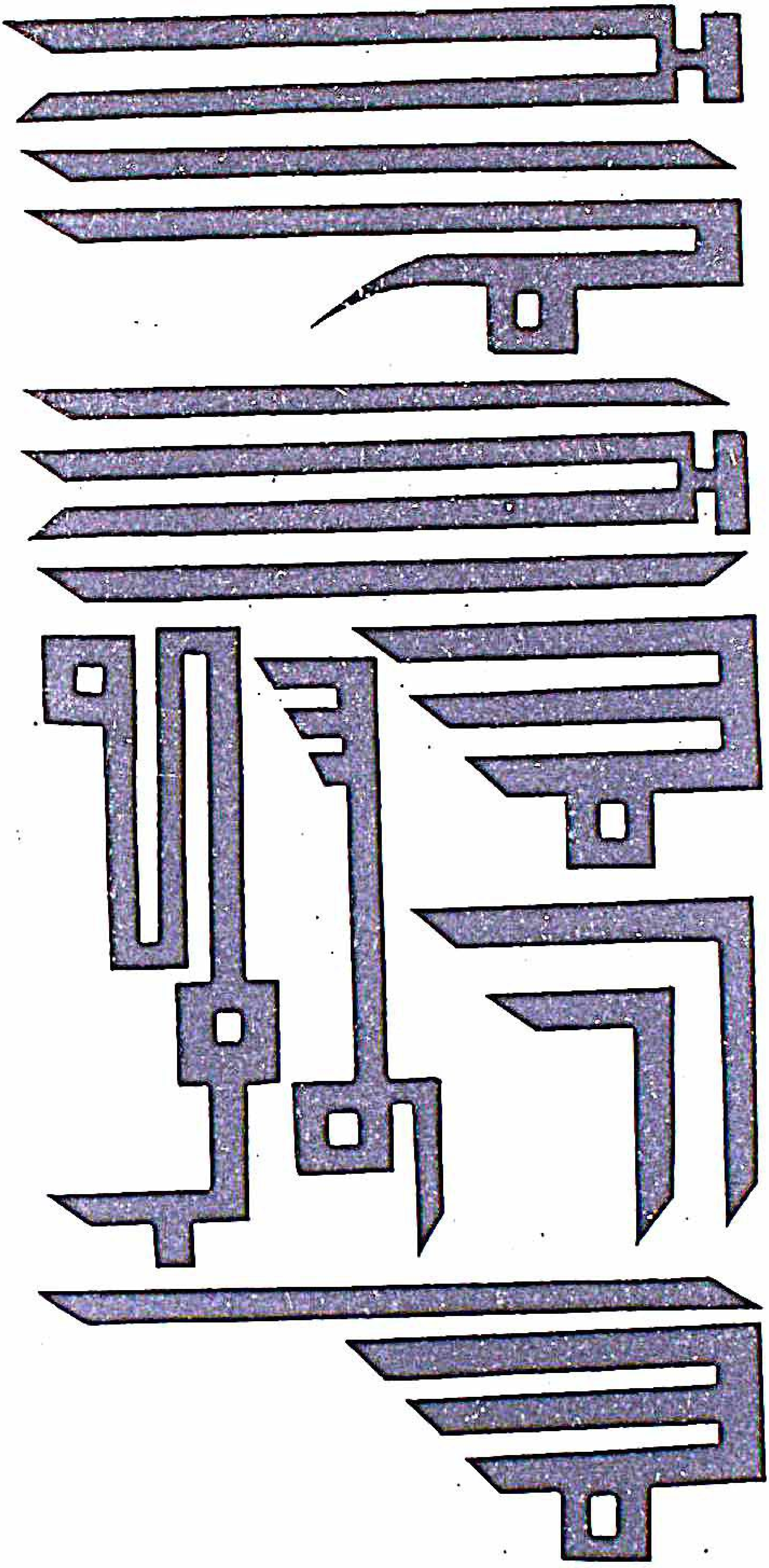

شمارهٔ (۲)

خط کوفی

Marfat.com

Marfat.com

مسلمانوں میں علم وعمل کا فقدان

﴿باب ۲۰﴾

جہالت اور پسماندگی کے خلاف جہاد

قرآن کا بنیادی مقصد انسان کو علم فراہم کرنا ور علم کے ذریعہ سوجھ بوجھ کے دھارے رواں کرنا تھا۔قرآن مجید جب نازل ہوا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ''پڑھو'' اور اسی قرآن میں قلم کی قسم کھائی گئی کہ اس کی وساطت سے انسان کے لیے روشنی کے دریچے کھولے گئے۔

علم ہی انسان کی اصل میراث ہے اور یہی اس کا سرمایہ۔اس دنیا میں جب کہ ہر چیز فنا ہو جاتی ہے علم ہی باقی رہ جاتا ہے اور اس میں متواتر اضافہ ہوتا رہا ہے۔کتاب کے ذریعہ ہی انسان کو علم حاصل ہوتا ہے اور کتاب ہی اس کی اصل دوست ثابت ہوتی ہے۔

قرآن مجید کو علم وآگہی کا ایک عظیم ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نازل فرمایا۔اور انسان کو جہالت پسماندگی اور تنزل کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کیا۔یہ صرف علم ہی کے ذریعہ ہے کہ آدمی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور علوم کے ذریعہ ہی وہ آج اس مقام پر پہنچا ہے جو بصورت دیگر اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

تمام ارتقائی مراحل کا سلسلہ الہامی کتابوں کے نزول اور دینی اور دنیاوی علوم کے پھیلاؤ کے باعث ہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو سب سے پہلے انہیں مختلف اشیاء کے ناموں اور ان کی معنویت سے آگاہ کیا۔الفاظ اور معنی کا بتدریج سلسلہ شروع ہوا تو مختلف صحیفے اور کتب کا نزول انسان کے علم میں اضافہ کرتا رہا اور غور وفکر اور علم ودانش کے ذریعہ انسان وہ منازل طے کرتا گیا جو اس کی راہ میں حائل تھیں۔

Marfat.com

ان الہامی کتب کے ذریعہ انسان کو نہ صرف ہدایت ورہنمائی ملتی رہی وہ ساتھ ساتھ علم وعقل کے ذریعہ ترقی وترویج کے مراحل بھی طے کرتا گیا۔ زبانوں کو افروغ، مضامین کا اسلوب اور فلسفہ اور معاشرتی علوم کا پھیلاؤ انہی بنیادی سہولیات کے سبب ممکن ہوتا ہے۔

علم ودانش نے انسانی زندگی میں نئی روح پھونکی اور ایک ایسی کلید عطا کی جس کے ذریعہ ترقی، فلاح وبہبود اور روشنی کے سینکڑوں ہزاروں دروازے کھلتے گئے۔

علم کے اس اعزاز کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الفرقان بنادیا جس سے اچھی اور بری چیز اور حسین اور قبیح کیفیت میں تمیز ہوسکے اللہ تعالیٰ نے اس کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ خدا بہت بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا اور دنیا بھر کے لیے ذریعہ ہدایت قرار دیا (قرآن: الفرقان:۹)

یہ قرآن کا ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ اس نے ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جس سے نہ صرف برائی اور اچھائی میں تمیز پیدا ہوئی اس نے اس کے ذریعہ ایسے محرکات بھی پیدا کئے جن کے باعث علم ودانش کو فروغ ملا اور انسان نے نہ صرف اخلاقی اور مذہبی امور میں اعلیٰ مراتب حاصل کئے بلکہ آفاق اور تکوینی سطح پر ایسے کارنامے بھی انجام دیئے جو علم وتحقیق کے باعث ہی ممکن ہوئے۔

اگرچہ اسلام کے ابتدائی دور میں علوم کے حصول کی جانب اتنی توجہ نہیں دی جاسکتی جس کی ضرورت تھی کیونکہ ان دنوں میں مسلمان علمی جدوجہد میں بری طرح مصروف تھے اور ان کی اپنی زندگی بھی خطرات میں گھری ہوئی تھی۔

بہرکیف رسالت مآب خود علم کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے اور اپنے رفقاء کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حکمت مومن کی میراث ہے۔ آپ کے لیے علم کا حصول اتنا لازم تھا کہ آپ نے کئی یہودیوں کو اس لیے رہا کردیا کہ وہ مسلمانوں کے لیے تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کرسکیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تعلیم کی غرض سے چین بھی جانا پڑے تو انسان کو چاہیے کہ وہاں جائے۔

Marfat.com

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے ملک میں جانے کے لیے کہا جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا اور صرف فلسفہ اور دیگر علوم کا ذوق وشوق تھا۔

چونکہ آنحضور ﷺ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ترقی اور بالیدگی کے لیے ہر علم اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اس لیے آپ مسلمانوں کو مختلف علوم کے حصول کی ترغیب دیتے تھے اور یہ ان کی ترغیب کا ہی نتیجہ تھا کہ آگے چل کر مسلمانوں میں عظیم فلسفی۔ مفکرین اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ جنہوں نے یونانی مفکرین کے علم کا احاطہ کیا اور انہیں عربی اور لاطینی زبانوں مس منتقل کیا اس سے نہ صرف یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد پڑی بلکہ اسلام کے پیغام میں بھی استحکام پیدا ہوا۔

لیکن بعد میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات کے باعث فلسفہ یونان کی مخالفت کی گئی اور اس کے ساتھ دیگر دنیاوی علوم بھی اس کی زد میں آ گئے۔ بنوامیہ کے دور میں اختلافات زور پکڑ گئے اور مختلف حلقے اپنے حجروں میں محدود ہو کر رہ گئے۔ ہر چیز کو منجانب اللہ سمجھ کر تحقیق وتدوین کا سلسلہ دبا دیا گیا اور علم کا فروغ مانند پڑ گیا۔

ہارون الرشید کے بعد دوسری تیسری صدی میں بعض مفکرین نے یونانی فلسفہ کے مقابلے میں ''علم کلام'' کا سلسلہ شروع کیا لیکن اس کی بھی مخالفت کی گئی اور امام شافعی نے اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہوئے کہا کہ

''اہل کلام کے بارے میں میرا فیصلہ ہے کہ ان کو درے لگائے جائیں اور قبائل میں ان کی تشہیر کی جائے۔''

تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحقیق اور غور وفکر ترک کر دیا گیا اور یونانی فلسفیوں کے دلائل کا منطقی طور پر مقابلہ کرنے کی بجائے اہل علم کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

امام شافعی کے بعد امام احمد بن حنبل نے بھی فلسفہ کو رد کر دیا۔ فلسفہ اور اہل کلام کی مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محدثین کی روایات پر تنقید کرتے تھے جس کی اس زمانے میں مطلق گنجائش نہیں تھی۔

لیکن باوجود علماء کے اختلاف شدید کے معتزلہ کے عروج کے ساتھ فلسفہ وعلم کلام بھی ترقی کرنے

Marfat.com

لگا۔ خالد بن یزید بن معاویہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باقاعدہ فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا لیکن ابوالہذیل علاف (۱۳۱ھ ۲۳۵ھ) جو معتزلہ کا ایک بلند پایہ عالم اور خطیب تھا علم کلام کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

یزید بن ولید کے عہد میں معتزلیوں کو ترقی ہوئی اور مامون الرشید کے زمانے میں ان کا عروج اپنے شباب پر پہنچا۔ اس زمانے میں فلسفہ کلام برابر ترقی کرتے گئے۔ امام غزالی سے قبل تک یہ دونوں علوم ایک دوسرے علیحدہ رہے۔ لیکن آپ نے ان دونوں کو ایک کر دیا۔ پھر امام رازی نے ان دونوں علوم کو متحد کر کے مزید ترقی دی۔ فلسفہ و دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے سترہ برس کی عمر میں شاہ نوح ابن منصور کے علاج میں اپنے کمال کا اظہار کیا تھا فلسفہ میں اس نے اپنے خیالات کو عامۃ المسلمین کے عقائد سے مطابق کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن اس کے باوجود بھی امام غزائی نے اس کے معاد و حشر اجساد کے خیالات کی بنا پر اس کی تکفیر کی۔

البیرونی

(۹۷۳ تا ۱۰۴۸ء) جو یعقوب کندی کا شاگرد تھا ریاضی ہیئت و جغرافیہ اور علم الاقوام میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس نے بھی فلسفہ کی ترویج میں کافی سعی کی۔ یہ شخص فن تنقید میں خاص طور سے مہارت تامہ رکھتا تھا۔

ابن الہیثم

گیارہویں صدری میں ابن الہیثم (المتوفی ۱۰۳۷) کا نام جو علوم ریاضی اور طبعیات میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ ترویج فلسفہ میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ فلسفہ کو تمام علوم کی بنیاد بنانا چاہتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے ارسطو کی تصانیف کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کیا اور ان کی شرحیں بھی لکھیں۔

علماء میں جن کے ذریعہ علم کلام کو خاص ترقی نصیب ہوئی ابتدائی دور میں امام اشعری پھر امام غزالی اور علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی کے اسماء گرامی ائمہ متکلمین کی صف اول میں شمار کیے جاتے ہیں۔

امام اشعری، امام غزالی وشہرستانی

امام اشعری کے زمانے تک علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش نہ تھی لیکن امام غزالی کے زمانے میں دونوں میں کافی ارتباط پیدا ہوگیا۔ اگرچہ امام غزالی نے فلسفہ کی تردید میں کافی لکھا لیکن اس سے پہلے جو کچھ آپ فلسفہ کی حمایت میں لکھ چکے تھے اس سے اس کی بے حد اشاعت ہوئی۔

علامہ شہرستانی فن حدیث میں بھی کامل تھے اور علم کلام میں امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ ملل ونحل آپ کی بہترین تصنیف ہے چونکہ اس زمانے میں فلسفہ دانی ایک جرم سمجھا جاتا تھا اس لیے آپ بھی تکفیر سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ صاحب کافی لکھتے ہیں:

"اگر ان کی اعتقاد میں تخبط نہ ہوتا اور ملحدوں کی طرف مائل نہ ہوتے تو وہ اسلام کے امام ہوتے"۔(۲)

امام رازی

امام شہرستانی کے بعد امام رازی (متوفی ۶۰۶ھ) نے فلسفہ کی اشاعت میں خاص حصہ لیا آپ فقہ ومعقولات میں کمال رکھتے تھے۔ فن خطابت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ نے علم کلام میں فلسفہ کے بیشتر مسائل شامل کر دیئے اور اس طرح فلسفہ اور علم کلام کو متحد کر دیا۔ آپ کے بعد تو علم اور فلسفہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہا۔ اس کو بھی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار منصور کے حکم سے شہر بدر کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ دراصل فلسفہ اور شریعت ایک ہی چیز ہے اس لیے اس نے معقول ومنقول میں تطبیق دینے کی کوشش کی اس کے نزدیک فلسفہ سیکھنا واجب اور کم از کم مستحب ہے۔

ابن باجہ

ابن باجہ المتوفی ۵۳۳ھ نے بھی اسپین میں فلسفہ کو بہت ترقی دی۔ یہ شخص ریاضی بالخصوص ہیئت، موسیقی اور طب میں کامل تھا اور منطق، فلسفہ، فطرت اور مافوق السیعی فکر سے بھی خاص ذوق رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود علماء اسلام اس کو مخبوط الحواس، لامذہب اور بدکار آدمی سمجھتے تھے اس کی موت زہر کے ذریعہ واقع ہوئی۔ ۲۔ علم الکلام۔ ص ۶۷

Marfat.com

ابن طفیل

ابن طفیل (المتوفی ۱۱۸۵ء) کا شمار بھی اسپین کے جلیل القدر فلاسفہ میں ہے اس کی کوشش یہ تھی کہ یونانی علوم کو مشرقی علوم کے ساتھ ملا کر ایک جدید تصور کائنات قائم کرے۔ اس کے زمانے میں فلسفہ کو کافی فروغ حکومت میں حاصل تھا۔ اس لیے اس کو ان تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو دوسرے حکماء کو برداشت کرنی پڑیں۔ وہ کچھ دنوں غرناطہ میں سیکرٹری کے عہد پر فائز رہا۔ پھر ابو یعقوب کا وزیر طبیب خاص مقرر ہوا۔

علم کلام کا زوال

مشرق میں علم کلام کے ارتقاء کی تاریخ خلفاء بنو عباس کی ترقی کے ساتھ ساتھ وابستہ رہی چوتھی صدری ہجری سے خلفاء کی حالت کمزور ہونے لگی ان کے ساتھ ہی علم کلام کا زوال بھی شروع ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفاء کی سیاسی طاقت کے زوال کے بعد اقتدار ترکوں کے ہاتھ میں آیا جو علوم سے قطعی بے بہرہ تھے اس لیے علم کلام کی سرپرستی نہ وہ کر سکے اور نہ خلاف کی طرف سے کوئی حمایت حاصل ہو سکی کیونکہ اب خلفاء خود نہ تو اتنا علم ہی رکھتے تھے کہ مخالفین علم کلام سے مامون الرشید کی طرح بحث کر سکتے نہ ان کا اثر ہی باقی تھا۔ ان کے علاوہ اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ محدثین کی مخالفت کے باوجود علم کلام کی اشاعت میں حصہ لے سکتا۔ پانچویں صدری میں علم کلام کا علیحدہ وجود قریب قریب ختم ہو گیا اور وہ فلسفہ میں ضم ہو گیا۔

فلسفہ۔ علم کلام اور علماء کے مختلف مکاتب فکر نے اپنے انداز میں فلسفیوں اور دانشمندوں، کاوشوں اور روایات پر منفی اور مثبت اثرات مرتب کئے۔

ا۔ علامہ عبدالوحید خان ''مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان'' صفحہ ۴۱۱۔۔ ۴۰۷

Marfat.com

اوراس طرح جہاں کئی تحقیق وتدوین کے نئے باب مرقع ہوئے وہاں تحقیق وترویج کی رفتار بھی اثر انداز ہوتی نظر آتی ہے۔ اختلافات کی کشمکش اپنی آغوش میں کائنات کی حیثیت، خداوند عالم کے وجود، اقدار خیر وشر اور تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہے۔

قرآن کریم واضح انداز میں انسان کو تفکر وتدبر کی طرف مائل کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام امور پر غور وخوض کیا جائے جو عقلی؟ ذہنی، روحانی اور علمی اعتبار سے انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی پہلو کو نظر انداز کرنا عقل وخرد کے حق میں نہیں ہے۔ اگرچہ عقل وخرد کی پاکیزگی بھی ضروری ہے جو مسلمانوں کے لیے قرآنی حدود میں متعین کی گئی ہیں لیکن سوچ وفکر دروازہ بند کرنا کسی طور درست نہیں جیسا کہ ماضی میں ہوا اور جس کے باعث تحقیق وتدوین کے دروازے بند ہو گئے اور مسلمان سائنس اور دیگر علوم میں بہت پیچھے رہ گئے۔

عبادت وبندگی اور عقل ودانش کے متخلف اسلوب ہیں اور ان سب کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔ فلسفہ یا سائنس سے صرف اس لیے منہ موڑ لینا کہ ان کے کچھ پہلو فکری او مرعقلی دلائل پر مبنی ہیں درست نہیں۔ قرآن کی موجودگی میں غیر اسلامی نظریات کو ترک کیا جا سکتا ہے اور عقل ودانش کی پاکیزگی کو بر قرار رکھا جا سکتا ہے۔

یہ عوامل اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ان کے ذریعہ ہمیں مسلمانوں کے عروج وزوال پر ایک تفکرانہ انداز میں غور وفکر کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان حقائق سے بھی پردہ کشائی ہوتی ہے جو ترقی اور فلاح وبہبود کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ زندگی کو خیر وشر اور تنزل وپسماندگی کی کشمکش میں صحیح رخ دینے کے لیے یہ لازم ہے کہ ان تمام امور کی بخوبی جانچ پڑتال کی جائے۔ قوموں کے حالات بنتے بھی ہیں اور بگڑتے بھی ہیں لیکن بالآخر کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو عقل ودانش کی راہ پر قائم رہتے ہیں اور علوم وتحقیق کے ذریعہ ترقی کی منازل طے کرتے ہیں مسلمانوں کے ابتدائی دور اور مغربی اقوام کے موجودہ حکمت عملی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کا بنیادی تصور جسے ہم نے فلسفہ حسن وشعور کہا ہے درست ہے اور اس پر چل کر آدمی دنیا اور آخرت میں اعلیٰ مراتب حاصل کر سکتا ہے۔

جب بھی مسلمان اس راہ سے بھٹکے اور ان کے ذہن وفکر زنگ آلود ہوئے وہ ذلیل وخوار ہوئے

قرآن نے اس کی واضح نشاندہی کردی ہے اور فلاح و بہبود کی راہیں متعین کردی ہیں اگر مسلمان خود ان روشن رواہوں سے آنکھیں پھیر لیں تو اس میں قصور قرآن کا نہ ہی اسلام کا ہے۔ قرآن نے تو راہ دکھلا دی ہے جو بہتر ہے اس ضمن میں واضح ارشاد ہے۔

"ان ھذا القرآن یھد للتی ھی اقوام و مبشر المومنین الذین یعلمون الصلحت ان لھم اجر کبیراۃ" (سورۃ بنی اسرائل :۹)

جو علم اور بصیرت قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اور دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے اس کی روشنی میں جہالت اور اندھیروں کے دبیز پردوں کو پھاڑا جاسکتا ہے اور دین اور دنیا میں فلاح و بہبود کی راہیں متعین کی جاسکتی ہیں۔

اور یہی علم سلامتی اور امن عطا کرنے والا ہے۔ چونکہ مسلمان اس علم سے بے بہرہ ہو گئے ہیں اس لیے وہ مسلسل انتشار، اختلافات اور تضادات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ایسی مشکلات کو جنم دے رہے ہیں جو خود مسلمانوں کے لیے تکالیف کا باعث ہیں۔

علمی اور فکری تعلیمات قرآن کے ذریعے دے دی گئی ہیں اور ضروری بنیادی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں اب یہ کام انسان کی صلاحیت کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ روزمرہ مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے اور ایک کامیاب ترقی یافتہ لائحہ عمل کیسے اختیار کرتا ہے۔

وہ ارتقائی سلسلہ جو آج سے کئی سو برس پہلے شروع ہوا اب اپنے تدریجی مراحل سے گزر رہا ہے اور کامیابی سے منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن کامیابی انہیں لوگوں کو مزین کرے گی جو بصیرت و حکمت کی روشن راہوں پر گامزن ہوں گے۔

"اللہ تعالیٰ کا آخری کلام ہونے کی حیثیت سے قرآن وہ آخری حقیقت اور رشد و ہدایت کا وہ آخری خزینہ ہے جو قلب جبریئل پر مرتسم اور ضمیر ازل میں پوشیدہ تھا۔ قرآن کے صفحات میں یہ ہویدا اور نمایاں ہو گیا۔"

Marfat.com

"الیوم و اکملت لکم زینکم" (سورة المائدو :۳)

(آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنے انعام واکرام کے تقاضوں کو پورا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین کے لیے چن لیا"

یہ وہ خلاصہ ہے جو ہمارے مضمون کی روح ہے اور اس سے فکر وعمل، علم ودانش اور کمالات کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ اور پسماندگی اور جہالت کے خلاف جہاد تیز تر ہوتا ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

لا اله الا الله حقا

Marfat.com

Marfat.com

مغرب کی نظر میں

﴿باب ۲۱﴾

اسلامی تہذیب وفلسفہ

جب ہم قرآن مجید پر غور وفکر کرتے ہیں تو ہم ان اقدار اور امور کا بھی جائزہ لیتے ہیں جنہوں نے اسلامی تہذیب وتمدن اور علم ودانش کے دھارے رواں کیے۔

قرآن نے اور رسالت مآب ﷺ نے ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھی جو کسی خاص طبقے یا علاقے کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام دنیا اور تمام انسانیت کے تقاضے اس سے پورے ہوتے تھے۔ اس کا ایک مثبت لائحہ عمل تھا اور اس کے نظریات اور حکمت عمل نے دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جو علم و دانش عدل و انصاف اور حکمت وبصیرت پر مبنی تھا۔

قرآن اور اسلام کے حوالے سے مسلمان اپنی آراء دیتے رہتے ہیں لیکن یہ شاذ ونادر ہی ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے خیالات کو تحمل و برداشت سے سنا جائے یا ان کی پذیرائی کی جائے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک غیر متعصب اور روشن نظر رویہ اختیار کرنے کے لیے ہم ایسے مفکرین اور ناقدین کی آراء کا بھی جائزہ لیں جو ہمارے مذہب، تہذیب اور فکری عوامل کی پذیرائی نہیں کرتے۔

اس قسم کے خیالات سننے کے لیے ہم نے برٹرنڈ رسل کا انتخاب کیا ہے جو ایک اعلیٰ پایہ کے مفکر ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کرتے ہیں انہوں نے اسلامی تہذیب وفلسفہ کا جائزہ اپنی کتاب فلسفہ مغربی تاریخ (History of Western Philosophy) میں کیا ہے۔

اس مضمون کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا گا کہ مغرب کا اسلام کے بارے میں کیا نظریہ ہے اور اس کے مفکرین اس کے مختلف پہلوؤں کو کس پیمانے سے ناپتے ہیں۔

اگرچہ برٹرنڈ رسل کا تعلق لادینی حلقوں سے ہے اور وہ مذہبی روایات کے زیادہ قائل نہیں ہیں لیکن ان کا تجزیہ کئی ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھاتا ہے جن سے ہم اپنے مخصوص حجروں میں رہتے ہوئے قدرے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ ہم ایسے ناقدین کے اعتراضات سے اتفاق کریں۔

Marfat.com

لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے مفکرین ہمارے مذہب اور تہذیب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں تب ہی ہم اپنی مستحکم بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے نہ صرف ان کے اعتراضات کا جواب دے سکیں گے بلکہ ایک ایسا لائحہ عمل بھی تشکیل دے سکیں گے جو ہمیں ہماری کمزوریوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

انتہا پسندی موجودہ دور اور خاص طور طور پر پاکستان کے سیاسی اور مذہبی حالات کا شدید ردعمل ہے کوئی نیا جذبہ نہیں ہے یہ ہمیں عباسی دور میں بھی نظر آیا ہے اس ضمن میں برٹرنڈ رسل نے ان خامیوں کا ذکر کیا ہے جو ترکوں اور عربوں کے استعمال کے باعث ان کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں پیدا ہوگئیں اس کے بعد اسلامی تہذیب کا ذکر آتا ہے جو شام سے نکل کس طرح ہسپانیہ تک پہنچ گئی اور اس کے اثرات کیونکر مختلف مذہبوں کے ڈھانچے بناتے اور سنوارتے رہے۔ ایرانی تہذیب کے بارے میں رسل کہتے ہیں کہ وہ عملی اور فنی اعتبار سے قابل تعریف رہی اس کے ساتھ ہی یونانی فلسفہ اور تہذیب کا بھی ذکر ہے جس نے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ اس ضمن میں عربوں نے یونانی فلسفیوں سے مابعد الطبیعیات منطق اور فلسفہ میں جو کچھ سیکھا وہ بھی قابل ذکر ہے۔

لیکن بعد میں عیسائی فتوحات کے باعث اس میں عربوں کا اثر ورسوخ بہت کم ہوگیا اور وہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ علمی اور فکری لحاظ سے بھی پسپا ہونے لگے۔ ان حالات کا جائزہ لینا موجود تنزل پسماندگی کے دور میں مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے ان عوامل کا تدارک کرتے ہی ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے جو بہتر مستقبل کی ضمانت دے گا۔

مغربی مفکرین کا تجزیہ

برٹرنڈ رسل اسلامی تہذیب وتمدن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مشرقی سلطنت افریقہ اور سپین پر حملے مغرب پر شمالی وحشیوں کے حملوں سے دو اعتبارات سے مختلف تھے۔ اول یہ کہ مشرقی سلطنت 1453ء تک قائم رہی جو مغربی سلطنت سے تقریباً ایک ہزار سال زیادہ عرصہ تھا۔ دوم یہ کہ مشرقی سلطنت پر بڑے حملے مسلمانوں کے تھے جو فتوحات کے بعد اپنے

Marfat.com

مذہب پر قائم رہے اور اپنی ایک اہم تہذیب قائم کی۔

اسلامی کیلینڈر کی ابتدا ہجرت سے ہوئی جو ۶۲۲ بعد مسیح واقعہ ہوئی ۔ اس کے دس سال بعد (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) رحلت فرما گئے۔ آپ کی رحلت کے فوراً بعد عرب فتوحات شروع ہوئیں اور غیر معمولی سرعت کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں۔ مشرق میں شام پر 634ء میں حملہ ہوا اور دو سالوں میں اس پر فتح تکمیل تک پہنچ گئی۔ 664ء میں ہندوستان پر حملہ ہوا۔ 669ء میں قسطنطنیہ کو محاصرے میں لیا گیا اور (دوبارہ 17-716ء) میں مغرب کی طرف ان کی پیش قدمی اتنی اچانک نہ ہوئی۔ مصر 642ء میں فتح کر لیا گیا اور کارتھیج 697ء میں فتح ہو گیا۔ سپین، جنوب مغرب میں ایک چھوٹے گوشے کے سوا 12-711ء میں حاصل کر لیا گیا۔ مغرب کی جانب وسعت (سسلی اور جنوبی اٹلی کے سوا) 732ء میں ٹورز کے مقام پر جنگ میں مسلمان کی شکست کے باعث رک گئی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کے ٹھیک سو سال بعد تک یہ صورت حال تھی (عثمانی ترکوں کا زمانہ، جنہوں نے قسطنطنیہ فتح کیا، بعد کے عرصے سے تعلق رکھتا ہے جس کا ہم اس وقت ذکر نہیں کریں گے)

اس وسعت میں متعدد حالات کار فرما تھے ایران اور مشرقی سلطنت اپنی طویل جنگوں کے باعث ہمت ہار چکے تھے۔ شام کے عوام، جو بیشتر نسطوری (Nestorian) تھے نے کیتھولک لوگوں کے ہاتھوں بہت اذیتیں برداشت کی تھیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے تمام مسیحی فرقوں کے ساتھ نہایت رواداری کا سلوک کیا، بشرطیکہ وہ خراج ادا کر دیں۔ اس طرح مصر کی بیشتر آبادی جو (حضرت عیسیٰ) کی واحد جامع شنویت پر یقین رکھتی تھے نے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔ افریقہ میں عربوں نے بربروں کے ساتھ الحاق کر لیا۔ بربروں کو ابھی تک رومی سرنگوں نہ کر سکے تھے۔ عربوں اور بربروں نے ایک ساتھ سپین پر حملہ کیا۔ یہاں یہودیوں نے بھی ان کی مدد کی کیونکہ انہیں مغربی گاتھ لوگوں نے سخت اذیتیں دے رکھی تھیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب سادہ توحید پرستی تھی۔ اس میں تثلیث و تجسیم کی وسیع دینیات کی پیچیدگیاں نہ تھیں۔ محمد) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی الوہیت کا دعویٰ نہ کیا اور نہ ہی آپ ﷺ کے کسی

Marfat.com

جانشین نے آپ ﷺ کی طرف سے ایسا کیا۔ یہودیوں نے بت تراشی کی ممانعت کی تھی۔ آپ ﷺ نے بت پرستی کو شرک قرار دیا اور شراب نوشی منع فرمائی۔ ایک مرد مومن کا فرض تھا کہ وہ اسلام کی خاطر جس قدر زیادہ دنیا فتح کر سکتا ہے کرے۔ لیکن یہ سخت ہدایت تھی کہ کسی مسیحی یہودی یا زرتشتی پر جبر و اکراہ مسلط نہ کیا جائے۔ قرآن حکیم کی زبان میں کسی صاحت کتاب پر، یعنی جو صحائف کے ماننے والے تھے، ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔

عرب ایک وسیع ریگستان تھا۔ اچانک ہی تقریباً بیس برس کے دوران، وسیع صحرا کے کناروں پر سادہ اور سخت زندگی گزارنے والے دنیا کے بعض امیر ترین علاقوں کے آقا بن گئے۔ وہ اسائشوں سے لطف اندوز ہونے اور کسی بھی قدیم تہذیب کی شستگی و لطافت حاصل کرنے کے اہل بن گئے۔ لیکن شمالی وحشی حملہ آوروں کے برعکس انہوں نے اس تبدیلی سے خود کو عیش و آرام اور مکروہات دنیا سے بچائے رکھا۔ چونکہ انہوں نے زیادہ سخت جنگوں کے بغیر سلطنت حاصل کی اس لیے کوئی تباہی نہ ہوئی اور شہری انتظامیہ میں زیادہ تبدیلی نہ کی۔ ایران اور بازلطینی سلطنت میں شہری انتظامیہ بہت منظم تھی۔ ابتدائی میں عرب قبائل ان پیچیدگیوں سے نا آشنا تھے۔ اس لیے ایسے انتظامی ماہرین کی خدمات بحال رکھیں جو اسے چلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے نئے آقاؤں کی خدمات بجالانے میں کوئی پس و پیش ظاہر نہ کی۔ جو تبدیلی کی گئی اس نے بلاشبہ کام بہت کام آسان کر دیا کیونکہ ٹیکس بہت ہی حد تک کم کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بیشتر آبادی نے خراج سے بچنے کے لیے مسیحیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔

عرب سلطنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشین ایک خلیفہ کی حکمرانی کے تابع ہوتی۔ نبی کریم ﷺ کے جانشین ہونے کے باعث خلیفہ وقت انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ ابتدا میں خلافت شورائی تھی لیکن جلد وراثت میں بدل گئی۔ پہلا حکمران خاندان امیہ کا تھا جن کی حکمرانی 750ء تک قائم رہی۔ عربوں نے اپنے نئے مذہب کی بدولت ہی فتوحات حاصل کیں۔ چونکہ وہ متعصب نہ تھے اس لیے مٹھی بھر جنگجو کسی زیادہ مشکل کے بغیر اعلیٰ تہذیب اور دوسرے مذہب کی وسیع آبادی پر حکمرانی کرنے کے اہل تھے۔

Marfat.com

اہل ایران اوائل وقتوں سے ہی بہت مذہبی اور فلسفیانہ مزاج تھے قبول اسلام کے بعد انہوں نے اسلام کو فلسفیانہ رنگ دینا شروع کر دیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے داماد (حضرت علی) کی 661ء میں وفات کے بعد مسلمان سنی اور شیعہ دو فرقوں میں بٹ گئے اول الذکر کی اکثریت ہے اور آخر الذکر حضرت علیؓ کو دیگر صحابہ کرام سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ امیہ خاندان کی حکومت صحیح نہ تھی۔ اہل ایران طویل عرصہ سے شیعہ فرقے سے وابستہ رہے ہیں۔ ایرانی اثر کے باعث ہی آخرکار بنوامیہ کی حکومت جاتی رہی۔ ان کی جگہ عباسی خلفاء نے لے لی جو ایرانی مفادات کے نمائندہ تھے۔ اس تبدیلی کا اہم پہلو دارالخلافے کا دمشق سے بغداد منتقل ہونا ہے۔

سیاسی اعتبار سے بنوامیہ کی بہ نسبت عباسی زیادہ انتہا پسند تھے۔ تاہم وہ تمام سلطنت پر قابض نہ ہو سکے۔ امیہ خاندان کا ایک فرد قتل عام سے بچ کر ہسپانیہ (سپین) چلا گیا جہاں اسے جائز حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت سے ہسپانیہ باقی اسلامی دنیا سے آزاد رہا ہے۔

عباسیوں کے اوائل زمانے میں خلافت نے زبردست شان وشوکت حاصل کی۔ ان میں سب سے زیادہ نامور ہارون الرشید تھا جس کی وفات 809ء میں ہوئی۔ وہ شارلمین اور ملکہ ایرین کا ہم عصر تھا۔ ''الف لیلیٰ'' کی کہانیوں میں اس کا ذکر داستانی بن گیا ہے۔ اس کا دربار علم، شاعری اور عیش و آرام کا تابناک مرکز تھا۔ اس کی سلطنت آبنائے جبرالٹر سے دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا حکم قطعی ہوتا۔ تاہم یہ شان وشوکت تھوڑا عرصہ رہی۔ اس کے جانشین نے یہ غلطی کی کہ فوج میں زیادہ تر ترکوں کو شامل کر لیا۔ ترک سپاہی بغاوت کر دیتے اور خلیفہ بے بس ولاچار ہو جاتا اور سپاہی جب بھی اس سے اکتا جاتے تو اسے اندھا یا قتل کر دیا جاتا۔ تاہم خلافت قائم رہی۔ عباسی خاندان کے آخری خلیفہ کو 1256ء میں منگولوں نے قتل کر دیا۔ انہوں نے خلیفہ کے ساتھ ہی بغداد کے آٹھ لاکھ باسیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

عربوں کے سیاسی اور معاشرتی نظام میں خامیاں پیدا ہو گئیں جب مطلق العنان بادشاہت کثرت ازدواج سے مل جاتی ہے تو ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ حکمران کی موت کے بعد خاندانی جنگیں شروع ہو جاتی

Marfat.com

ہیں۔ ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ حکمران کے بیٹوں میں سے ایک فتح مند ہو جاتا ہے اور باقی تمام کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ کامیاب جنگوں کے نتیجے میں غلاموں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض اوقات یہ غلام بھی خطرناک ہنگامے پیدا کرتے۔ تجارت کو بہت زیادہ فروغ ملا کیونکہ خلاف کا مرکز مشرق اور مغرب کے عین وسط میں تھا۔ ''دولت کی فراوانی نے قیمتی اشیاء کی طلب پیدا کی۔ چین سے سلک اور سمالی یورپ سے فر آنے لگیں۔ بعض خاص حالات کے باعث بھی تجارت کو فروغ ملا مثلاً مسلم سلطنت بہت وسیع تھی، عربی دنیا بھر کی زبان بن گئی اور تاجروں کو اخلاقیات کے اسلامی نظام میں بلند مرتبہ دیا جاتا تھا۔ یہ بات بھی لوگوں کے ذہنوں میں تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود تاجر رہ چکے تھے اور آپ ﷺ نے مکہ میں حج کے دوران تجارت کی اجازت دی تھی۔''1 عسکری ربط کی مانند تجارتی ربط کا انحصار بھی ان شاہراہوں پر تھا جو عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے حاصل کی تھیں۔ لیکن عرب شمالی فاتحین کے برعکس ان کی نگہداشت اور مرمت کرتے رہے تاکہ ان کی حالت خراب نہ ہونے پائے۔ تاہم آہستہ آہستہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ہسپانیہ، ایران، شمالی افریقہ اور مصر یکے بعد دیگرے باری باری الگ ہو گئے اور پھر مکمل طور پر آزاد ہو گئے۔

عربوں کی معیشت کی بہترین خصوصیات میں ایک زراعت تھی ان کا آبپاشی کا سلیقہ و ہنر بہترین تھا۔ یہ فن انہوں نے کم یاب پانی والے علاقے میں زندگی گزارنے سے سیکھا تھا۔ آج بھی سپین کا زراعتی نظام عربوں کے نظام آبپاشی سے مستفید ہوتا ہے۔

اسلامی دنیا کی امتیازی تہذیب کی ابتدا اگرچہ شام میں ہوئی لیکن جلد ہی یہ مشرقی اور مغربی حدود ایران و ہسپانیہ تک پھیل گئی۔ فتح کے وقت اہل شام ارسطو کے مداح تھے۔ نسطوری ارسطو کو افلاطون پر ترجیح دیتے تھے۔ افلاطون کیتھولک کا مقبول فلسفی تھا۔ عربوں نے شروع میں یونانی فلسفہ کا علم شامیوں سے حاصل کیا اور یوں ابتدا ہی سے وہ افلاطون کی بہ نسبت ارسطو کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا ارسطو نوفلاطونیت میں ملبوس ہوا۔ کندی (وفات 873ء) عربی زبان میں سب سے پہلے فلسفہ لکھنے والا تھا۔ وہ ہی واحد ذکر فلسفی ہے جو خود عرب کا رہنے والا تھا۔ اس نے فلاطینس کی اینیاڈز''

(Enneads) کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا اور اسے ''ارسطو کی دینیات'' کے نام سے شائع کیا اس امر نے ارسطو کے افکار کے متعلق عربوں میں الجھاؤ پیدا کیا جس سے نکلنے کے لئے صدیاں لگیں۔

دریں اثنا ایران میں مسلمانوں کا ہندوستان سے رابطہ ہوا۔ آٹھویں صدی سنسکرتی تحریروں سے عربوں نے پہلی دفعہ علم ہیئت حاصل کیا۔ تقریباً 830ء میں محمد ابن موسیٰ الخوارزی نے سنسکرت زبان سے علم ریاضی اور علم ہیئت کا عربی زبان میں ترجمہ شائع جس کا بارھویں صدی لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس لاطینی ترجمے کا نام "Algoritimi de numero Indorum" تھا۔ اہل مغرب نے ہلی مرتبہ اسی کتاب سے وہ علم جانا جسے ہم ''عربی'' ہندسہ کہتے ہیں جسے ہندوستانی کہنا چاہئے۔ اسی مصنف نے الجبرا پر کتاب کتاب لکھی جو سولہویں صدی تک مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصاب کی کتاب رہی۔

ایرانی تہذیب عقل اور فنی اعتبار سے قابل تعریف رہی۔ لیکن تیرھویں صدی میں منگولوں کے حملوں نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ عمر خیام، میرے علم میں وہ واحد شخص ہے جو بیک وقت ماہر ریاضی اور شاعر تھا۔ نے 1079ء میں تقویم (Calandar) کی اصلاح کی۔

بہت عجیب بات ہے کہ اس کا بہترین دوست قاتلوں کے فرقے کا بانی تھا جسے داستانوں میں ''بزرگ گوہ'' کہا جاتا ہے۔ ایرانی بہت بڑے شاعر تھے۔ شاہنامہ کے مصنف فردوسی (941) جسے پڑھنے اور سمجھنے والوں کے بقول، کا مقابلہ ہومر سے کیا جاتا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کے برعکس وہ بحثیت صوفی بھی قابل ذکر ہے۔ صوفیاء کا فرقہ جو آج بھی موجود ہے نے راسخ العقیدہ اذہان کی سری اور تمثیلی تشریح کے کراس میں بہت زیادہ لچک پیدا کر لی۔ یہ کم وبیش نوفلاطونی تھی۔

اسلام دنیا میں یونانی اثرات کی ابتداء اگرچہ نسطوری لوگوں کے ذریعے ہوئی لیکن وہ پوری طرح یونانی زاویہ نگاہ کے حامل نہ تھے۔ 481ء میں شہنشاہ زینو نے ایڈیسا (Edessa) کے مقام پر ان کے مکتب کو بند کر دیا۔ اس لیے ان کے علماء ایران ہجرت کر گئے انہوں نے اپنا کام وہاں شروع کر دیا لیکن ایرانی اثرات سے نہ بچ سکے۔ نسطوری ارسطو کو صرف اس کی منطق کی وجہ سے اہمیت

دیتے تھے۔ عرب فلاسفہ نے بھی ابتداء میں صرف منطق ہی کو اہمیت دی۔ تاہم بعد میں انہوں نے ارسطو کی ''مابعد الطبیعیات'' اور ''روح'' کا بھی مطالعہ کیا۔ عمومی طور پر عرب فلاسفہ قاموسی تھے وہ الکیمیا، علم ہیئت، علم نجوم اور علم حیوانات میں اس حد تک دلچسپی لیتے جسے ہم فلسفہ کہہ سکتے ہیں۔ عام لوگ جو انتہا پسند اور متعصب تھے انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی سلامتی (جب وہ سلامت رہتے) نسبتاً آزاد فکر شہزادوں کے تحفظ پر منحصر ہوتی۔

دو مسلم فلاسفہ جن میں ایک ایرانی اور دوسرا ہسپانوی تھا، خاص توجہ کے مستحق ہیں وہ ابن سینا اور ابن رشد ہیں۔ ان میں اول الذکر مسلمانوں میں اور موخر الذکر عیسائیوں میں زیادہ مقبول ہے۔

ابن سینا (Avicenna 980-1037) نے اپنی زندگی اس طرح کی جگہوں پر گزاری جن کی موجودگی کا ظرف شاعری ہی میں ہونا خیال کیا جا سکتا ہے۔ وہ صوبہ بخارا میں پیدا ہوا۔ چوبیس سال کی عمر میں وہ خوا'' ویرانے میں تنہا خوا'' چلا گیا۔ اس کے بعد خراسان میں ''تنہا خورسانی ساحل'' گیا۔ کچھ عرصہ تک اس نے اصفحان میں طب اور فلسفہ کی تعلیم دی۔ پھر اس نے تہران میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ فلسفہ کی بہ نسبت اس نے طب میں زیادہ شہرت پائی اگرچہ اس نے جالینوس کے علم میں کم اضافہ کیا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں یورپ میں طب کے میدان میں اسی سے راہنمائی حاصل کی جاتی رہی۔ راسخ العقیدہ لوگوں نے اس کی سیرت و افکار پر مذموم حملے کئے لیکن اس کی علم طب میں مہارت کے باعث بادشاہوں نے اسے اپنے قریب رکھا۔ بعض اوقات اسے زردوست ترگوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھانا پڑی۔ بعض اوقات تو وہ چھپ جاتا اور بعض اوقات جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اس نے ایک انسائیکلو پیڈیا تصنیف کیا جس کی افادیت سے راسخ العقیدہ لوگوں کی دشمنی کے باعث مشرق محروم رہا۔ لیکن مغرب نے اس سے بہت استفادہ کیا اور لاطینی زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے۔ اس کی نفسیات میں تجربی میلان ہے۔

اپنے پیشترو مسلم فلاسفہ کی بہ نسبت ابن سینا کا فلسفہ ارسطو کے زیادہ قریب اور نو فلاطونی ہے۔ بعد کے مسیحی متکلمین کی طرح وہ مسئلہ کلیات میں مصروف رہا۔ افلاطون نے کہا تھا کہ کلیات اشیاء سے مقدم

ہیں۔ ارسطو کے دو نظریات ہیں ایک وہ جب وہ سوچتا ہے اور دوسرا وہ جب وہ افلاطون کی تردید کرتا ہے۔ یوں ارسطو شرح لکھنے والے کو بے مثال مواد مہیا کرتا ہے۔

ابن سینا نے ایک کلیہ ایجاد کیا ہے جسے بعد میں ابن رشد اور ابرٹ میکناس نے دہرایا۔ ''عقل صورت کو تجرید کر کے تصورات کو عمومی شکل عطا کرتی ہے۔'' اس سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ کلیات کو عقل سے جدا نہیں سمجھتا تھا۔ تاہم یہ ایک بے حد سادہ نظریہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انواع...... یعنی کلیات ...... بیک وقت اشیاء سے قبل، اشیاء کے باطن میں اور اشیاء کے بعد ہوتے ہیں۔ اس کی وہ یوں وضاحت کرتا ہے۔ کلیاش اشیاء سے قبل علم الٰہی میں ہوتے ہیں۔ (مثال کے طور پر خدا ''بلیاں'' تخلیق کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاں ''بلی'' کا تصور ہو، جو اس طرح انفرادی بلیوں سے مقدم ہوتا ہے) انواع فطری معروض کی اشیاء میں ہوتے ہیں (جب بلیاں تخلیق ہو چکیں تو بلی پن ہر بلی میں موجود ہوتا ہے) انواع اشیاء کے بعد ہماری عقل میں ہوتے ہیں (جب ہم بہت بلیاں دیکھ چکے ہیں تو ہم ان سب میں مماثلت پر غور کرتے ہیں تو ''بلی'' کے ایک عمومی تصور پر پہنچتے ہیں) یہ نظریہ بدیہی طور مختلف نظریات میں مصالحت کی نیت سے پیش کیا گیا ہے۔

ابن رشد (Ibne Rushd 1126-98)(Averroes) ابن سینا کی اسلامی دنیا کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ وہ قرطبہ میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کا باپ اور دادا قاضی القضاء کے عہدے پر فائز رہے اس نے پہلے دینیات اور قانون کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد طب، ریاضی اور فلسفہ کے علوم سیکھے۔ ''خلیفہ'' ابو یعقوب یوسف کو ابن رشد کے متعلق بتایا گیا کہ وہ ایسا شخص ہے جو ارسطو کی کتابوں کی تشریح کرنے کا اہل ہے۔ (تاہم یوں لگتا ہے کہ وہ یونانی زبان نہ جانتا تھا) حکمران نے اسے اپنے ہاں عزت سے بلایا۔ 1184ء میں اسے پنا معالج مقرر کیا۔ لیکن بد قسمتی سے دو سال بعد مریض چل بسا۔ اس کے جانشین یعقوب المنصور نے اپنے والد کی گیارہ سال تک اس کی سرپرستی کی۔ جب راسخ العقیدہ لوگوں نے اس فلسفی کی مخالفت کی تو وہ ڈر گیا اور اسے اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور اپنے پہلے قرطبہ کے قریب کسی چھوٹی جگہ اور پھر مراکش کی طرف جلاوطن کر دیا۔ اس پہ یہ الزام تھا کہ وہ سچے دین کی

Marfat.com

قیمت پر قدیم یونانی فلسفے کو فروغ دے رہا ہے۔ المنصور نے یہ حکم جاری کیا کہ خدا ان لوگوں کو جہنم کی آگ میں ڈالتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی کی تلاش عقل محض سے کی جاسکتی ہے۔ تمام وہ کتابیں جو منطق اور مابعد الطبیعات پر مل سکیں ان سب کو نذر آتش کر دیا گیا۔

اس کے جلد بعد ہی عیسائی فتوحات کے باعث سپین میں مورز کا علاقہ بہت مختصر رہ گیا۔ ابن رشد کے ساتھ ہی سپین سے اسلامی فلسفہ ختم ہو گیا۔ باقی اسلامی دنیا میں شدید راسخ العقیدہ مسلمانوں نے فلسفہ پنپنے نہ دیا۔

ابن رشد چاہتا تھا کہ ارسطو کی وہ تشریح جواب تک عربوں نے کی ہے اسے بہتر بنا دے کیونکہ یہ غیر ضروری طور پر نو فلاطونیت سے متاثر تھی۔ اس نے ارسطو کو اس قسم کا احترام دیا جو کسی مذہب کے بانی کو دیا جاتا ہے۔ یہ احترام ابن سینا نے بھی نہیں دیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ خدا کا وجود الہام سے ہٹ کر عقل سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہی نقطہ نظر تھامس اکیوناس کا تھا۔ نظریہ بقاء کے سلسلے میں وہ ارسطو کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ روح غیر فانی نہیں ہے بلکہ عقل (ناؤس) ہے۔ تاہم اس سے شخص بقا قائم نہیں رہتی کیونکہ عقل ایک ہے اور مختلف انسانوں میں اس کا اظہار ایک ہی طرح ہوتا ہے۔ فطری طور پر مسیحی فلسفیوں نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔

ابن رشد، بعد کے بیشتر مسلم فلسفیوں کی طرح، صاحب ایمان تھا مگر شدید راسخ العقیدہ نہ تھا۔ مکمل طور پر راسخ العقیدہ مذہبی لوگوں کا ایک گروہ تھا جنہیں یہ اعتراض تھا کہ تمام فلسفہ ایمان کے لیے مہلک ہے۔ ان میں سے ایک الغزالی تھا جس نے "تحفہ الفلاسفہ" (Destruction of Philosophers) کے نام سے کتاب لکھی۔ اس نے کہا کہ کیونکہ تمام ضروری سچائی قرآن پاک میں موجود ہے اس لیے الہام سے ہٹ کر فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن رشد نے اس کا جواب "تحفہ التحفہ" کتاب لکھی۔ فلسفیوں کے خلاف جن مذہبی عقائد کو الغزالی نے تقویت دی وہ عدم سے زماں میں دنیا کی تخلیق، صفات الٰہی کی حقیقت اور حشر اجساد تھے۔ ابن رشد سمجھتا ہے کہ مذہب میں فلسفیانہ سچائی تمثیلی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کا اطلاق خصوصاً تخلیق پر ہوتا ہے جس کی وہ فلسفیانہ حیثیت میں

تشریح ارسطو کے انداز میں کرتا ہے۔

ابن رشد اسلامی فلسفہ کی بہ نسبت مسیحی فلسفہ میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے وقت سے اول الذکر میں فلسفہ ختم ہوتا ہے جب کہ آخر الذکر میں شروع ہوتا ہے۔ تیرہویں صدر کے اوائل میں مائیکل سکاٹ نے اس کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ بات حیران کن ہے کیونکہ اس کی کتابیں بارہویں صدری کے نصف آخر میں لکھی گئی۔ یورپ میں اس کا وسیع اثر ہوا۔ اس سے نہ صرف متکلمین متاثر ہوئے بلکہ آزاد فکر رکھنے والے غیر فلسفی لوگ بھی۔ فلسفیوں میں اس کی سب سے پہلے تعریف کرنے والے خصوصاً فرانسسکن تھے۔ پیرس یونیورسٹی کے فلسفیوں نے بھی یہی طرز عمل اپنایا۔ لیکن اس موضوع پر بعد میں بحث ہوگی۔

عربی کا فلسفہ اختراعی فکر کے اعتبار سے اہم نہیں ہے۔ ابن سینا اور ابن رشد بنیادی طور پر شارحین تھے۔ عمومی لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ منطق اور مابعد الطبیعیات میں زیادہ سائنسی فلسفیوں کے نظریات ارسطو اور نو فلاطینیوں سے آئے اور باطنی مذہبی فلسفہ میں بھی ایرانی عقائد شامل ہیں۔ عربی میں لکھنے والوں نے علم ریاضی اور علم کیمیا میں کچھ اختراع ظاہر کی۔ آخر الذکر معاملہ میں کیمیا گری کی تحقیق نے اتفاقاً ایسے نتائج پیدا کر دیئے۔ اپنے عروج کے زمانے میں اسلامی تہذیب فنون اور کثیر تکنیکی اعتبار سے قابل تعریف تھی لیکن نظریاتی معاملات میں آزاد فلسفہ کی اہلیت سامنے نہ آئی۔ اس کی اہمیت، جسے کسی صورت بھی ہرگز کم قدر نہ کرنا چاہیے۔ منتقلی کی ہے۔ قدیم اور جدید یورپی تہذیب میں تاریک زمانوں نے مداخلت کی۔ مسلمانوں اور بازنطینیوں نے اختراع کی فکری قوت کے کم ہونے کے باوجود تہذیب کے لوازمات کا تحفظ کیا۔ تعلیم، کتابیں اور فاضلانہ مصروفیت۔ مغرب جب بربریت سے نکلا تو ان دونوں نے اسے تہذیبی تقویت فراہم کی۔ مسلمانوں نے سب سے بڑھ کر تیرہویں صدی میں اور بازنطینیوں نے پندرہویں صدی میں۔ ہر صورت میں محرک نے، منتقل کنندگان کی بہ نسبت نئی فکر پیدا کی۔ ایک صورت میں علم کلام اور دوسری صورت میں نشاۃ ثانیہ (جس کے اور بھی اسباب تھے)

ہسپانوی موروں اور مسیحیوں کے دمریان یہودیوں نے ایک مفید رابطہ پیدا کیا۔ جب عیسائیوں

Marfat.com

نے ملک دوبارہ فتح کر لیا تو سپین میں بہت یہودی تھے۔ وہ عربی جانتے تھے اور انہوں نے مجبوراً عیسائیوں کی بھی زبان سیکھی۔ یوں وہ تراجم کرنے کے اہل بن گئے۔ اس انتقال کا ایک اور ذریعہ بھی بنا۔ مسلمانوں نے ارسطوی لوگوں کو تنگ کیا تو مور فلسفی پناہ لینے خصوصاً پروانس صوبے میں یہودیوں کے پاس چلے گئے۔

ہسپانوی یہودیوں میں صرف ایک اہم فلسفی ہوا جس کا نام میمونا ئڈز (Maimonides) تھا۔ وہ 1135ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا لیکن تیس سال کی عمر میں قاہرہ چلا گیا اور زندگی بھر وہیں رہا۔ اس نے عربی میں لکھا لیکن جلد ہی اس کا عبرانی میں ترجمہ کیا گیا۔ ایسا غالباً فریڈرک دوم کی درخواست پر کیا گیا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''راہنمائے آوارگاں'' (Guide to Wanderers) تھا۔ یہ ان فلسفیوں کے لیے لکھی گئی جو اپنا ایمان کھو چکے تھے۔ اس کا مقصد ارسطو اور یہودی دینیات میں مصالحت کرانا تھا۔ زمین پر سند ارسطو ہے اور آسمان پر الہام۔ لیکن خدا کے علم میں فلسفہ اور الہام یکجا ہو جاتے ہیں۔ سچائی کی تلاش مذہبی فرض ہے۔ توریت کی پہلی کتابوں کو ہمیشہ لغوی طور پر نہیں لینا چاہیے۔ جب لغوی معانی عقل کے خلاف ہوں تو ہمیں اس کی تمثیلی تشریح کرنی چاہیے۔ ارسطو کے خلاف وہ کہتا ہے کہ خدا نے عدم سے صرف ہیت پیدا نہیں کی بلکہ مادہ تھی۔ وہ تھیمئیس (Timaeus) کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ خدا کی حقیقت ہمارے علم میں نہیں آ سکتی کیونکہ تمام کامل صفات سے بھی وہ بلند تر ہے۔ یہودی اسے بدعتی سمجھتے تھے اور اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے کلیسائی عہدیداران کو اس کے خلاف کر دیا۔ بعض کا خیال ہے کہ سپائی نوازا اس سے متاثر ہوا تھا یہ بہت مشتبہ ہے''۔

برٹرنڈرسل: ''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' روٹیلج۔ لندن

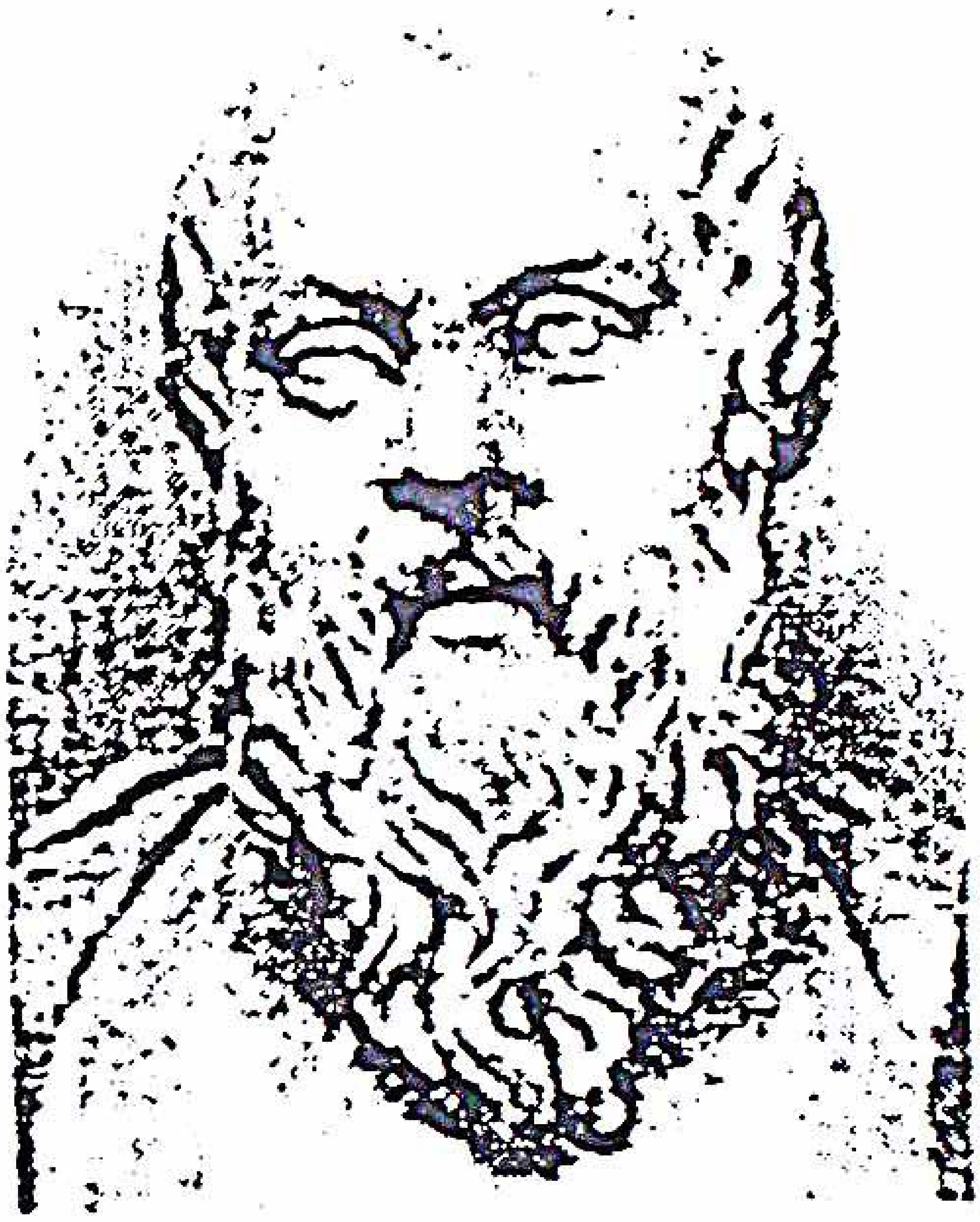

"No evil can happen to a good man, either in life or after death".
– Socrates

Marfat.com

Marfat.com

﴿باب ۲۲﴾

غلاظتوں سے عظمتوں کی جانب

حیات وحسن کی کہانی: ایک درویش کی زبانی

سقراط اور افلاطون قدیم یونانی فلسفیوں میں اعلیٰ مرتبہ کے حامل تھے۔

سقراط نے اپنی زندگی سچائی کے لیے وقف کر دی اور موت اس کی راہ میں قطعی حائل نہ ہوئی حالانکہ اسے موت سے فرار کے کئی مواقع فراہم کیے گئے لیکن وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچائی کی راہ پر ڈٹا رہا۔

افلاطون نے اس عظیم فلسفی کی حکمت وبصیرت حذبہ اور ایمان کی عکاسی اپنے میثور کا مکالمہ ''فیڈو'' مین کی ہے یہ مکالمہ انسان کامل کا تصور پیش کرتا ہے۔

انسان اعلیٰ وہی ہے جو بے خوف وخطر برائیوں اور بدیوں کا مقابلہ کرنے اور ہر طور سچ کا بول بالا کرے۔ ہمیں برے لوگوں کے ہاتھوں خواہ کیسا بھی سلوک برداشت کرنا پڑے ہمیں کبھی بھی برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرنی چاہیے یہ وہ فلسفہ تھا جس نے انسانیت کے عالی معیار قائم کیے۔

یونانی فلسفی اگرچہ مذہب کے اتنے قائل نہ تھے اور فلسفہ کو ہی مذہب مانتے اس لیے ہر وہ شخص جو فلسفہ کا شعور رکھتا ہے سچائی کا پیروکار ہوتا ہے اور موت سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

سچائی کا مضبوط شعور رکھنے کے باد جود یونانی فلسفیوں نے مذہبی اقدار کو کوئی مربوط شکل نہیں دی عیسائیت نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا لیکن وہ بھی جزوی رہا۔ اسلام نے حضرت ابراہیم کے دور سے لے کر آنحضور ﷺ کے زمانے تک ایک تدریجی سفر کیا جس میں اعلیٰ اقدار اور انسا کامل کا ایک مکمل تصور

دیا۔جس کے سہارے انسان کے لیے معراج اولیٰ پر بیٹھنے کے لیے عام دروازے کھل جاتے ہیں۔عقل و دانش روح اور مادہ پر جس طرح کھل کر قرآن میں تذکرہ ہوا ہے وہ انسان کو انسان کامل بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یہاں ایک اور پہلو جو طریقت سے زیادہ قربت رکھت ہے وہ درویشی کے کئی ایسے مضمرات ہیں جو اسلامی تصوف سے ہم آہنگ ہیں۔وہاں وہی اعتدال پسندی اور نرمی پائی جاتی ہے جو مسلمان صوفیوں اور اولیاء کرام کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔

بہر حال ترک دنیا انکا مطمع نظر نہیں ہوتا۔یونانی فلسفی بھی انہی اصولوں کے مداح ہیں جیسا کہ مسلمانوں میں کئی درویشوں کے سلسلے روح کو مادی تماشتوں اور زندگی کی غلاظتوں سے بے نیاز رکھتے ہیں۔لذتوں اور مسرتوں کا تعلق ذہن سے ہے۔جسمانی محرکات اکثر بدمزگی کا سبب ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یونانی فلسفیوں کے نزدیک لذتوں کی کوئی اہمیت نہیں جو کہ قرآن کے اخلاقی تصور روحانی پہلوؤں سے خاصی حد تک منطبق ہے۔

انسانی جسم کی غلاظتوں اور رطوبتوں کو دور کر کے ہی آدمی اس عظمت کی ان منازل کی طرف پہنچتا ہے جو کہ اس کا مقصود ہیں۔۔افلاطون کے مکالمہ میں مذہب کے عقلی پہلوؤں پر بھی بحث کی گی ہے۔ سچائی دل و دماغ پر کیسے منکشف ہوتی ہے اور اس پر قائم رہنا انسانی عظمت کے لیے کتنا ضروری ہے۔ان مضمرات پر بھی اس مکالمہ میں غور کیا گیا ہے۔

حصول علم بھی اس فلسفے کا ایک اہم پہلو ہے جسے ذہنی اور روحانی عظمت کے تناظر میں بروئے کار لانا نہایت ضروری ہے یونانی فلسفہ اور اسلام دونوں اس کے دائمی پہلو ہیں۔دونوں نظریات اس بات پر متفق ہیں کہ بہت سی غلط خواہشات حصول علم اور پاکیزگی کی راہ میں آڑے آتی ہیں اور انسان عظمت کی ان بلندیوں پر نہیں پہنچ پاتا جو اسے علم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔

عقل کی پاکیزگی بھی سچائی کا ایک نہایت اہم جزو ہے۔افلاطون کہتا ہے کہ دوسری دنیا میں خدا کا قرب انہی لوگوں کو حاصل ہوگا جو پاکزگی کی حالت میں دوسری دنیا میں پہنچیں گے۔

یہ تمام خیالات انتہائی صوفیانہ ہیں اور کس قدر اسلام سے مماثلت رکھتے ہیں اس کا اندازہ ان کا مطالعہ کرنے سے ہی ہوسکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی غلاظتوں مین دھنس کر انسان کس قدر اپنی شرافت عظمت سے محروم ہو جاتا ہے جو کہ اس کا ازلی اور دائمی سرمایہ ہے۔

ہم یہاں برٹرینڈ رسل کی مشہور کتاب ''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جو اس مضمون کو مزید واضح کرنے میں ہمارا ساتھ دے گے۔

''وہ مکالمہ جس کا نام ''فیڈو'' کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔ کئی اعتبارات کے حوالے سے دلچسپ ہے۔ اس کا مقصود سقراط کی زندگی کے آخری لمحات بیان کرنا ہے۔ یہ عبارت ہے اس گفتگو سے جو اس نے زہر کا پیالہ پینے سے فوراً پہلے اور اس کے بعد اور اس وقت تک کی جب تک اس کے ہوش و حواس قائم رہے یہ مکالمہ افلاطون کے انسان اعلیٰ کا تصور پیش کرتا ہے جو عظیم ترین درجے کے دانا اور رولی ہے اور جسے موت کا خوف بالکل نہیں ہے۔ افلاطون نے اسے جس قسم کا انسان پیش کیا ہے وہ اخلاقی طور پر قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں بہت اہم تھا۔ مسیحیوں کے نزدیک جو حیثیت صحیفے کی اس عبارت کی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صبر و صلیب کا ذکر ہے وہ ہی حیثیت وشنی یا آزاد خیال فلسفیوں کے نزدیک ''فیڈو'' کی ہے۔ لیکن سقراط کے آخری لمحات کے سکون وطمانیت کا تعلق اس کے حیات ابدی کے عقیدے سے وابستہ ہے۔ ''فیڈو'' کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ اس میں ایک شہید کی موت کا ذکر ہے بلکہ اس بہت سے نظریات کی وجہ سے بھی ہے جو بعد ازاں مسیحوں نے اپنائے۔ ولی پال اور دوسرے فقیہوں کی دینیات بالواسطہ اسی کی مرہون منت ہے اور افلاطون کو نظر انداز کرنے سے اسے صحیح طور پر مشکل ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اس سے پہلے کا مکالمہ ''کریٹو'' بتاتا ہے کہ کس طرح سقراط کے احباب اور شاگردوں نے منصوبہ تیار کیا جس سے کہ سقراط تحیلی کی جانب فرار ہو جائے۔ غالباً ایتھنز کے مقتدرین بھی اس کے بچ نکلنے پر بہت خوش ہوتے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اس منصوبے کے کامیاب ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ تاہم سقراط کو اس طرح کی کوئی بات پسند نہ آئی۔ اس کا اصرار تھا کہ چونکہ اسے قانونی عمل کے تحت سزا دی گئی ہے

Marfat.com

اس لیے اس سزا سے بچنے کے لیے کوئی قدم اٹھانا غیر قانونی بات ہے۔ پہلے تو وہ اس اصول کا اقرار کرتا ہے جسے ہم پہاڑ پر وعظ سے ملاتے ہیں کہ ”ہمیں کسی شخص کے ہاتھوں کبھی بھی اس کی برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرنی چاہیے۔“ پھر وہ خود کو ایتھنز کے قوانین سے مکالمہ کرتے ہوئے تصور کرتا ہے اس میں قوانین اسے بتاتے ہیں کہ اس کی طرف سے انہیں وہی عزت واجب الادا ہے جو ایک بیٹے کی طرف سے باپ کو یا ایک غلام کی طرف سے آقا کو ہتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ تر درجے کی عزت کے وہ مستحق ہیں۔ مزید یہ کہ ایتھنز کا ہر شہری اس معاملے میں آزاد ہے کہ اگر ایتھنز کی ریاست ناپسند ہے تو وہ نقل مکانی کر جائے قوانین ایک طویل تقریر ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

”پس سقراط! تم ہماری بات سنو کہ ہم نے تمہاری پرورش کی ہے تم اپنی زندگی اور بچوں کو انصاف پر ترجیح مت دو بلکہ اس کے برعکس تمہیں انصاف کو اپنی زندگی اور بچوں پر ترجیح دینی چاہیے تاکہ دوسری دنیا میں ملائکہ کے سامنے تمہارے حیثیت صاف ہو۔ اگر تم کریٹو کے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہو تو تم اور تم سے تعلق رکھنے والا کوئی دوسرا شخص نہ ہتو اس دنیا میں خوش پاک باطن اور حق پرست رہ سکتا ہے اور نہ ہی دوسری دنیا میں۔ لیکن اگر تم ہمارے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے موت کو خوش آمدید کہتے ہو، تب گویا ایک ایسے بے گناہ معصوم کی حیثیت میں اس دنیا میں رخصت ہو گئے جس نے لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہیں کہ بلکہ خود دوسروں کی برائی کا شکار ہو گیا اس کے برعکس اگر تم لوگوں کی اس برائی کے جواب میں برائی کرتے ہو اور زیادتی کے بدلے زیادتی کر کے اور ہمارے ساتھ کیئے گئے اپنے معاہدوں اور عہد ناموں کو توڑتے ہوئے اور انہیں نقصان پہنچاتے ہوئے رخصت ہوتے ہو جنہیں تمہارے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے، یعنی خود اپنے آپ کو اپنے دوستوں کو اپنے ملک کو اور ہم قوانین کو تو پھر ہم تم سے تمہاری زندگی بھر خفا رہیں گے۔ اور جب تم مر جاؤ گے تو دوسری دنیا میں

ہمارے بھائی یعنی وہاں کے قوانین بھی تمہیں اپنا دشمن تصور کریں گے کیونکہ انہیں یہ معلوم ہوگا کہ تم نے اس دنیا میں ہمیں تباہ کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کی ہے۔"

سقراط کہتے ہے "یہ ہے وہ آواز جسے میں اپنے کانوں میں بھنبھاہٹ کرتے سنتا ہوں جیسے کسی صوفی کے کانوں میں بانسری کی آواز آتی ہے"۔ اس کے مطابق وہ یہ فیصلہ کرتے ہے کہ اس اس کا فرض ہے کہ وہ وہیں رہے اور سزائے موت قبول کرلے۔

"فیڈو" میں یوں رقم ہے کہ جب اس کی زندگی کے آخری لمحات آتے ہیں تو اس کی زنجیریں کھول دی جاتی ہیں اور اسے اس کی اجازت دے دی جاتی ہے وہ ان اپنے دوستوں سے آزادانہ گفتگو کرے۔ وہ اپنی روتی ہوئی بیوی کو واپس بھیج دیتا ہے تا کہ اس خاتون کا غم اس کی بحث میں مخل نہ ہو سکے۔

سقراط اپنی بات کا آغاز یوں کرتا ہے کہ اگرچہ ہر وہ شخص جو فلسفہ کا شیدائی ہے موت سے خوف زدہ نہ ہوگا بلکہ اس کے برعکس اسے خوش آمدید کہیگا تاہم وہ خود اپنی زندگی ختم نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس بات کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے دوست پوچھتے ہیں کہ خودکشی کرنے کو کیوں غیر قانونی دیا گیا ہے۔ اس کا جواب جو آرنی نظریہ کے مطابق ہے قریب قریب وہی ہے جو ایک مسیحی بھی شاید کہے "یہ نظریہ تو بطور راز ہلکی سی آواز میں بتایا جاتا ہے کہ انسان ایک ایسا قیدی ہے جسے اپنے قید خانے کا دروازہ کھول کر فرار ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں ابھی مکمل طور پر نہیں سمجھ سکا۔" وہ انسان کا خدا سے رشتہ یوں قرار دیتا ہے جیسا کہ مویشیوں کا ان کے مالک سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارا بیل تمہاری خواہش یا مرضی کے خلاف اپنا خاتمہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے آخری وقت کا انتظار کرنا چاہیے یہاں تک کہ خدا کی طرف سے مج ہے ہی ایسا بلاوا آجائے جیسا کہا اس کی طرف سے بلاوا آیا ہے" اسے اپنی موت کا کوئی دکھ نہیں ہے کیونکہ اسے یقین ہے "پہلی اس بات پر کہ میں دوسری دنیا میں ایسے دیوتاؤں کی نگرانی میں جا رہا ہوں جو زیادہ عقلمند اور پارسا ہیں (اس بات کا مجھے اتنا یقین ہے جتنا کہ ایسی ہی دوسری باتوں کا) اور دوسری اس بات پر (اگرچہ اس کے بارے میں مجھے پہلی بات جتنا یقین نہیں

ہے) کہ میں اپنے سے پہلے فوت ہو جانے والے ان افراد سے جاملوں گا جو اس دنیا میں موجود لوگوں سے بہتر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مرنے والوں کے لیے موت میں شر کی بجائے خیر کا پہلو زیادہ ہے۔''

سقراط کہتا ہے ''موت نام ہے جسم سے روح کی علیحدگی کا۔ یہاں ہم افلاطون کی ثنویت پر آ جاتے ہیں۔ جیسے وجود و شہود، اعیان اور مادی اشیاء، عقل اور حواس، روح اور جسم یہ جوڑے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ہر جوڑے میں پہلا حصہ دوسرے سے حقیقت اور خیر میں افضل ترین ہے۔ راہبانہ اخلاق فطری طور پر اسی ثنویت کا نتیجہ ہے۔ عیسائیت نے اس نظریے کو جزوی طور پر اپنایا۔ لیکن مکمل طور پر کبھی نہیں۔ اس راہ میں دو رکاوٹیں تھیں۔ پہلی یہ تھی کہ اگر افلاطون کی بات کو صحیح مان لیا جائے تو شاید مادی دنیا کی تخلیق شر معلوم ہو اور شر خالق کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمہ مسیحیت شادی کی مذمت نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے تجرد کو زیادہ شریفانہ عمل قرار دیا۔ مانویت کے ماننے والے دونوں پہلوؤں پر ثابت قدم رہے۔

ذہن اور مادہ کے درمیان تفریق، جواب، فلسفہ، سائنس اور مقبول سوچ میں عام ہو چکی ہے کہ ابتداء مذہب سے ہوئی، جو روح اور جسم کی تقسیم سے شروع ہوئی۔ جیسا ہم نے دیکھا ایک آرفی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ زمین اور ستاروں بھرے آسمان کا بچہ ہے۔ زمین سے بدن آیا ہے اور آسمان سے روح۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے افلاطون فلسفے کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

''فیڈو'' میں سقراط فوراً ہی بات کو آگے بڑھاتا ہے کہ اس کے نظریہ کی درویشی کے مضمرات کیا ہیں۔ اس کی درویشی میں اعتدال پسندی اور نرمی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ ایک فلسفی کو عام مسرتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہ اسے لذتوں کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔ ایک فلسفی کو طعام و مشروبات کی لذت کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن بلاشبہ اسے اس قدر ضرور کھانا پینا چاہیے جس قدر کہ اس کی فطری ضرورت ہے۔ اس میں فاقہ کشی کا کوئی مشورہ نہیں ہے اور ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ سقراط شراب سے بے نیاز رہتا لیکن بعض مواقع پر مے نوشی میں اس کا کوئی حریف نہ بن سکتا اور پھر بھی وہ مدہوش و بدمست نہ ہوتا۔ وہ مے نوشی کی نہیں بلکہ اس کی لذتوں کی مذمت کرتا ہے۔ اسی طرح ایک فلسفی کو عشق و محبت کی لذتوں کی

بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اسے قیمتی ملبوسات، جوتوں یا جسمانی زینت و آرائش کی دوسری باتوں میں بھی دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔ اس کی دلچسپی مکمل طور پر روح کے معاملات سے ہونی چاہیے اور بدن کے معاملات سے نہیں۔'' جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ بدن سے ہٹ کر روح کی طرف متوجہ رضا پسند کرتا ہے۔''

یہ ظاہر ہے کہ اس نظریے کا حقیقی مدعا ترک دنیا نہیں لیکن جب یہ عام لوگوں میں پہنچتا ہے تو اسے ترک دنیا سمجھ لیا جاتا ہے ایک فلسفی حسی مسرتوں سے ارادتاً اجتناب نہیں کرے گا بلکہ وہ دوسرے معاملات میں دلچسپی لے گا۔ میں نے بہت فلسفیوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ کسی کتاب کے مطالعے میں اتنے محو ہو گئے کہ وہ اپنا طعام بھول گئے اور پھر بالا آخر انہوں نے کھانا کھایا۔ یہ لوگ اس طرح عمل کر رہے تھے جیسا کہ افلاطون کہتا ہے کہ انہیں کرنا چاہیے۔ وہ کسی اخلاقی کوشش سے بسیار خوری سے نہیں بچ رہے تھے بلکہ ان کی دلچسپیوں کے اور ہی امور تھے۔ یہ واضح ہے کہ فلسفی کو شادی کر لینی چاہیے۔ بچے پیدا کرنا اور ان کی پرورش بھی کرنی چاہیے۔ لیکن اپنے ہی افکار میں کھوئے رہنا چاہیے۔ لیکن آزادی نسواں کے زمانے سے ایسا کرنا زیادہ کوئی تعجب نہیں کہ زینتھپی لڑاکا خاتون تھی۔

سقراط اپنی بات یوں جاری رکھتا ہے کہ فلسفی جسمانی اور مادی معاملات سے روح کو بے نیاز رکھتے ہیں۔ جب کہ باقی لوگ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کی زندگی کسی قابل نہیں ہوتی ''حسی اور مادی لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔'' یوں لگتا ہے کہ ان الفاظ میں افلاطون نے .... شاید غیر ارادی طور پر .... ماہرین اخلاق کے اس طبقے کی مخالفت کی ہے جو سمجھتے ہیں کہ صرف جسمانی لذتوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ ان ماہرین اخلاق کے خیال میں جو شخص جسمانی لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا وہ ہر قسم کی مسرت سے کنارہ کش ہو جاتا ہے تو پارسا زندگی گزارتا ہے۔ اسی غلطی سے ناقابل بیان نقصان پہنچا ہے۔ جس حد تک ذہن و جسم کی تقسیم کی جا سکتی ہے بدترین لذتیں اور بہترین مسرتیں صرف ذہنی ہوتی ہیں .... مثال کے طور پر حسد اور ظلم کی کئی صورتیں اور اقتدار کی ہوس۔ ملٹن کا شیطان جسمانی اذیتوں سے بلند تر ہو جاتا ہے اور خود کو تباہی کے کام کے لیے وقف کر دیتا ہے جس سے وہ ایسی لذت حاصل کرتا ہے جو مکمل طور پر ذہنی ہے

Marfat.com

کیثر مشہور اہل کیسا، جنہوں نے جسمانی لذتوں کو تیاگ دیا اور دوسری لذتوں سے محتاط نہ رہے وہ اقتدار کی محبت سے مغلوب ہو گئے جو انہیں ہیبت ناک مظالم اور دردناک اذیتیں دینے کی راہ پر لے گئے۔ اور یہ سب برائے نام مذہب کی خاطر کیا گیا۔ آج ہماری دنیا میں ہٹلر اسی قسم کا انسان ہے۔ ہر بات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے لیے جسمانی لذتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جسم کے جبر و تسلط سے آزادی عظمت کی طرف لے جاتی ہے لیکن ایک ہی طرح یا گو گناہ میں بڑھائی کا سبب بنتی ہے یا نیکی مین عظمت کا موجب ہوتی ہے۔

تاہم یہ بات گریز کی ہے جس سے ہم سقراط کی طرف لوٹتے ہیں۔

اب ہم مذہب کے عقلی پہلو کی طرف آتے ہیں جسے افلاطون (صحیح یا غلط طور پر) سقراط سے منسوب کرتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جسم حصول علم میں رکاوٹ بنتا ہے اور سماعت اور بصارت کے حواس غلط گواہ ہیں۔ اگر حقیقی وجود روح پر منکشف ہوتا ہے تو صرف خاص تفکر کی صورت میں اور حواس کی وابستگی کی صورت میں نہیں۔ آیئے لمحہ بھر کے لیے اس نظریے کے مضمرات پر غور کیں۔ اس طریق میں تجرباتی علم کی مکمل نفی ہو جاتی ہے جس میں تمام تاریخ اور جغرافیہ ہے۔ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی ایسی جگہ تھی جسے ایتھنز کہتے ہیں اور کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سقراط کہا جاتا ہے۔ اس کی موت اور مرتے وقت اس کی جرات شہود کی دنیا ہی سے متعلق ہیں۔ اس کے متعلق ہم صرف بصارت اور سماعت ہی سے جان سکتے ہیں اور سچا فلسفی بصارت اور سماعت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر ہمارے لیے باقی کیا بچتا ہے؟ پہلی چیز منطق اور علم ریاضی، لیکن یہ تو مفروضیات پر مبنی ہیں اور حقیقی دنیا کے متعلق کسی قطعی دعوے کا جواز نہیں بنتے۔ دوسری چیز ...... اور یہ بہت قطعی ہے..... کا انحصار خیر کے عین پر ہے۔ اس عین کو پا لینے کے بعد فلسفی اس علم کو فرض کر لیتا ہے۔ کہ خیر اور حقیقت کو ایک ہی شے قرار دینے کے لیے دلائل پیش کر دیئے لیکن یوں لگتا ہے کہ افلاطون نے بدیہی سچائی سمجھ لیا۔ اگر ہم اسے سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فرضی طور پر اس قیاسی امر کو حق بجانب قرار دے لیتے ہیں۔

سقراط کہتا ہے کہ فکر انسانی اس وقت بہترین ہوتی ہے جب ذہن خود محویت کی کیفیت میں ہوتا ہے

اور آوازوں، نظاروں، درود آلام اور لذتوں اور ہر قسم کے مادی اور جسمانی علائق سے آزاد ہو جاتا ہے اور وجود حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔'' اور اس طرح سے فلسفی جسم کی بے قدری کرتا ہے'' اس مقام سے سقراط اعیان یا امثال یا جواہر کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ یعنی عدل مطلق، حسن مطلق اور خیر مطلق ہے لیکن یہ جسمانی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے۔'' اور میں یہ بات صرف مطلق عدل حسن یا خیر ہی کے بارے میں نہیں بلکہ مطلق صحت، طاقت، غرض ہر چیز کی مطلق اور حقیقی نوعیت کے بارے میں کرتا ہوں''۔ ان سب کو صرف عقلی بصیرت (Intellectual Vision) سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے جب تک ہم جسم سے وابستہ رہتے ہیں اور ہماری روح جسمانی آلائشوں کے تعفن سے آلودہ رہتی ہے ہماری حقیقت کو جاننے کی خواہش کی تسکین نہیں ہوگی۔

یہ زاویہ نظر حصول علم کے لیے سائنسی مشاہدے اور تجربے کے طریقوں کو خارج کر دیتا ہے۔ تجربہ کرنے والے کا ''ذہن خود محویت'' کے عالم میں چلا جاتا اور سماعت کو بصارت کو پس پشت نہیں ڈالتا۔ ذہنی عمل کی دو اقسام جو اس طریقے مین بروئے کار آتی ہیں اور جنہیں افلاطون پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وہ ریاضی اور صوفیانہ بصیرت ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں ذہن عوامل کس قدر بہ دل و جان افلاطون اور فیثا غورثیوں میں گھل جاتے ہیں۔

حصول علم کے لیے تجربے میں یقین رکھنے والے شخص کے لیے جسم وہ ذریعہ ہے جو خارجی دنیا کی حقیقت کے ساتھ لمس کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ لیکن افلاطون کے خیال میں اس میں وہ خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسخ کرنے والا ذریعہ ہے جس سے ہم اشیاء کو یوں دیکھتے ہیں جیسے آئینے میں مبہم طور پر۔ دوسری یہ کہ چونکہ یہ خواہشات کا ماخذ ہے اور خواہشات علم کے حصول اور سچائی کے نور کی معرفت کی گمراہ کرتی ہیں۔ چند اقتباسات اس بات کو واضح کر دیں گے۔

''جسم ہمارے لیے مستقل زحمت کا باعث ہے کیونکہ یہ ہر وقت خوراک کی طلب میں لگا رہتا ہے۔ یہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر وجود حقیقی کے بارے میں ہماری تلاش میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ یہ ہمیں عشق محبت، شہوت، خوف اور طرح طرح کے خیالات اور بے انتہا حماقتوں میں مبتلا رکھتا ہے اور اس

Marfat.com

طرح ہماری قوت فکر کو محدود سے محدود کرتا بلکہ ختم کر دیتا ہے۔ لڑائی، جھگڑے، جنگیں اور گروہ بندیاں کہاں سے جنم لیتی ہیں؟ یہ جسم اور جسمانی شہوتوں کے سوا کہاں سے آتی ہیں؟ جنگیں اکثر دولت کی محبت میں ہی لڑی جاتی ہیں اور دولت کو جسمانی سہولتوں اور جسمانی خدمات کی خاطر حاصل کیا جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کی وجہ سے ہم فلسفہ کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ اور بدترین معاملہ یہ ہے کہ اگر کبھی ہمارے پاس وقت ہو بھی اور فراغت کے اوقات میں غور وفکر شروع بھی کر دیں تو ہمارا جسم ہماری فکر میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور ہماری تحقیق میں افراتفری اور ابہام پیدا کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس طرح حیران و پریشان کر دیتا ہے کہ ہم سچائی کو نہیں دیکھ پاتے۔ تجربے سے ہم پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اگر ہمیں کسی شے کا علم حاصل کرنا ہے تو ہمیں اپنے جسم سے آزاد ہونا پڑے گا۔ روح کو جسم سے بالکل آزاد ہو کر اشیاء کو جیسی کہ فی الذات ہیں دیکھنا پڑے گا۔ تب ہی ہم اس دانش کو حاصل کر سکیں گے جس کے ہم خواہاں ہیں اور جس کا ہم اپنے آپ کو عاشق کہتے ہیں۔ جب تک جسم روح کے ساتھ ہے خالص علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ علم کا حصول اگر ممکن ہے تو علم صرف مرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اور یوں جب ہم جسم کی حماقتوں سے آزاد ہو کر مکمل طور پر خالص ہو جائیں گے تو تب ہی ہم خالص حقائق کے محرم راز ہوں گے اور ہمیں ہر کہیں واضح روشنی دکھائی دے گی اور یہ ہی سچائی کا نور ہے کیونکہ ناپاک افراد کو خالص حقائق تک رسائی کی اجازت نہیں دی جاتی.... یہ پاکیزگی روح کی جسم سے علیحدگی کے سوا اور کیا گیا؟...... اور یہ علیحدگی یعنی جسم کے قید خانے سے روح کی یہ رہائی ہی موت کہلاتی ہے.... اور حقیقی فلسفی اور صرف وہی ہمیشہ روح کی جسم سے علیحدگی کے متلاشی ہوتے ہیں۔

صرف ایک ہی سکہ ہے کہ جس سے تمام چیزوں کا تبادلہ ہونا چاہیے اور اس کا نام دانش ہے دیو مالائی تمثیلوں کے بانی صحیح معانی ہی بیان کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کوئی نامعقول بات نہیں کر رہے تھے جب انہوں نے کافی عرصہ ہوا ایک تمثیل میں یہ بتایا کہ جو لوگ ناپاکی کی حالت میں یا رسومات کی ادائیگی کے بغیر دوسری دنیا میں پہنچتے ہیں تو وہ ایک دلدلی علاقے میں رکھے جائیں گے۔ لیکن جو پاکیزگی کی حالت میں یا رسومات کی ادائیگی کے بعد دوسری دنیا تک پہنچتا ہے اس کا ٹھکانا دیوتاؤں کے ساتھ ہو

Marfat.com

گا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لبادہ پوش اور عصا بردار تو بہت ہوتے ہیں لیکن صوفیا چند ایک ہی ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی تشریح میں یوں کرتا ہوں کہ سچے صوفیا ہی حقیقی فلسفی ہوتے ہیں۔''

یہ تمام زبان صوفیانہ ہے اور تماثیل سے لی گئی ہے۔ ''پاکیزگی'' ایک آرفی تصور ہے اور اس کے بنیادی معانی رسمی ہیں۔ لیکن افلاطون کے خیال میں پاکیزگی نام ہے جسم اور اس کی ضروریات سے آزادی کا۔ اسے یہ کہتے ہوئے پانا دلچسپ لگتا ہے کہ جنگوں کا سبب دولت کی محبت ہے اور دولت کی ضرورت صرف بند کی خدمت کے لیے ہوتی ہے۔ اس رائے کا نصف حصہ تو وہی ہے جو مارکس کا خیال تھا لیکن دوسرا نصف مختلف زاویہ نگاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ افلاطورن سمجھتا ہے کہ اگر انسان کی ضروریات کم سے کم ہوں تو بہ بہت تھوڑی دولت کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اور بلاشبہ صحیح ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ایک فلسفی کو دستی کام سے مستثنٰی قرار دے دینا چاہیے۔ اس لیے اس دولت پر گزارہ کرنا چاہیے جو دوسری کی کمائی ہے۔ ایک بہت غریب ریاست میں فلسفیوں کے نہ ہونے کا امکان ہے پیریکلز کے زمانے میں ایتھنز کی سامراجیت تھی جس کے باعث اہل ایتھنز کے لیے فلسفے کا مطالعہ ممکن ہوا۔ وسیع معانی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقلی متاع بھی اتنی ہی مہنگی ہے جتنی کہ زیادہ مادی ضروریات اور معاشی حالات سے کم ہی بے نیاز ہوتی ہے۔ سائنسی علم کے لیے لائبریریاں، تجربہ گاہیں، دوربینیں، خوردبینیں اور ایسی ہی ضروریات درکار ہیں اور سائنس دانوں کی مدد بھی دوسروں کی محنت پر ہی ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک صوفی کے لیے یہ سب حماقت ہے۔ ہندوستان اور تبت میں ایک جوگی کو تجربے کے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وہ صرف لنگوٹی باندھ لیتا ہے، چاول کھاتا ہے اور معمولی بھیک پر گزارہ کرلیتا ہے کیونکہ اسے دانا سمجھا جاتا ہے۔ یہ افلاطون کے نقطہ نظر کا ہی منطقی ارتقاء ہے۔

آیئے ''فیڈو'' کی طرف لوٹیں۔ سیبیز (Cebes) اس شک کا اظہار کرتا ہے کہ موت کے بعد روح کی بقاء نہیں ہوتی۔ وہ سقراط سے درخواست کرتا ہے کہ اس کے متعلق وہ دلائل دے۔ سقراط یہی کرتا ہے لیکن یہ کہنا چاہیے کہ یہ دلائل بہت کمزور ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ تمام اشیاء جو متضادات رکھتی ہیں وہ سب اپنے متضادات سے جنم لیتی ہیں.... یہ وہ بیان ہے جو ہمیں 1 نیکسی مینڈر کا ئناتی عدل کے نقطہ نظر

Marfat.com

کی یاد دلاتا ہے۔اب حیات وموت متضادات ہیں۔اس لیے ہر ایک دوسرے سے ہی جنم لیتی ہے۔اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کی ارواح کہیں اپنا وجود رکھتی ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد پھر کسی جسم کے ساتھ دوبارہ پیدا ہو کر اس دنیا میں واپس آ جاتی ہیں۔ولی پال کی بات ''بیج میں موت کے بغیر زندگی نہیں آتی'' اس قسم کے نظریے سے ہی تعلق رکھتی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ علم بازیافت (Recollection) ہے۔اس لیے روح کا وجود پیدائش سے پہلے ضرور ہوتا ہے۔یہ نظریہ کہ علم بازیافت ہے اس کی تائید زیادہ اس امر واقعی سے ہوتی ہے کہ ہمارے ذہن میں اعیان ہوتے ہیں جیسے کسی شے کی قطعی صحیح مساوات جسے تجربے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ہمارے تجربے میں لگ بھگ مساوات ہوتی ہے۔لیکن مطلق مساوات حسی اشیاء میں کہیں نہیں پائی جاتی لیکن پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ مطلق مساوات سے کیا مراد ہے۔چونکہ ہم نے یہ بات تجربے سے نہیں سیکھی اس لیے ہم پیدا ہی اس علم کے ساتھ ہوئے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ یہی دلیل دیگر تمام اعیان پر صادق آتی ہے۔اس لیے جواہر کا وجود اور انہیں سمجھنے کی ہماری اہلیت یہ ثابت کرتے ہیں کہ روح علم کے ساتھ ہی پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

یہ قضیہ کہ علم بازیافت ہے ''مینو'' میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔یہاں سقراط کہتا ہے کہ ''کوئی علم سکھایا نہیں جاتا۔محض بازیافت ہوتا ہے وہ اپنے نقطہ نظر کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے مینو سے کہتا ہے کہ وہ اپنے غلام لڑکے کو بلائے۔سقراط اس لڑکے سے علم المساحت (جیومیٹری) کے مسائل پر سوالات کرنے لگتا ہے۔لڑکے کے جوابات سے یہ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ اسے جیومیٹری کا علم ہے۔حالانکہ وہ اب تک یہ علم رکھنے سے بے خبر ہے۔''مینو'' میں بھی وہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے جو کہ ''فیڈو'' میں پایا جاتا ہے۔وہ یہ کہ روح اپنے پہلے وجود میں علم رکھتی ہے اور اسے ساتھ لے کر آتی ہے۔

اس کے متعلق ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ پہلی بات تو یہ کہ اس دلیل کا تجرباتی علم پر اطلاق ہرگز نہیں ہوتا۔غلام لڑکے کو اس یاددہانی کی طرف نہیں لے جایا جا سکتا کہ اہرام کب بنائے گئے تھے یا ٹرائے کا محاصرہ واقعی ہوا تھا۔جب تک کہ وہ خود ان واقعات کے وقت موجود نہ ہوتا۔صرف اس قسم کا علم ہے جسے

Marfat.com

قبل تجربی (A priori) کہا جاتا ہے.... خصوصاً منطق اور ریاضی.... کے متعلق کس حد تک فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایسے علم کا تجربے سے پہلے ہی وجود ہوتا ہے۔ حقیقت میں علم کی صرف یہی قسم ہے صوفیانہ بصیرت سے الگ) جسے افلاطون حقیقی علم تسلیم کرتا ہے۔ آیئے ہم یہ دیکھیں کہ علم ریاضی پر اس دلیل کا کس حد تک اطلاق ہوتا ہے۔

مساوات کا تصور لیجیے۔ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حسی اشیاء کے درمیان مطلق مساوات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہم صرف قریب قریب دیکھتے ہیں۔ تو ہم مطلق مساوات کے تصور تک کس طرح پہنچ پاتے ہیں؟ یا کیا شاید ہمارے پاس ایسا کوئی تصور نہیں ہوتا؟

اگر ہمارے پاس کوئی ایسا تصور ہوتا تو یہ واضح ہے کہ کسی بچے کے پاس ایسا تصور نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ایک خاص عمر تک نہیں پہنچ جاتا۔ اور یہ تصور تجربے سے مستنبط کیا جاتا ہے اگرچہ ہمارا پیدائش سے پہلے کے وجود کا تصور جزوی طور پر حیات سے ماورا فرض کر لیا جائے تو پھر کیوں نہ یہی بات موجودہ وجود سے متعلق فرض کر لی جائے۔ ان تمام بنیادوں پر یہ دلیل ناکام ہو جاتی ہے۔

یہ مانتے ہوئے کہ بازیافت کا نظریہ صحیح قائم ہو گیا ہے سیبیز کہتا ہے کہ ''ہماری بات ابھی صرف آدھی ہی ثابت ہوئی ہے یعنی یہ کہ ہماری روح پیدائش سے پہلے موجو اتی لیکن یہ بات کہ موت کے بعد بھی ہماری روح اسی طرح زندہ رہے گی جس طرح کے پیدائش سے پہلے تھی تو یہ وہ دوسرا نصف ہے جسے ثبوت کی ابھی ضرورت ہے۔'' تب سقراط اس کا جواب دینے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ سقراط کہتا ہے کہ ہم پہلے جو دلائل دے چکے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے اپنے متضاد سے جنم لیتی ہے۔ اس کے مطابق موت سے حیات اسی طرح جنم لیتی ہے جس طرح حیات سے موت۔ لیکن وہ ایک اور دلیل کا اضافہ کرتا ہے جس کی فلسفے میں بڑی طویل تاریخ ہے۔ یعنی جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہے وہ قائل تحلیل اور قابل انتشار ہے۔ روح اعیان کی مانند بسیط (سادہ) ہے اور اجزا کا مرکب نہیں ہے۔ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ جو کچھ بسیط ہے وہ ہمیشہ موجود بالذات اور غیر متغیر ہے۔ اب مطلق اعیان میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر حسن مطلق ہمیشہ یکساں رہتا ہے اب مطلق اعیان میں کبھی بھی

Marfat.com

کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر حسن مطلق ہمیشہ یکساں رہتا ہے جب کہ حسین اشیاء مستقل تبدیلی ہوتی رہتی ہیں۔ یوں مرئی اشیاء متغیر رہتی ہیں اور غیر مرئی غیر متغیر یعنی ابدی ہوتی ہیں۔ جسم مرئی ہے لیکن روح غیر مرئی۔ اس لیے روح کو ان اشیاء کے گروہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ جو لافانی ہیں۔

چونکہ روح لافانی ہے تو یہ بقائے دوام کے عالم میں ابدی اشیاء پر غور وخوض کرتی ہے یعنی جو اعیان ہیں۔ لیکن جب مادی اشیاء کی دنیا کو دیکھتی ہے تو ان متغیر اشیاء کی دنیا ن پر غور کرتی ہے تو خود بھی کھو جاتی اور پریشان ہو جاتی ہے۔

''جب روح جسم کو ادراک کے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتی ہے یعنی یہ کہ جب وہ بصارت یا سماعت یا کسی بھی دوسری حس کو استعمال کرتی ہے (کیونکہ جسم کے ذریعے ادراک کے معانی حواس کے ذریعے ادراک کے ہیں)۔۔۔۔ تو روح خود بھی جسم کے ساتھ ساتھ عالمی تغیر میں کھچی چلی جاتی ہے۔ جہاں وہ بھٹکتی پھرتی اور ابتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ دنیا اس کے گرد چکر لگا رہی ہوتی ہے اور روح نشہ میں آئے ہوئے شرابی کی طرح اس عالم تغیر سے دوچار ہوتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ اپنا آپ پا لیتی ہے تو غور و خوض کرتی ہے تو ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ عالم پاک، بقائے دوام اور عدم تغیر کا عالم ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جو اشیاء یہ دیکھتی ہے وہ اسی ہی کی طرح ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ یہ ہمیشہ رہتی ہے۔ جب وہ محض اپنے آپ میں ہوتی ہے اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تو پھر یہ غلط طریقوں سے ہٹ جاتی ہے اور غیر متغیر اشیاء کی محبت میں خود بھی غیر متغیر رہتی ہے۔ روح کی اسی حالت کو عقل و دانش کہا جاتا ہے۔''

سچے فلسفی کی روح جس نے زندگی میں مادی اور جسمانی لذتوں کی غلامی سے نجات پا لی ہے وہ موت کے بعد ایک غیر مرئی دنیا میں چلی جائے گی جہاں وہ دیوتاؤں کی مجلس میں سچی خوشی کے ساتھ رہے گی۔ لیکن ناپاک روح جو جسمانی لذتوں میں گرفتار رہی ہے وہ بھوت بن جائے گی اور قبر پر منڈلاتی پھرے گی۔ پھر وہ اپنی ہی خور کھنے والے جانور جیسے کہ گدھا، بھیڑیا گدھ کے جسم میں منتقل ہو جائے گی۔ وہ شخص جس نے نیک زندگی گزاری ہے لیکن وہ فلسفی نہیں تھا وہ شہد کی مکھی، بھیڑیا، چیونٹی یا کوئی ایسا جانور

Marfat.com

بن جائے گا جو غول میں رہنے والا یا معاشرتی نوعیت کا ہے۔

صرف سچا فلسفی ہی مرنے کے بعد جنت میں داخل ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کو دیوتاؤں کی محفل کی صحبت میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی جس نے فلسفہ کا مطالعہ نہ کیا ہو اور جو اس دنیا سے اپنی روانگی کے وقت مکمل طور پر خالص نہ ہو۔ دیوتاؤں کی محفل میں تو صرف وہی شریک ہو سکتا ہے جو علم کا عاشق ہو"…. یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کے پرستار تمام جسمانی شہوتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا یہ اجتناب غربت یا ذلت کے خوف کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ "اس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ روح کو تو محض جسم کے ساتھ بس باندھ دیا گیا ہے۔ جب تک کہ فلسفہ روح کو جسم سے بے نیاز نہ کر دے اس وقت تک وہ وجود حقیقی کو اس قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے سے نہیں دیکھ سکتی ہے۔ جسم پر احتیاج کی حالت میں روح ہر قسم کے کیچڑ میں لت پت رہتی ہے۔ دراصل اس بری حالت میں مبتلا ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ جسمانی لذتوں کی ہوس کا شکار ہوتی ہے" فلسفی اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ "ہر لذت والم ایک طرح کی میخ جیسا ہوتا ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ٹھونک دیتی اور ملا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جسم ہی کی طرح نہیں ہو جاتی اور یقین کرنے لگ جاتی ہے کہ جیسے جسم حقیقی قرار دے بس وہی حقیقی ہے۔"

اس مقام پر سیمیاس یہ فیثا غورث رائے پیش کرتا ہے کہ روح ایک ہم آہنگی ہے اور پوچھتا ہے کہ اگر بربط ٹوٹ جائے تو پھر بھی ہم آہنگی باقی رہتی ہے؟ سقراط جواب دیتا ہے کہ روح ہم آہنگی نہیں ہے کیونکہ ہم آہنگی (Harmony) ایک مرکب ہے لیکن روح بسیط ہے۔ وہ مزید یہ کہتا ہے کہ یہ نظریہ کہ روح ہم آہنگی ہے اس سے مطابقت نہیں رکھتا کہ روح پہلے ہی سے موجود تھی جسے باز یافت کے نظریہ سے ثابت کر دیا گیا تھا اور اس لئے بھی کہ ہم آہنگی کا بربط سے پہلے اپنا وجود نہیں ہوتا ہے۔

سقراط اب مزید اپنے فلسفیانہ ارتقاء کی تفصیل بیان کرتا ہے جو بہت دلچسپ ہے لیکن بنیادی استدلال سے اس کا تعلق نہیں رہتا وہ نظریہ اعیان کی تشریح کرنے لگتا ہے جو اس نتیجے تک پہنچتی ہے کہ اعیان کا وجود ہے۔ اور یہ کہ دوسری اشیاء میں شرکت کرتی ہیں اور ان ہی سے اپنا نام حاصل کرتی ہیں۔ آخر میں وہ مرنے کے بعد روح کی قسمت بیان کرتا ہے یعنی یہ کہ نیک روح جنت میں داخل ہوتی ہے اور

Marfat.com

بری روح دوزخ میں ان دنوں کے مابین روح برزخ میں چلی جاتی ہے۔

اس کی زندگی کے آخری لمحات اور الوداعی الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے آخری الفاظ یہ ہیں "گرینو! میرے ذمہ ایسکلی پیوس کا ایک مرغ ادھار ہے۔ کیا تم میرا قرض ادا کرنا یاد رکھو گئے؟"

جب وہ بیماری سے صحت یاب ہوئے تو انہوں نے ایسکلی پیوس کو مرغ ادا کر دیا اور سقراط نے متغیر حیات کی حرارت سے شفا پائی۔

فیڈرو بات یوں ختم کرتا ہے "اس کے زمانے کے لوگوں میں وہ عاقل ترین، عادل ترین اور بہترین شخص تھا۔"

افلاطون کا سقراط کئی زمانوں تک آنے والے فلسفیوں کے لیے ایک مثال تھا۔ ہم اس کے متعلق اخلاقی لحاظ سے کیا خیال کرتے ہیں؟ (میری مراد اس سقراط سے جسے افلاطون نے بحثیت انسان پیش کیا ہے) اس کی خوبیاں بہت واضح ہیں وہ دنیاوی کامیابی سے بے نیاز ہے۔ وہ خوف سے اس قدر بلند ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحات تک پرسکون، شائستہ اور خوش طبع رہا ہے اسے ہمیشہ باقی ہر بات کی نسبت اس بات کا زیادہ خیال رہا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھے وہ سچائی ہو۔ تاہم اس میں کچھ سنگین خامیاں ہیں۔ وہ استدلال میں کم دیانت دار و مغالطہ آمیز ہے اور اپنی ذاتی سوچ میں وہ عقل کا استعمال اس طرح کرتا ہے کہ ثابت کرنے کے لیے ایسے نتیجے پر پہنچے جو اسے پسندیدہ لگے نہ کہ علم کی تلاش غیر جانب دار ہو کر کرے۔ اس میں کچھ چکنا چپڑا پن پایا جاتا ہے جو ایک برے قسم کے پادری کی یاد دلاتا ہے۔ موت کے سامنے اس کی جرات زیادہ قابل یادگار ہوتی اگر اس کا یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ دیوتاؤں کی محل میں ابدی روحانی تسکین سے لطف اندوز ہونے کے لیے جا رہا ہے۔ اپنے بعض متقدمین کے برعکس اس کی فکر سائنسی نوعیت کی نہیں ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے پر مصر رہا کہ کائنات اس کے اخلاقی معیارات کے عین مطابق ہے۔ یہ سچائی سے دغابازی کرنے پر مصر رہا کہ کائنات اس کے اخلاقی معیارات کے عین مطابق ہے۔ یہ سچائی سے دغابازی ہے اور بدترین فلسفیانہ گناہ ہے۔ بحثیت انسان ہم یقین کر سکتے ہیں کہ وہ ولیوں کی مجلس میں شامل ہو جائے لیکن بحثیت فلسفی اسے ضروریات ہے کہ وہ سائنسی برزخ میں طویل قیام کرے۔

ا۔ برٹرینڈ رسل "فلسفہ مغرب کی تاریخ" لندن

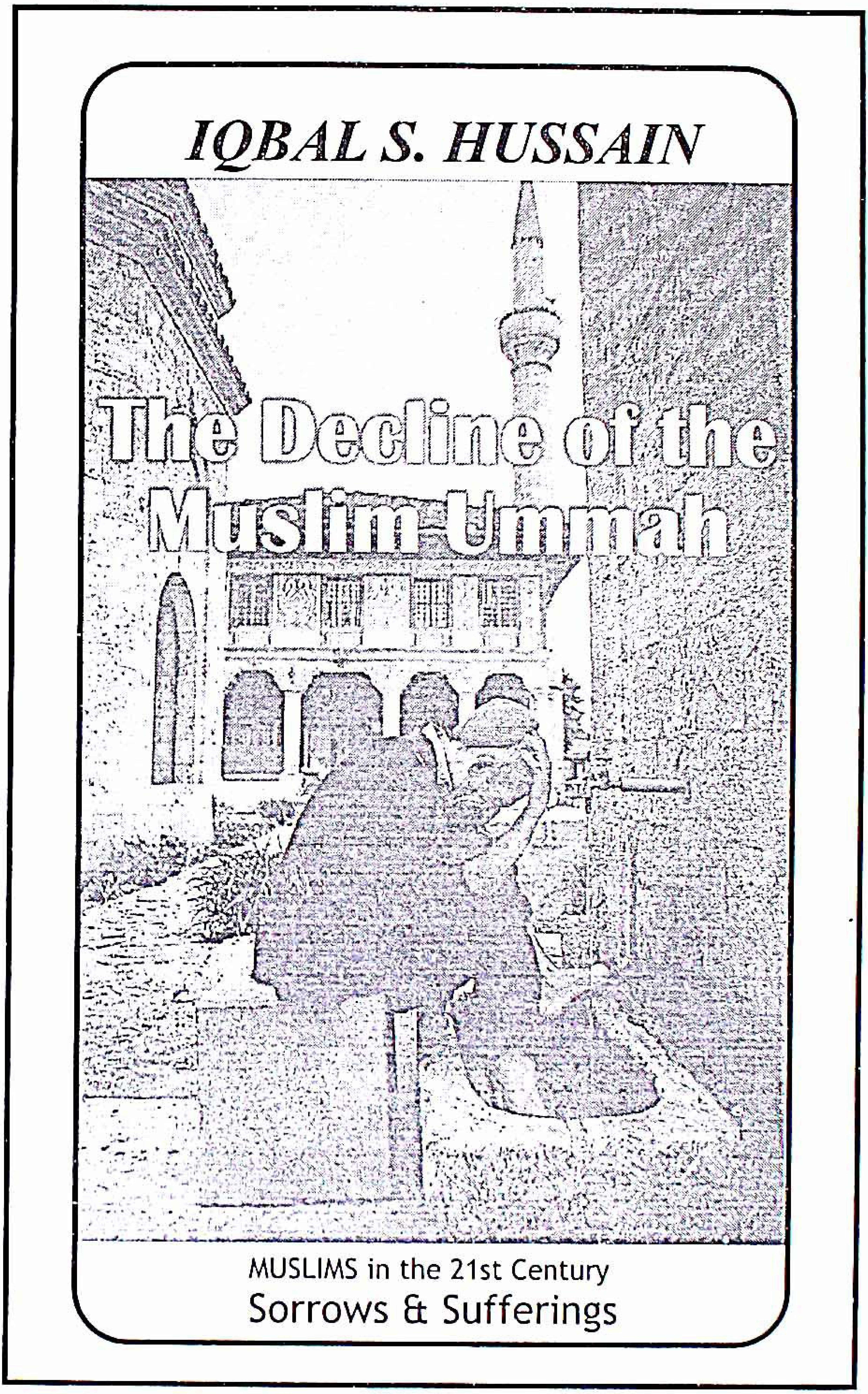
IQBAL S. HUSSAIN
The Decline of the Muslim Ummah
MUSLIMS in the 21st Century
Sorrows & Sufferings

Marfat.com

Marfat.com

قرآن اور مسلمان

﴿باب ۲۳﴾

مسلمانوں کا تنزل وانحطاط اور عالمگیریت کی تلاش

تیرے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلمان سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

انحطاط وتنزل موجودہ دور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہ مسلم تاریخ کا یہ کوئی نیا پہلو نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ کئی صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اور قرآن مجید کی حکمت آموز اور ایمان افروز ہدایات کے باوجود مسلمان عالمی سطح پر وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جو ان کا مقصود تھا۔ مفکرین اور دانشمند حضرات انہیں ایک اعلیٰ مقام کی جانب مائل کرتے رہے لیکن وہ خواب غفلت اور خود فریبی سے نکل نہ پائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کا مقام اقوام عالم میں نہایت پست ہے۔ اور شومی قسمت تو یہ کہ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں کہ وہ علم وعمل کی دنیا میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ اپنی ہر کمزوری کو دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں اور استعداد کار کو بہتر بنانے کی کوئی انقلابی حکمت عملی اختیار نہیں کرتے۔ اس لیے پسماندگی اور انحطاط کا سلسلہ جو کئی سو برسوں سے چلا آ رہا ہے مسلسل انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔

مسلم دنیا کے موجودہ اور سابقہ حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو کئی عوامل ایسے نظر آتے ہیں جو براہ راست علم وشعور کی راہیں مسدود کرنے کے لیے پیدا کر دیئے گئے ہیں پاکستان میں خاص طور پر قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں تنگ نظر ملا ور قبائلی سردار تعلیم کی راہ میں حائل ہیں۔ خواتین کی تعلیم خاص طور پر ان کے لیے زہر قاتل ہے وہ نہ ہی اپنی لڑکیوں کو اسکول جانے دیتے ہیں اور نہ ہی ایسی درسگاہیں قائم

Marfat.com

ہونے دیتے ہیں جہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کم علمی اور جہالت ان لوگوں کا مقدر بن گئی ہے۔ مزید برآں حکومت بھی اس طرف خاص توجہ نہیں دیتی۔ تعلیم کے لیے بجٹ میں سب سے کم مراعات دی جاتی ہیں۔ بہر حال حالات نہایت غیر تسلی بخش ہیں۔ آفق پر تاریکی اور اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

ایسے حالات میں قومی یا عالمی سطح پر کوئی قابل احترام مقام حاصل کرنا انتہائی سنگین مرحلہ ہے اور عالمگیر حیثیت جس کے لیے قرآن راغب کرتا ہے ایک دھندلا تصور بن کے رہ گیا ہے۔

یہاں یہ حقیقت مسلمانوں پر عیاں ہونی چاہیے کہ ایک قابل احترام اور عالمگیر حیثیت حاصل کرنے کے لیے علوم کا حصول نہایت ضروری ہے۔ جس کی قرآن مجید میں بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلمان اس حقیقت کی آگہی حاصل نہیں کر پائے اور خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔

تاریخ کے اوراق کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو دنیا میں کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی جو بغیر تعلیم کے ترقی کی منازل طے کر سکی ہو۔ ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے قرآن نے سب سے پہلے ''اقرا'' کا درس دیا جسکا مطلب ہے کہ پڑھو' لیکن مسلمان پڑھائی لکھائی کے اعتبار سے دنیا کی پسماندہ قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔

چونکہ مسلمانوں نے علم کے حصول میں دلچسپی لینا چھوڑ دی اس لیے جہالت اور روشنی میں جو فاصلے تھے وہ بھی مٹ گئے۔ مسلمان روشنی سے اندھیروں میں بھٹک گئے۔ تحقیق و دریافت کا عمل جو کسی بھی ترقی یافتہ معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے وہ بری طرح پس پشت ڈال دیا گیا۔

علم سے ناآشنائی کے اس دور میں تحقیق و دریافت کا باب کیونکر روشن ہوگا اور ارتقائی مراحل کیونکر طے ہوں گے۔ سب سے اہم سوال ہے۔

مسلمانوں کی علوم میں دلچسپی کم ہوگئی اس کا بڑا سبب قرآن کی تعلیمات سے بے بہرہ ہونا اور جدید علوم سے ناآشنائی ہے۔ نیز تفرقہ بازی، انتشار اور تنگ نظری نے مسلمانوں کو ایک عالمگیر قوت نہ بننے

Marfat.com

دیا۔ ملاسیت نے مسلمانوں کی ذہنی صلاحیتوں کو حجروں میں مقید کر دیا اور ذہب صرف حصول جنت کا ذریعہ بن گیا زندگی میں عملی نتائج حاصل کرنے کی بجائے صرف ثواب حاصل کرنا مقصد اولیٰ سمجھا جانے لگا۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کہ قرآن اور مسلمان میں جو ناطہ قائم ہونا چاہیے تھا وہ اب تک قائم نہیں ہو سکا۔ سمجھ بوجھ اور غور وفکر کا وہ سلسلہ قائم نہ ہو سکا جس کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔

قرآنی تعلیمات کے اثرات اپنی ذہنی، اجتماعی اور معاشرتی زندگی پر مرتب نہ ہو سکے۔ ہم قرآن کو صرف نماز، روزہ اور عبادات تک ہی محدود کر دیتے ہیں۔ قرآن کی وہ تعلیمات جو ہمیں کہکشاؤں اور سیاروں کی کائنات میں جھانکنے کی ترغیب دیتی ہیں ہماری نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں اور انہیں دیگر اقوام کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قرآن کی ان تعلیمات کو ہم مغرب کی روشن خیالی سے متصور کرتے ہیں اور اس بات پر کبھی غور نہیں کرتے کہ دیگر اقوام انہی تعلیمات پر عمل کر کے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہوتی ہیں۔ ہم یہاں بھی خود فریبی کا شکار بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ انہیں اس دنیا میں فلاح و بہبود حاصل ہو گیا ہے اس لیے آخرت میں یا جنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کی رو سے علوم خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی بہر کیف علوم ہیں اور ان کا حصول حسن حیات اور ارتقاء آدیت سے منسلک ہے۔

ان علوم کے حصول سے ہی انسان اپنی استعداد کار اور صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے۔

قرآن یہ برابر کہتا ہے کہ علم حاصل کرنے والے اور جاہل لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔

لیکن تعلیم اور جہالت مسلمانوں میں گڈ مڈ ہوتے نظر آتے ہیں اور صحیح عالمانہ نظریہ فکر سے روگردانی کی جاتی ہے یہ ایک طرب و کرب کی کیفیت ہے جو ہماری پسماندگی کا باعث ہے۔ یہ مسلمانوں کے عروج سے شروع ہو کر ایک ہزار سال سے زائد عرصے پر محیط انحطاط پر ختم ہوتی ہے۔ اور تاریخی اور موجودہ دور کے تقاضوں کا ایک سخت ٹکراؤ ہے جس سے زندگی نبرد آزما ہے۔ لیکن زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ کوئی پتہ نہیں ہلتا اور کوئی جنبش بروئے کار نہیں آتی۔

Marfat.com

بہر حال ہم اس آرزوئے حسن وشعور میں زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کتابیں لکھتے جا رہے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ ہماری استطاعت اور استعداد کو قائم رکھے گا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔ مسلمانوں کی تقدیر خواہ ان کے اثرات کتنے ہی مہین ہوں۔

مغرب کی حیرت انگیز ترقی سائنس، معاشرتی علوم اور تحقیق وتحسین کے باعث ہی ممکن ہوئی وگرنہ ایک دور میں وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ پسماندہ تھے۔

ترقی اور کامرانی کے اثرات زندگی کی ہر سطح پر نمایاں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ قلبی، روحانی اور مذہبی رویے بھی تبلسی فروغ پاتے ہیں جب انسان کا علم بڑھتا ہے اور اس کا ذہنی افق بلند ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آدمی بیرونی اثرات سے تب ہی متاثر ہوتا ہے جبکہ اس کا اپنا علم محدود ہوتا ہے اور وہ حجروں سے باہر نکل کر نظر وفکر کے اشاروں کو نہیں سمجھ پاتا اور یہی وجہ ہے کہ ہماری تہذیب وثقافت، ادب، جنسی نفسیات، وجودیت اور دیگر انداز زندگی جیسا کہ فیشن اور رہنے سہنے ڈھنگ مغربی فکری اور ثقافتی یلغار میں آتے رہے اور مسلمان اپنا قومی اور مذہبی تشخص کھوتے رہے۔

یہاں تک کہ ہمارا انداز بیان اور لب بھی بدل گیا۔ ہم نے اپنی زبان میں انگریزی زبان کے الفاظ شامل کر لیے اور غیر ضروری طور پر ان کا استعمال کرتے رہے۔ حالانکہ انگریزی زبان سیکھنے، لکھنے، پڑھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کے ذریعہ دوسروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا درست نہیں ہے اپنی قومی زبان پر فخر کرنا تو ہر باشعور قوم کا طرہ امتیاز ہوتا ہے لیکن پاکستان میں یہ رجحان انتہائی افسوسناک ہے کہ انگریزی زبان کو بغیر کسی ضرورت کے عوام کو متاثر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حسن بیان تو وہ ہے کہ اپنی زبان کے ذریعہ مسحوریت کے تاثرات پیدا کئے جائیں۔ جیسا کہ مرزا غالب اور علامہ اقبال کے کلام میں نظر آتا ہے۔

جرمنی میں این میری شمل جو ایک بلند پایہ دانشور تھیں کہا کرتی تھیں کہ جب میں پاکستانیوں کو اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے سنتی ہوں تو مجھے قے (الٹی) آتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غیر ضروری طور پر دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرنا بذات خود ذہنی اور

Marfat.com

قومی پسماندگی کی علامت ہے۔

مزید برآں مختلف علوم کا حصول اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ نہ صرف ہم فلسفہ حیات کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہم ان ارتقائی مراحل کو طے کرنے کی بھی صلاحیت پیدا کرتے ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مزید حسین بناتی ہیں۔

لیکن کم علمی نہ صرف اندرونی عوام کے ذریعہ قومی زندگی کو پسماندہ کرتی ہے بلکہ بیرونی اثرات بھی منفی نتائج پیڈ کرتے ہیں جو بالآخر نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے عوامل کا تفصیلی جائزہ ہم نے اپنی کتابوں میں لیا جائے۔

لیکن یہاں ہم ایک صاحب علم کے تاثرات دے رہے ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

علوم اسلامی پر بیرونی اثرات مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں نے خود بھی ان اثرات سے غافل ہو کر اور تعصب اور تنگ نظری کے باعث اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر لیں۔ اس طرح مغربی نظریات، علوم اسلامی پر اثر انداز ہوئے اور علوم کے وہ دھارے جو قرآن اور احادیث کے ذریعہ شروع ہوئے تھے ''نادان دوستی'' کے سبب اپنا فروغ کھو بیٹھے۔ ذیل کے اقتباسات اس صورت حال کو مزید واضح کرتے ہیں۔

علوم اسلامی پر بیرونی اثرات

سیاسیات کی طرح افکار و نظریات اسلامی پر بھی ایران و روم و یونان کے خیالات نے بہت اثر ڈالا۔

قرآن و حدیث

قرآن مجید کی آیات کو جمع کرنے کا عام رجحان آنحضرت ﷺ کے عہد میں ہی تھا خلیفہ اول کے عہد میں آیات قرآن کو یکجا منظم کیا گیا لیکن تدوین و ترتیب کی تکمیل حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوئی اس وقت سے آج تک وہی ترتیب آیات و سور قائم ہے۔ اس پر مسلم اور غیر مسلم مورخوں کا قطعی اتفاق ہے کہ دنیا میں صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس میں ایک شوشے اور نقطے

Marfat.com

کی تبدیلی بھی نہیں ہوسکی۔ لیکن اس کے مطالب و معانی میں مفسرین نے تاویلات وتشریحات کے ذریعے اس قدر پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ اسلام کی سادہ اور فطری تعلیمات کو فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی کاوشوں میں الجھادیا غیر مسلم قومیں اسلام میں جب داخل ہوئیں تو وہ اپنے قدیم خیالات کو ساتھ لے کر آئیں اور انہوں نے جب قرآن کریم کے مطالبات بیان کرنا شروع کیے تو اپنے قدیم روایات، یونانی علم الاصنام اور فلسفہ کے مصفحات کے مطابق تفسیریں لکھنا شروع کر دیں۔

ایران ومصر کی فتح کے بعد بالخصوص بنوعباس کے عہد سے عرب کے مسلمانوں اوران مفتوحہ اقوام کے افراد میں رابطہ شروع ہوا، ایرانی رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے اور بہت جلد وہ عربوں پر غالب آگئے اور حکومت کے ہر شعبے پر چھا گئے۔ بنوامیہ کے عہد تک اسلامی تعلیمات پر بیرونی اثرات کم رہے لیکن اس عہد میں ایک بڑی خرابی یہ رہی کہ عربی اور عجمی قومیت کی تفریق اور عجمیت پر عربیت کو فوقیت دینے کی بڑی کوشش کی گئی حالانکہ اسلام صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے آیا تھا یہ ناممکن تھا کہ عرب کی قوم ہمیشہ دوسرے ممالک پر غالب رہتی صرف اس لیے کہ اسلام کا ظہور وہیں ہوا تھا۔ بالخصوص جب کہ ان کی سیرت اوران کی جماعت خود غیر اسلامی سیاست اختیار کر چکی تھی۔ اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سیرت اوران کی جماعت خود غیر اسلامی سیاست اختیار کر چکی تھی۔ اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں نے عرب کی ہر چیز کو ذلیل کرنا اور ایرانی تمدن کو بڑھانے کی ہر امکانی جدوجہد شروع کر دی۔ حتیٰ کہ اسلام عقائد کو بھی عجمی اور یونانی رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہودیوں کی بڑی جماعت اسلام میں منافقانہ حیثیت سے صرف اسی لیے داخل ہوئی کہ وہ اسلام کی صیہونیت کی تعلیمات سے متاثر کرے۔ انہوں نے سینکڑوں ہزاروں غلط احادیث وضع کر کے رسول کے نام سے منسوب کر دیں اور ان کو افسانہ اور واضعین احادیث کے ذریعے کافی مشہور کر دیا۔ جس قدر خرافات اور اسرائیلیات ان کے اندر جاری تھیں انہوں نے تبدیلی الفاظ کے ساتھ سب کو اسلامی سوسائٹی میں رائج کر دیا۔ یوم الحساب، حشر اجساد، سحر، معراج، معجزات حضرت یوسف اور حضرت سلیمان سے متعلق جس قدر اسرائیلیات یہودی کاہنوں اور عیسائی رہبانوں میں جاری تھیں وہ سب اسلام میں داخل ہوگئیں اس عہد میں تدوین احادیث

Marfat.com

۱۔اقبال سید حسین، دیکھیے کتابوں کی فہرست

۲۔علامہ عبدالوحید خان، ''مسلمانوں کے عروج''

۳۔''زوال کی داستان''

کا جوش اس قدر غالب تھا کہ ایک ایک حدیث رسول کو سننے اور تصدیق کرنے کی غرض سے ہزاروں میل کا سفر گوارا کیا جاتا تھا ان غلط روایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قرآن کریم کی تفسیر کا رواج شروع ہوا اور آیات کے شان نزول وغیرہ کی روایات تفسیروں میں شامل کی گئیں اور ان کے مطالب کی مزید تشریحات ان روایات کی روشنی میں کی گئیں تو قرآن کریم کے مطالب کی حقیقت ان روایات میں مستور و محجوب ہو کر رہ گئی۔ پھر جب فلسفے کا دور شروع ہوا اور یونانی، ہندی اور ایرانی کتب کے تراجم عربی زبان میں کیے گئے تو آیات قرآنی کے مطالب بھی یونانی نظریات کے مطابق بیان کئے جانے لگے۔ افلاطون، ارسطو اور سقراط کے فلسفیانہ نظریات کو مسمہ حقیقت وصداقت سمجھ کر وہی الٰہی کی تفسیریں انہی کے مطابق کی جانے لگیں تجسم وگردش آسمان مسئلہ روح، فنا و بقا کی بحثیں، مسائل جبر و قدر اور بہت سے اس قسم کے مسائل جن کو قرآن کریم میں آیات مشابہات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جن کی تفصیلات قصداً نظر انداز کر دی گئی تھیں تا کہ انسان لفظی بحثوں میں الجھ کر عمل کی دنیا سے الگ نہ ہو جائے۔ جب ان فلسفی مفسرین کے سامنے آئے تو انہوں نے یونانی نظریات کی روشنی میں ان سب کے مطالب بیان کرنا شروع کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم کی آیات کے متعلق بے شمار بحثوں کے دروازے کھل گئے۔ ان سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ قرآن کریم کی آیات کو مسلمانوں نے اپنے ماری اغراض، بیماریوں، آسیب اور سحر کو دور کرنے کے لیے منتروں اور تعویذوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ قرآن کریم کے معانی سے زیادہ اس کے عربی الفاظ پر زور دیا جانے لگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرات الفاظ قرآنی کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جانے لگا اور مطالب سے یکسر غفلت برتی جانے لگی۔

موضوع احادیث اور عجمی نظریات پر تفسیروں کی بنیاد رکھنے والے علماء کی ان کمزوریوں کے باوجود اس حقیقت کا چھپانا جرم ہے کہ مفسرین اور محدثین کی جماعت نے مسلمانوں کی توجہ کو ہمیشہ علوم اسلامی کی

Marfat.com

طرف مبذول رکھا۔ علوم قرآن واحادیث کو اپنی تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کے ذریعے انہوں نے ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کی اور ان کی اشاعت کیلئے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ وقف رکھا ہر چند ان کی نادان دوستی سے اسلام کو نقصان بھی پہنچا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے مقاصد بلند اور ان کا نصب العین خدمت اسلام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی جزائیات پرستی، سطحی موشگافیوں اور بحثوں کی وجہ سے عام مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کے دروازے کھل گئے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انہی علماء کی کوششوں اور علوم اسلامی کی اشاعت میں ان کی مسلسل جدہ جہد نے افکار انسانی کو آزاد کرانے میں بڑی مدد کی آج یورپ میں جس قدر علمی روشنی موجود ہے وہ نظر نہ آتی اگر اسپین اور مصر اور دوسرے ممالک کے علماء وحکماء اسلام علوم اسلامی اشاعت کو اپنا نصب العین نہ بناتے۔ علماء اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ فقہ کی تدوین ہے۔ جس طرح ان علماء نے اسلامی قوانین کو مرتب کیا اور تمام اطراف مملکت میں فقہی علوم اسلامی (Jurispruudence) پھیلایا اور عدالتوں کا نظام قائم کیا ان کی مثال اسلام سے قبل کہیں نہیں۔ بدقسمتی سے نظام ملوکیت نے اسلام کے بڑھتے ہوئے قانونی سسٹم کو بہت نقصان پہنچایا اور اس کی آزادی اور وسعت پر ایک شدید ضرب لگائی لیکن پھر بھی جس قدر وسعت، تنظیم وانضباط اور آزادی اسلامی جوڈیشل سسٹم میں موجود ہے وہ کسی اور موجودہ یا قدیم حکومت میں نہیں ملتی۔ فقہ اسلامی کی بنیاد قرآن، سنت رسول اور اجتہاد پر ہے۔ جن احکام کو قرآن کریم میں بیان کر دیا گیا ہے یا جن مسلمہ احادیث سے کوئی حکم مستنبط ہوتا ہے وہ اسلامی قانون کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ایسی احادیث کی تعداد جو سب کے نزدیک مسلم ہوں بہت کم ہیں۔ ابن خلدون اور بعض دوسرے مورخین کے نزدیک امام ابو حنیفہ نے صرف سترہ احادیث کو جو آپ تک پہنچی صحیح تسلیم کیا ہے جن سے احکام کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک، امام حنبل اور امام شافعی کے برخلاف امام ابوضیلہ کے مستنبط کیے ہوئے قوانین کی بنیاد زیادہ تر رائے اور اجتہاد پر ہے۔ اس لئے علماء عراق کو اہل الرائے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ فقہ کے جزوی مسائل میں شروع ہی سے علماء اسلام میں رائے کا کافی اختلاف رہا ہے لیکن چوتھی صدی ہجری تک ان اختلافات کی بنا پر کبھی کوئی نیا مذہب فقہ قائم نہیں ہوا عوام آزادی تھے کہ مسائل کی تحقیق میں جس عالم

Marfat.com

کے مسلک کو چاہتے اختیار کر لیتے۔ کوئی فرقہ بندی یا اس کی بنا پر کبھی تعصب کا نام ونشان تک نہ تھا لیکن جب چوتھی صدی ہجری میں مسلم سیاست میں زوال شروع ہوا اور خلفاء نے جہاد اور علماء نے اجتہاد کرنا چھوڑ دیا اور علمی تحقیق کے دروازے بند ہو گئے تو فقہ میں بھی تقلید کا دور شروع ہو گا۔ اب عالم خواہ کتنا ہی قانونی ماہر ہوتا لیکن ائمہ رابعہ کی تقلید سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ جو تحقیق پہلی صدی ہجری میں ہو چکی تھی اس سے آگے جانا جرم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ چاروں رائمہ کے مقلدین نے چار مذاہب فقہ قائم کئے اور بہت جلد باہمی تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز تک نہ پڑھتے جس فرقے کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو جاتی وہ دوسرے مذہب کے علماء کی آواز بند کرنے اور ان کے اثرات کو کم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا۔ مناظروں کی مجالس قائم ہونے لگیں اور معمولی معمولی مسائل سے اختلاف کی بنا پر اکھاڑے بننے لگے حتیٰ کہ باہمی رزم آرائیاں اور خونریز تک نوبت آنے لگی۔

فلسفہ

بالکل یہی حال فلسفے کے متعلق ہوا ل ابتداء اسلام میں فلسفہ وحکمت یونانی کو کوئی رواج نہ تھا۔ علماء کی توجہ زیادہ تر قرآن وحدیث اور فقہ کی اشاعت میں مرکوز رہی تھی۔ پہلی صدی ہجری میں صرف ایک مسئلہ جبر وقدر کے متعلق فلسفیانہ بحث ومناظرے کی مثال ملتی ہے، ذات وصفات الٰہی اور مومن فاسق و منافق کی حیثیتوں پر بھی بحثوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن اس قسم کے جزوی مسائل کی تحقیق وتدقیق دوسری صدی ہجری سے شروع ہوئی۔ مامون الرشید کا عہد فلسفے کی ترقی کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس کے عہد میں خلق وقدم قرآن کے مسئلہ پر علماء معتزلہ اور دوسرے علماء میں بحث ومناظرے کی گرم بازاری نے اس حد تک زور پکڑا کہ ہزاروں مسلمان عالم اور فقیہ مامون حکم سے صرف اس لئے قتل کئے گئے کہ وہ قرآن کریم کو قدیم مانتے تھے جو ان کے نزدیک شرک اور ارتداد کے مترادف تھا اور مرتد کی سزا سوائے قتل کے اس عہد میں اور کچھ نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور فلسفہ کی بناء پر باہمی رزم آرائیوں میں مصروف رہتے۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں فلسفیانہ مجالس ہر وزیر امیر اور

Marfat.com

سلطان کے درباروں میں منعقد ہوتی تھیں۔حنبلیوں، اشعریوں، معتزلیوں اور کبھی شیعہ سنیوں میں اس قسم کے مسائل پر بحث وتکرار کے بازار گرم رہتے کہ اللہ تعالیٰ کی پشت کس طرف ہے، روح اور مادہ میں کیا فرق ہے انسان میں الٰہی صفات کس طرح آسکتی ہیں۔ آسمان و زمین کی کیا حقیقت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لیسکی اہل روم کے انحطاط کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

''معلوم ہوتا تھا ترقی علم وکمال کے دن ختم ہو چکے ہیں اور ایک صرف اسلاف پرستی و استخوان فروشی کا مشغلہ باقی رہ گیا ہے۔علماء کا کام صرف یہ تھا کہ قدیم کتابوب کے شرح وحواشی لکھا کریں قوت اجتہاد معدوم ہوگئی تھی کوئی نیا مسئلہ پیدا کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، قدامت پرستی وجمود ہر شے پر طاری تھا گفتگو میں بڑے بڑے مغلق ومتروک الفاظ ٹھونس دینا علم وفضل کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔نصاب تعلیم میں سارا زور صرف ونحو اور منطق پر تھا۔صرف ونحو کے مسائل پر بڑی معرکتہ الارا بحثیں ہوتیں اور منطقی معموں کا حل کرنا مقصود زندگی سمجھا جاتا۔شام کے وقت ٹارس کی میز پر جب اس کے تلامزہ تفریح وتفنن کی غرض سے جمع ہوتے تو ہمیشہ اس طرح کے مباحث چھڑ جاتے۔

''انسان کو مردہ ٹھیک کس وقت کہنا چاہیے، آیا اس کی زندگی کے آخری لمحے پر یا اس کی موت کی اولین ساعت پر؟

اس کے کھڑے ہو جانے کی پہلی گھڑی پر؟(۱۴)

اخلاق کی جانب بے شبہ انہیں دل سے توجہ تھی لیکن یہاں بھی کٹھ حجتی اور قدامت پرستی دامن نہیں چھوڑتی تھی کوئی مسئلہ ہو جب تک قدماء کے یہاں اس کی علت وحرمت، جواز وعدم جواز پر نص صریح نہ مل جائے گی، یہ ایک قدم آگے نہیں بڑھائیں گے؟

اقوام کے ارتقاء وانحطاط کے اصول کس طرح باہمی مماثلت اور مشابہت رکھتے ہیں اور اس کا پورا ثبوت لیسکی کے مندرجہ بالا بیان میں موجود ہے جو بالکل اسی طرح سوسائٹی کے انحطاط کے وقت کا مکمل مرقع ہے جس طرح اہل روما کی علماء وفقہا کی جمود اور قدامت پرستی، اختلاف رائے رکھنے والے علماء پر

ان کے تشدد اور استبداد کی مثالیں اور اختلاف عقائد کی بناء پر ارتداد والحاد کے جرم میں قتل وخون، سولی اور گردن کاٹنے کے جس قسم کے واقعات خلافت کے آخری دور میں ملتے ہیں تقریباً ہر قوم کی مذہبی اور اخلاقی انحطاط کی تاریخ میں اسی قسم کے حالات ملتے ہیں۔ ہندوستان، مصر اور روم کے مذہبی پیشواؤں کے مظالم سے تاریخ کے صفحات پر ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ ان قدیم اقوام کے علماء جو کچھ مظالم کرتے تھے وہ دوسرے مذاہب والوں پر مثلاً رومی پیشوا، عیسائیوں پر اور ہندوستانی پنڈت اچھوتوں وغیرہ پر لیکن مسلم علماء کا استبداد اپنے ہم مذہب افراد تک محدود تھا۔ اس عہد کی پوری تاریخ میں غیر مسلم نہایت آزادی کے ساتھ اپنے عقائد کی اشاعت کرتے تھے لیکن خود مسلمان جزوی عقائد کی بناء پر سخت عذاب میں مبتلا کیے جاتے تھے لیکن ان عقوبتوں کی شدت روی علماء کی سختیوں کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھیں۔ رومیوں کی سختیوں کا تو یہ عالم تھا کہ:

''مسیحی لوہے کی سرخ انگارہ کرسی پر بٹھائے جاتے تھے اور ان کے بھنے ہوئے گوشت سے دھواں اٹھتا تھا۔ ان کا گوشت لوہے کے کانٹوں کی مدد سے ان کی ہڈیوں سے کھرچا جاتا تھا۔ دھیمی دھیمی آگ میں وہ گھنٹوں اس طرح بھونے جاتے تھے کہ اس عذاب کے مقابلے میں اکبارگی ان کو قتل کر ڈالنا ان پر رحم کرنا تھا۔ ایک ایک عضو دوسرے سے کاٹ کر الگ کیا جاتا تھا اور اس میں جلتا ہوا سیسہ پلا دیا جاتا تھا ان زخموں پر نمک اور سرکہ ڈالا جاتا تھا۔ یہ عذاب سارے سارے دن رکھے جاتے تھے اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہو کہ ۲۲۰ آدمی اس حالت میں باہر نکالے گئے کہ ان میں سے ہر شخص کی ایک ایک آنکھ اپنے حلقہ سے باہر نکال لی گئی ہے اور ایک ایک پیر سے ایک ایک گوشت کا لوتھڑا سرخ انگارہ لوہے سے کاٹ لیا گیا ہے۔'' (۱۵)

تصوف

ملوکیت اور ملائیت کا باہمی تعاون اور تعلق اس دور کی خصوصیات ہیں شہنشاہیت کے غلط اور غیر اسلامی نظام ار سلاطین وخلفاء کے استبداد وآمریت کو علماء وفقہاء کی طرف سے بالعموم پوری مدد ملتی ہے۔ احکام سلطانی کا نفاذ علماء کی سند جواز کے ساتھ ہوتا اور فقہاء کے فتوؤں کی محافظ شہنشاہی تلوار تھی۔ مسلم عوام

Marfat.com

بلکہ اصحاب عزیمت وعلماء حق تک کی گردنیں اس دوہری غلامی کی زنجیروں سے اس طرح بندھ چکی تھیں کہ اس سے باہر نکلنے کا تخیل تک گناہ بن چکا تھا۔ جس حکومت میں علماء اور سلاطین یک متحدہ احکام سے سرتابی کا نام اللہ تعالیٰ سے بغاوت ہو وہاں سر اٹھانے اور شکوہ کرنے کی مجال کس کو ہو سکتی تھی؟ علماء حق کی نحیف اور کمزور آوازیں اس متحدہ طاقت کے سامنے دب کر رہ جاتی تھیں۔ اس استبداد کا زبردست نقصان یہ ہوا کہ ان حق پسند اور اللہ پرست افراد کی ایک زبردست جماعت جو اپنے اندر نہ ملوکیت سے مقابلے کی طاقت رکھتی تھی نہ اس نظام کی معاون بننا چاہتی تھی جو علماء سوء کے نفاق انگیز اور افتراق آفریں طرز عمل سے متنفر اور امت کی باہمی رزم، معرکہ آرائی اور خانہ جنگی سے سخت نالاں تھی مایوس ہو کر زاویہ نشین بن بیٹھی۔ مسلم سوسائٹی میں یونانی خانقاہیت اور ہندی رہبانیت کے اثرات دوسری تیسری صدی ہجری میں داخل ہو چکے تھے اور ترک لذائذ وعلائق دنیوی گناہوں کا عام کفارہ اور علاج سمجھا جانے لگا تھا۔ پیری مریدی اور تزکیہ اخلاق و پاکی نفس کے لئے بیعت کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ مردان حق کی گوشہ نشینی اور رہبانیت سے جو منجملہ اور اسباب کے ملوکیت کے ردعمل کے طور سے وجود میں آئی۔ نظام خانقاہیت کی بالکل ہی تکمیل کر دی اسلامی ممالک کے ہر حصے میں خانقاہیں قائم ہو گئیں زاویے اور تکیے بن گئے جن میں ہزاروں، لاکھوں مسلمان خانقاہ نشین بزرگوں سے دعائیں اور برکتیں حاصل کرنے، مائل سلوک وتصوف پر دسر لینے تزکیہ قلب اور اصلاح نفس کی غرض سے بیعت کرنے جوق در جوق آتے۔ بیعت کرتے وقت مرید اس بات اقرار کرتا کہ وہ خود کو پیر کے حوالے کرتا ہے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت اس کا عین ایمان ہے۔ اس طرح بیعت امیر کے ساتھ ساتھ پیروں کی بیعت کا سلسلہ باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ بیعت کا طریقہ ابتدائے اسلام میں موجود تھا لیکن اس وقت پیری مریدی کا رشتہ محض درست وتدریس تک محدود ہوتا تھا پیر کی مکمل اطاعت کا کوئی نظام اس وقت نہ تھا لیکن اب نہ صرف بیعت کا نظام باقاعدہ شروع ہوا بلکہ مذاہب فقہ کی طرح بزرگان دین کے سلسلے بھی مقرر ہو گئے اور تصوف، سہروردی، چشتیہ قادریہ جیسے خاندانوں اور سلسلوں میں تقسیم ہو گیا۔ اکثر مرید پیر کی اطاعت کو بادشاہ کی اطاعت پر مقدم جانتے تھے، خانقاہوں میں عقیدت مندوں کے ہجوم کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بادشاہوں کے

Marfat.com

درباروں کی سطوت بھی ان کے سامنے ماند پڑنے لگی تھی۔ ابتداء میں تصوف کا یہ نظام ملوکیت کے لئے ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ ایک سلطان یا خلیفہ یہ کب گوارا کرسکتا تھا کہ اس کی مملکت کے حدود میں کوئی دوسرا فریق عوام پر حکومت کرے۔ علماء سوء نے ان خطرات کو

اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا چونکہ شاہی درباروں سے بااعتنائی پرہیز اور استغناء ابتدائی عہد تصوف کے خصوصیات تھے اس لئے درباریوں نے سلاطین کو اور بھڑکایا کہ ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ خانقاہی حکومت کا ایسا متوازی نظام قائم ہورہا ہے جو بہت ملوکیت کے نظام کو درہم برہم کردے گا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے دو ہی طریقے تھے یا تو خانقاہوں پر قبضہ کرکے علماء سوء کی طرح صوفیوں کو بھی ملوکیت کے دام میں اسیر کیا جاتا یا ان کو بالکل ختم کردیا جاتا۔ جو خانقاہیں محض فریب نفس زراندوزی اور جاہ طلبی کے لئے قائم تھیں وہ دام ملوکیت میں بہت جلد آگئیں لیکن جو بزرگان دین نے فرمانروائے وقت کی اطاعت اور ان کی طاقت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا ملوکیت کی پوری مشین ان کے خلاف حرکت میں آجاتی۔ صوفیاء کرام کو گرفتار کرکے محکمہ احتساب عقائد کی طرف سے عدالت میں ان پر الحاد و زندقہ کے الزامات لگائے جاتے ان کی گردنیں ماری جاتیں۔ سولی چڑھائی جاتی ان کو جلاوطن کیا جاتا غرضیکہ ان کی طاقت ختم کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا۔ ان صوفیاء میں بہت سے ایسے بھی تھے جو اگرچہ زرطلب اور جاہ پسند نہ تھے لیکن عقائد کی گمراہی کی وجہ سے جنون آمیز اور فتنہ انگیز حرکات کرتے تھے اور عوام کی بڑی بڑی جماعتیں ان سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوتی تھیں، ان کا صحیح مقام جنون خانہ یا جیل ہوسکتی تھی لیکن کفر کے فتوؤں اور جلاد کی تلواروں سے ان کو بھی پناہ نہ مل سکی۔ ملوکیت کے خلاف جنگ بالعموم بزرگان دین کی حیات ہی تک محدود رہتی تھی ان کے بعد ان کے جانشینوں میں نہ وہ صلاحیتیں تھیں نہ وہ روحانی طاقت جس سے وہ سلاطین کا مقابلہ کرپاتے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے جانشینوں کے وظائف مقرر کردیئے جاتے، خانقاہوں کے اخراجات کیلئے بڑی بڑی جائدادیں وقف کردی جاتیں، بزرگوں کے بلند مقبرے تعمیر کرادیئے جاتے اور خانقاہ نشین مریدوں کے لئے لنگرخانے جاری کیے جاتے ان انعامات وعطیات کا لازمی نتیجہ ہے ہوتا کہ وہی خانقاہیں جن سے

Marfat.com

کبھی بغاوت کا خطرہ تھا اب شاہی اطاعت ووفاداری کے مرکز بن گئے جہاں سے سلاطین کی درازی عمر اوع بقاء سلطنت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں اہل تصوف دنیوی معاملات اور سیاسیات سے یکسر علیحدہ رہنے لگے اوع خسروی میں مداخلت اور حکومت کی استبداد اور تشدد پر تنقید کرنا معیوب سمجھا جانے لگا۔ حافظ شیرازی نے اس دور کی اس خصوصیت کو نہایت بلیغ الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے۔

امور سلطنت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

صوفیاء کی یہ گوشہ نشینی نظام ملوکیت کے قیام میں بے حد معاون ہوتی ہے کیونکہ اب صوفی اور علماء دونوں گروہ سلطنت کے دوست اور مددگار تھے اس لئے تنقید اور حتجاج کرنے والی کوئی منظم جماعت باقی نہ رہی تھی۔ خانقاہیں رفتہ رفتہ مجاوروں اور سجادہ نشینوں کی تفریح گاہیں بن گئیں۔ مزارات پر سالانہ عرس کے جشن اور میلے لگنے لگے جہاں عوام عقیدت کی نذر لے کر آتے اور سجادہ نشینوں کی آسائشوں اور عیش سامانیوں کے لئے دولت فراہم کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ان خانقاہ نشینوں کے متعلق بالکل صحیح فرمایا ہے۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقوہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

خانقاہوں میں ہندی جوگیوں اور یونانی اوع عیسائی راہبوں کے طرز پر غیر فطری حدود وقیود کے ساتھ زندگی گزارنے اور زہد خشک وعزلت نشینی اختیار کرنے اور نفسی خواہشات اور انسانی ضروریات کو ترک کرنے کا ردعمل فوراً شروع ہوا۔ گانا بجانا اور رقص وسرود عبادت کا جزو ہو گئے۔ عشق مجازی عشق حقیقی تک پہنچنے کا ذریعہ بن گیا۔ اور امرو پرستی کو خدا پرستی کا زینہ سمجھ لیا گیا، یا تو توحید پرستی کا یہ عالم تھا کہ ذات پر صفات کا بار بھی گراں معلوم ہوتا تھا اور لا الہ کے پہلے لفظ لا سے ''توحید شرک آمیز'' کا شبہ ہوتا تھا جیسا کہ نظیری نے کہا ہے۔

چند از موذن بشنوم توحید شرک آمیز را؟

Marfat.com

کو عشق تا یکسو نہم شرع خلاف انگیز را

یامزارات پر تعظیمی سجدے شروع ہو گئے اور پیروں کو صفات الوہیت سے متصف کیا جانے لگا۔

انحطاط اور اس کے اثرات

ان تمام اسباب نے مل کر پوری مسلم سوسائٹی کو مفلوج کر دیا خانہ جنگیاں اور باہمی رزم آرائیں عام ہو گئیں علم و حکمت اور اجتہاد و تحقیق کی جگہ جہالت، توہمات اور تقلید کورانہ نے لے لی۔ عمل اور جدوجہد، تجارت اور کسب معاش اور اکتساب، ہی کا نام حصول دنیا اور بے عمل، عزلت نشینی، اپاہجی اور بےکاری کو عین ''دین'' تصور کیا جانے لگا۔ سکون و عافیت نصب العین بن گیا غرضیکہ پوری قوم پر نسوانیت چھا گئی۔ اس کا فطری نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا ظاہر ہوا۔ اور پوری اسلامی دنیا کی سیاسی طاقت عیسائیوں اور مغلوں کے طوفان کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کے افسانہ باقی رہ گئے۔ نہ وہ تمدن رہا نہ علمی کارنامے اور نہ وہ شکوہ ملک و ہیبت قوم۔

آن قدح شکست و آن ساقی نہ ماند

خلاف راشدہ کے بعد اسلامی سیاست اور نظام حکومت کا زوال تاریخ کا بڑا سانحہ تھا۔ اگر حضرت علیؓ کے بعد اسلام میں امپیریلزم راہ نہ پالیتی تو آج دنیا نہ معلوم ترقی کی کس منزل تک پہنچ جاتی لیکن ایسا ہونا بالکل فطری اور قرین قیاس تھا کیونکہ اس وقت تک عام انسان اتنی تربیت نہ پا سکا تھا اور نہ انسانی فکر نے اتنی ترقی کی تھی کہ وہ اسلامی نظام کی تمام پیچیدگیوں اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتا۔ خلاف راشدہ کے بعد جہاں کہیں مسلم حکومت قائم ہوئی وہ مسلمانوں کی قومی حکومت تھی جس کی بنا نسل خاندان اور مسلم قومیت پر تھی نہ کہ اسلام کے سیاسی اصولوں پر اس قومی حکومت کا کریکٹر خالص ملوکیت پر در تھا جس کی مذمت صاف اور واضح الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔ ملوکیت کی تقریباً ہر شعبہ اور اس کے پیدا کردہ تمام نتائج پر پوری غیر جانبداری کے ساتھ تنقید شدید مفصل طور سے کتاب کے آئندہ صفحات میں کی گئی ہے اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بادشاہ نظام ملوکیت کو پروان چڑھانے اور شاہانہ شان و سطوت میں

Marfat.com

کسی قوم سے پیچھے رہے سوائے اس کے کہ کبھی کسی بادشاہ کو صفات الوہیت سے متصف نہیں کیا گیا۔
لیکن ملوکیت کے علاوہ انسانی زندگی کے ہر اس پہلو میں اور حکومت کے ہر اس شعبے میں جہاں تاج وتخت سلطانی پر کوئی قوم ان کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کارناموں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، عوام کی خوشحالی، تمدن کی ترقی، مذہبی آزادی اور علم وحکمت کی تحقیق میں انہوں نے جس رواداری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال اب تک تاریخ پیش نہیں کرسکی۔ تجزیہ خصوصاً قرآن وحدیث کے تناظر میں ہمیں ان عوامل کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا جو اکثر ہماری ترقی وبالیدگی کی راہیں متعین کرتے رہیں۔

خلاف راشدہ کے بعد اسلامی سیاسی نظام اور انقلابی افکار کو ناقابل برداشت دھچکہ پہنچا۔ بزوال مسلمانوں کی تاریخ میں ایک بہت بڑا نقصان تھا جس کے اثرات مختلف طور پر مختلف امور میں ظاہر ہوتے رہے۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد سامراج اور دیگر تعصب اور تنگ نظری کے خباثات نے مسلمانوں کی زندگی کو مزید آلودہ کردیا اگر یہ اثرات مسلمانوں کی زندگی پر اثر انداز نہ ہوتے تو مسلم تاریخ کی شکل اتنی مسخ نہ ہوگی جتنی کہ آج دکھائی دیتی ہے۔ مزید برآں ملوکیت کے گھناؤنے اثرات بھی زہر قاتل ثابت ہوئے۔

جس کی تاریخ کے ان ادوار میں جہاں یہ اثرات اتنے قبیح نہ تھے وہاں مسلمانوں کے عملی، سیاسی اور تمدنی کارنامے نظر آتے ہیں۔

یہ تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ قرآن کے فلسفہ مباحث سے اخذ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کو مختلف طور سے متاثر کرتا ہے۔ جب بھی مسلمان اس کی حدود سے باہر نکلے تو وہ خسارے میں رہے اور جب انہوں نے اس کے اصولوں کو اپنایا وہ کامیاب ہوئے۔ یہی فلسفہ حسن حیات ہے جو اس کتاب میں ہمارا مرکزی موضوع ہے۔

مسلمانوں کے زوال کی داستان اور حکایات طرب وکدب ایک عرصے سے میرے جذبات و احساسات میں وہ درد وغم پیدا کرتی رہی ہیں جن سے میں پریشان وپشیمان ہوتا رہا اور آخر کار ۱۹۹۵ میں میں نے مضامین اور کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو تا حال بفضل خداوند تعالیٰ جاری وساری ہے۔

Marfat.com

یہ کتابیں میری فکری تسکین اور جذبہ ہم کلامی کا ذریعہ بھی ہیں۔ان کے ذریعہ نہ صرف میں اپنے درد بھرے جذبات کا بھرپور انداز میں اظہار کرتا ہوں بلکہ ان خیالات کو بھی پیش کرتا ہوں جو جدید دور کا تقاضا ہیں اور ہمارے مستقبل کی ضمانت۔

اس کتاب میں یہ غلط فہمی بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدیدیت اسلام میں حرمت ممنوعہ ہے۔حالانکہ حقیقت میں قرآن ہی ایک ایسی روشنی کی کتاب ہے جس میں نظام حیات کائنات کا عقلی اور عملی لحاظ سے احاطہ کیا گیا ہے۔اور ذہنوں کو وسعت بخشی گئی ہے۔

تخلیقی عمل ایک ترقیاتی عمل ہوتا ہے جو تخلیق کاری اور حسن کاری پر مبنی ہوت اہے۔اس کتاب کا مقصد تخلیق کاری اور حسن کاری کے عمل کو مزید محرک کرنا ہے۔قرآن مجید ہمیں ایک ایسا درس دیتا ہے جس کی طرف توجہ دیئے بغیر فلاح و بہبود کے مراحل طے نہیں کیے جاسکتے۔کتابوب کا مطالعہ اس ضمن میں بہت ضروری ہے۔اور یہ بات ہم بار بار شدومد سے دہراتے آئے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے اور فعال بننا ہے تو انہیں کتابوں کو زندہ رکھنا ہوگا اور دینی و دنیاوی علوم حاصل کرنا ہوگے ورنہ تاریخ میں ایک بھیانک مقام میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

ان حقائق کے پیش نظر "**قرآن: فلسفہ حسن و حیات**" ایک ایسی کتاب کی صورت میں ابھری ہے جو زندگی کو انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے خوبصورت اور با مقصد بنانے میں معاون ثابت ہوگی۔اور ہر پڑھنے والے کو ذوق وشوق نظر بھی عطا کرے گی جس سے انسانی عقل، دانش اور سوچ وفکر کے نئے دریچے مزید کھل سکیں گے۔تشدد تعصب اور تنگ نظری کا یہ مقام نہیں ذہنی وسعت ورفعت کی ضرورت ہے۔جو اس کتاب کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔

غلاظتوں سے بھرپور زندگی میں عظمتوں کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم حسن، حیات کے جوہر کو اس کے سانچے میں ڈھال لیں جو ہمیں اس کتاب کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔تب ہی ہم جمال وکمال کے اس درجہ پر پہنچ سکیں گے جس کی راہ قرآن متعین کرتا ہے یہ اس کتاب کا فلسفہ ہے اور یہ اس کی حیات وکائنات جس کا شعار ہمارا مقصود ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید(سورۃ الحجرات:10)

میں واضح کیا گیا ہے کہ مسلم امہ اسی صورت میں ایک عالمگیر قوت بن سکتی ہے جب کہ اس کی اخوت اور بھائی چارے کا جذبہ کارفرما ہو۔مولانا ابوالاعلی مودودی نے اس آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ آیت دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیرووں میں وہ اخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔اس حکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں

Marfat.com

Marfat.com

قرآنی اور یونانی نظریات ﴿باب ۲۴﴾

تخلیق

اور

اسکی منزل مقصود

نظریہ تخلیق قرآن حکیم کا ایک مرکزی موضوع ہے جسے ہم اپنے کئی ابواب میں مختلف مضمرات کے ساتھ لا چکے ہیں۔لیکن چونکہ اس کا تذکرہ اور اس کے مضمرات قرآن کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں اس لئے اس کی مزید وضاحت کیلئے ہم یہاں مغربی نقطہ نگاہ بھی پیش کر رہے ہیں۔تاکہ ہمارے قارئین دیکھ سکیں کہ دونوں نظریات میں کیا مماثلت ہے اور کہاں کہاں اختلاف ہے۔

قرآن ایک واضح نظریہ حیات پیش کرتا ہے انسان اور کائنات کی تخلیق اور اس کے مقاصد کو زیر بحث لاتا ہے۔اور انسان کو وہ راہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو اس کی تخلیق کی منزل مقصود کی جانب اسے لے جانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

یونانی فلسفی چونکہ سوچ وفکر کے انتہائی لطیف اور دقیق راہوں پر گامزن تھے اور تخلیق انساس اور

Marfat.com

کائنات کے مطالعہ اور مشاہدہ میں سنجیدگی سے مصروف عمل تھے اس لئے یہاں ہم نے کچھ ایسے خدوخال پر بحث کی ہے جو یونانی فلسفہ سے متعلق ہیں۔

یونانی فلسفیوں مین افلاطون کا نظریہ تخلیق ایک جامع مضمون ہے جو اس کی کتاب ٹیمیس (Timaeus) میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی بہت زیادہ بیان کی جاتی ہے کہ مختلف کتب میں صرف یہی ایک ایسی کتاب تھی جس کا قرون وسطیٰ کے دوران اہل مغرب کو علم ہوا تھا۔ اس لئے اس نظریہ اور اکتاب کا بہت زیادہ اثر اہل مغرب کی سوچ وفکر پر پڑا اور انہوں نے اس کی بنا پر اپنے نظریات یونانی نظریہ حیات نے کچھ مشرقی مفکرین کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے زمان و مکان کی توضیحات ان نظریات کی روشنی میں کیں۔ انہوں نے یہ بھی کوشش کی زندگی کا مقصد ایک مثبت اور عملی انداز سے واضح کیا جائے۔

دسویں، بارہویں صدی عیسوی تک یونانی اثرات پھلتے نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے مغربی اور مسلم مفکرین کے ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑے۔ مسلمان فلسفیوں اور دانشوروں نے بصرہ اور بغداد میں ایک علمی تنظیم قائم کی جس کے تحت مختلف موضوعات پر مذاکرے منعقد کیے جانے لگے اور مذہب اور فلسفے سے متعلقہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوششیں کی گئیں۔ انہوں نے تعصب اور تنگ نظری کو بالائے طاق لکھتے ہوئے تخلیق کائنات، حیات ابدی اور دیگر موضوعات کا کھل کر جائز لیا تاکہ دقیانوس اور تنگ نظر نظریات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی جا سکے۔

ان کے نظریات زیادہ ثر ارسطو اور افلاطون سے متاثر تھے اور وہ نظریہ علم کی حقائق کے شعور اور علم و دانش کے فروغ کیلئے بروئے کار لانا چاہتے تھے۔

الہامی کلام کے علاوہ وہ ریاضی، منطق اور فلسفے کے بھی داعی تھے۔

انہوں نے نظریات ازیست کائنات اور مذہبی نظریہ تخلیق کے مابین ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

تاکہ مذہب کے نظریات کا ادراک آسانی سے ہو سکے۔

انہوں نے نوفلاطونی نظریات کی روشنی میں تخلیقِ عمل کی وضاحت کی۔

نظریہ تخلیق یونانی فلسفیوں کا پسندیدہ نظریہ رہا ہے۔ جس پر افلاطون، سقواط اور ارسطو نے عقل و ذہانت کے ستونوں پر مبنی ایک دقیق اور گھمبیر ڈھانچہ تعمیر کیا تھا جس کا جائزہ برطانوی فلسفی برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب ''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' میں ''افلاطون کے نظریہ تخلیق'' کے تحت لیا ہے۔ اس کے اقتباسات ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں تاکہ قرآن کا نظریہ تخلیق اپنی جگہ اٹل ثابت ہوا، جس کی تشریحات کئی جگہوں پر ہم نے اپنی کتاب میں کی ہیں لیکن سوچ وفکر کا دھانہ جو یونان سے تقریباً تین ہزار سال پہلے شروع ہوا اور جس نے مغرب کی سوچ کو نئی جہت دی قابل غور ہے۔ اس سے نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ کئی ایسے دریچے بھی کھلیں گے جو تضادات کو جنم دیتے ہیں اور ہمیں قرآن کی روشنی میں ان پر غور و فکر کرنے کا موضوع دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یونانی فلسفی جب یہ کہتے ہیں کہ دنیا چونکہ عالم حواس ہے اس لئے ابدی نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ خدا خیر ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ خواہ انسان بھی خیر ہو اور اسے ابدی بنانے کیلئے اس میں اپنی روح پھونک دی۔

دونوں نظریات کا مطالعہ کرنے سے اس قسم کے کئی موڑ ہماری راہ میں آئیں گے جہاں رک کر ہمیں سوچ وفکر کو جلا بخشنا ہوگی تب ہی ہم ایمان اور عقل کے سہارے مختلف منازل طے کر سکیں گے۔ تاہم عقل کا سہارا مکمل طور پر قابل اعتماد نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسا کہ برٹرنڈ رسل خود کہتا ہے کہ افلاطون کی کتاب (Timaeus) میں کچھ ایسے مکالمات بھی ہیں جو ضعیف العقلی پر مبنی ہیں لیکن تاریخی اور عملی اعتبار سے یہ ایک بہت بااثر کتاب ہے اس لئے اس کے اقتباسات ہماری دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہے۔

افلاطون کے اس سے پہلے مکالمات میں جو مقام سقراط کو حاصل ہے وہ مقام ''ٹیمیئس'' میں ایک فیثا غورثی کو حاصل ہے۔ اور اسی مکتبہ فکر کے نظریات کا اظہار ہے اور (کسی حد تک) یہ نظریہ بھی شامل کر لیا گیا ہے جس کے تحت دنیا کی توضیح کی بنیاد عدد ہے۔ اس میں پہلے تو ''ری پبلک'' کی پہلی پانچ کتابوں کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد اٹلانٹس کی فرضی کہانی ہے۔ یہ ایک خیالی جزیرہ ہے جو ہرکلیس کے ستونوں سے دور دوسری جانب ہے۔ اس کا رقبہ لیبیا اور ایشیا کے مجموعی رقبے سے زیادہ ہے۔ اس کے

Marfat.com

بعد ٹیمیس، جو ایک فیثا غورثی ماہر فلکیات ہے، دنیا کی تاریخ بیان کرنا شروع کرتا ہے جو انسان کی تخلیق تک پہنچتا ہے۔ اس کے بیان کی تلخیص ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

جو غیر متغیر ہے اکا ادراک عقل و ذہانت سے ہوتا ہے اور جو متغیر ہے اس کا رائے سے۔ چونکہ دنیا عالم حواس سے اس لئے ابدی نہیں ہو سکتی، اور اس لئے اسے یقیناً خدا نے تخلیق کیا ہے۔ چونکہ خدا خیر ہے اس لئے اس نے دنیا کو ابدی نمونے کے مطابق بنایا ہے۔ چونکہ خدا میں حسد نہیں ہے اس لئے وہ چاہتا ہے ہر شے ممکن حد تک اس ہی کی مثل ہو۔ ''خدا کی رضا تھی کہ تمام اشیاء خیر ہونی چاہئیں۔ جہاں تک ممکن ہو کوئی شے شر نہ ہو۔'' یہ دیکھتے ہوئے کہ تمام کرہ ساکن نہیں ہے بلکہ بے ترتیب اور بے ہنگم طور پر متحرک ہے، اس نے بے ترتیبی میں ترتیب پیدا کی۔'' (یوں ظاہر ہوتا ہے کہ افلاطون کے خدا نے یہودیوں اور مسیحوں کے خدا کے برعکس دنیا کو نیستی سے تخلیق نہیں کیا بلکہ پہلے سے وجود مادے سے اسے نئی ترتیب دی ہے) اس نے عقل روح میں رکھی اور روح بدن میں۔ اس نے دنیا کو بحیثیت کل ایک زندہ مخلوق بنایا ہے۔ جس میں روح اور عقل ہے۔ دنیا صرف ایک ہے اور متعدد دنیائیں نہیں ہیں جیسا کہ سقراط سے قبل مختلف فلاسفہ سمجھتے تھے۔ دنیا ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ دنیا ممکن حد تک اس دنیا کی نقل کے مطابق تخلیق کی گئی ہے جو حقیقی ابدی دنیا ہے جس کا ادراک خدا نے کیا۔ دنیا بحیثیت کل ایک مرئی جانور ہے جس کے اندر تمام دوسرے جانور شامل ہیں۔ یہ کروی ہے کیونکہ مثل، بے مثل سے زیادہ حسین ہوتی ہے اور صرف کرہ ہی ہر کہیں ہم مثل ہیں۔ یہ گردش کرتی ہے کیونکہ محوری گردش ہی کامل ترین ہے اور چونکہ صرف یہی ایسی گردش ہے اس لئے اسے ہاتھ یا پاؤں کی احتیاج نہیں ہے۔

عناصر اربعہ آتش و آب و باد و خاک، جنہیں ہر ایک کو اپنے عدد سے ظاہر کیا جاتا ہے، وہ ایک مسلسل تناسب میں رہتے ہیں۔ یعنی آگ کا ہوا سے وہ تناسب ہے جو ہوا کا پانی سے اور پانی کا مٹی سے۔ خدا نے دنیا کی تعمیر کے لئے تمام عناصر کو استعمال کیا۔ اس لئے یہ کامل ہے کہ ضعیف العمری اور بیماری سے معرا ہے۔ تناسب کی بدولت اس میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اسی کے باعث اس میں رفاقت کی روح پیدا ہوتی ہے اور اس لئے خدا کے سوا اسے کوئی نہیں معدوم کر سکتا ہے۔

Marfat.com

خدا نے پہلے روح بنائی اور پھر جسم۔ روح مرکب ہے غیر منقسم وغیرہ متغیر اور منقسم ومتغیر کا۔ یہ تیسرا اور درمیانی نوعیت کا جوہر ہے۔

یہاں سیاروں کے متعلق فیثا غورثی نظریہ بیان کیا جاتا ہے جو زماں کی ابتداء کی وضاحت کی طرف لے جاتا۔

''جب باپ وخالق نے زندہ مخلوق، جسے اس نے متحرک بنایا تھا، اور ابدی دیوتاؤں کی تخلیق شدہ صورتوں کو دیکھا تو وہ خوس ہوا۔ اپنی اس خوشی میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اصلی کائنات کی ایسی نقل بنائے جو اصل کے بہت ہی زیادہ ہم مثل ہو اور جیسے کہ یہ ابدی تھی، اس نے چاہا کہ کائنات کو بھی ابدی بنائے۔ اب مثالی وجود کی نوعیت ابدی تھی لیکن اس صفت کو بھرپور طور پر مخلوق کو عطا کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابدیت کا ایک متحرک تمثال (image) بنائے اور جب اس نے آسمان کو ترتیب دے لیا پھر تمثال کو ابدی بنایا لیکن اسے عدد کے مطابق متحرک بنایا جب کہ ابدیت وحدت میں ساکن وساکتہے۔ اس تصور کو ہم زماں کہتے ہیں۔ (۲)

اس سے پہلے شب وروز نہیں تھے۔ ابدی جوہر کے متعلق ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ ''تھا'' یا ''ہوگا'' صرف ''ہے'' کہنا صحیح ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ''ابدیت کے متحرک تمثال'' کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ تھا ہوگا۔

زماں اور ستارے ایک ہی لمحے میں وجود میں آئے۔ خدا نے سورج بنایا تا کہ جاندار علم یارضی سیکھ سکیں......... یہ کہ جاسکتا ہے کہ ''سلسلہ روز شب'' کے بغیر ہم اعداد کے متعلق نہیں سوچ سکتے تھے۔ روز وشب اور ماہ وسال کے منظر نے عدد کا علم تخلیق کیا ہے اور ہمیں وقت کا تصور دیا ہے۔ فلسفہ وجود میں آیا۔ یہ سب سے بڑا تحفہ ہے جس کیلئے ہم بصارت کے احسان مند ہیں۔

(بحیثیت کل دنیا کے علاوہ) چار قسم کے ذی حیات ہیں۔ یہ دیوتا، پرندے، مچھلیاں اور زمین کے ذی حیات ہیں۔ دیوتا زیادہ تر آگ ہیں۔ ساکن ستارے الوحی اور ابدی ذی حیات ہیں۔ خالق نے دیتاؤں کو بتایا کہ وہ انہیں فنا کرسکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا۔ جب خدا نے باقی ذی حیات مخلوق کا

الوحی اور لا فانی حصہ بنالیا تو یہ کام دیواؤں کے سپرد کردیا کہ وہ ذی حیات کا فانی حصہ بنائیں۔ (افلاطون کے ''ٹامیئیس'' میں دیواؤں کے متعلق دوسری عبارتوں کی طرح اس حصے کو بھی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ ابتداء ہی میں ٹامیئیس کہتا ہے کہ اس کے خیال میں غالباً ایسا ہے اور وہ یقین سے ایسا نہیں کہہ سکتا۔ نمایاں طور پر زیادہ تر تفصیلات محض خیالی ہیں اور ان کا لفظی مفہوم مراد نہیں)

ٹامیئیس کہتا ہے کہ خالق نے ہر ستارے کیلئے ایک روح بنائی۔ روحیں احساسات رکھتی ہیں۔ جیسے محبت، خوف اور غصہ۔ اگر وہ ان پر غالب آ جائیں تو وہ راستی سے زندگی بسر کرتے ہیں ورنہ نہیں۔ اگر انسان نیک زندگی گزارتا ہے تو موت کے بعد، خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے، اپنے ستارے میں چلا جاتا ہے۔ اگر وہ غیر صالح زندگی گزارتا ہے تو دوسرے جنم میں وہ عورت کے روپ میں جنم لے گا۔ اگر وہ (یا عورت) پھر بھی بدی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اگلے جنم میں وہ (یا عورت) حیوان ہوگا اور یوں ہی اس وقت تک تناسخ کے عمل سے گزرتا رہے گا جب تک کہ بالآخر عقل مسخر نہیں کر لیتی۔ خدا نے کچھ روحوں کو زمین پر بعض کو چاند پر اور بعض دوسرے سیاروں اور ستاروں پر رکھا۔ اس نے دیوتاؤں کے سپرد کام کیا کہ وہ ان کے بدن تیار کریں۔

اسباب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ وہ اسباب جو عقلی ہوتے ہیں اور وہ اسباب جو دوسرے اسباب سے متحریک ہوتے ہیں اور خود اور دوسروں کو متحرک کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اول الذکر ذہن سے متصف ہوتے ہیں اور بھلے اور خیر کے کام سرانجام دیتے ہیں جب کہ موخر الذکر ایسے اتفاقی اثرات پیدا کرتے ہیں جن میں کوئی تکیب و ترتیب نہیں ہوتی۔ دونوں اقسام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ تخلیق میں دونوں خطوط ہوتے ہیں اور تخلیق کی تعمیر میں جبر اور ذہن دونوں شامل ہوتے ہیں (یہ بات قابل غور ہے کہ جبر خدا کی قوت کے تابع نہیں) اب ٹامیئیس اس حصے کی طرف آتا ہے جو جبر سے متعلق ہے۔ (۲)

خاک و باد و آتش و آب اصول اول یا بنیادی عناصر یا حروف نہیں ہیں وہ پہلے رکن (Syllables) بھی نہیں۔ مثلاً آگ کو ''یہ'' (this) نہیں بلکہ ''ایس'' (such) کہا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آگ جوہر نہیں بلکہ جوہر کی ایک کیفیت ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا عقلی

Marfat.com

جواہر صرف نام ہیں۔ اس کا جواب یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ اس پر منحصر ہے کہ ذہن وہی شے ہے یا نہیں جیسی کہ سچی رائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو علم صرف جواہر کا ہو سکتا ہے اور جواہر محض نام نہیں ہو سکتے۔ اب ذہن اور سچی رائے یقیناً مختلف ہیں۔ کیونکہ اب صرف تعلیم سے قابل حصول ہے اور دوسری ترغیب سے۔ ایک کے ساتھ سچی عقل وابستہ ہے اور دوسری سے نہیں۔ تمام انسان سچی رائے میں شریک ہوتے ہیں لیکن ذہن دیوتاؤں کی صفت ہے اور انسانوں میں بہت کم لوگوں کی۔

یہ بات کسی قدر عجیب نظریہ مکان کی طف لے جاتی ہے یعنی ایک ایسی شے جو عالم جوہر اور عارضی عالم حسیات کے درمیان ہے۔

"ایک وجود اس قسم کا ہے جو ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے غیر مخلوق ہے۔ لافانی ہے۔ باہر سے خود کسی اور شے کو قبول نہیں کرتا۔ نہ ہی خود کسی اور شے کی طرف جاتا ہے۔ بلکہ غیر مرئی اور کسی حس کے ادراک سے ماوراء اور جس کا ادراک صرف عقل کا تفکر ہی کر سکتا ہے۔ اور ایک ہی اسی نوعیت اور نام کا ایک اور وجود ہے۔ یہ مخلوق ہے۔ حسی ادراک کے قابل ہے۔ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مکان میں وجود بنتا ہوتا اور دوبار جگہ سے غائب ہوتا ہے اور دائمی ہے اور لافانی ہے اور تمام مخلوق اشیاء کو گھر مہیا کرتا ہے۔ اور اس کا ادراک حس کی مدد کے بغیر ساختہ عقل سے ہوتا ہے اور مشکل ہی سے حقیقی ہے۔ جسے ہم ایسے دیکھتے ہیں جیسے خواب میں۔ ہم تمام موجودات کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا کسی زمان و مکان میں ہونا واجب ہے۔ لیکن یہ نہ تو آسمان پر اور نہ زمین پر اپنا وجود رکھتا ہے۔"

یہ بہت مشکل حصہ ہے اور جسے میں پوری طرح سمجھ سکنے کا جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں یہ نظریہ جیومیٹری پر تفکر کے نتیجے میں پیدا ہوا ہوگا۔ جیومیٹری کے حساب کی مانند خالص عقل کا معاملہ لگا ہوگا۔ لیکن یہ مکان سے مبرا نہیں اور یہ عالم حسیات کا ایک حصہ ہے۔ عموماً بعد کے فلسفیوں کے لئے ایک طلسمی بات ہے کہ وہ مشابہتیں تلاش کریں۔ لیکن میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانٹ نے اس نظریہ مکان کو ضرور پسند کیا ہوگا جیسے کہ یہ اس کے اپنے نظریئے سے مطابقت رکھتا ہے۔

ٹائمیئس کہتا ہے کہ عالم حسیات کے سچے عناصر خاک و باد آتش و آب نہیں بلکہ دو قسم کی قائمۃ

Marfat.com

الزاویہ مثلثیں ہیں۔ایک نصف مربع ہے اور ایک نصف مساوی الاضلاع مثلث۔ابتداء میں ہر شے خلط ملط تھی اور ''متعدد عناصر مختلف جگہوں پر تھے۔بعدازاں انہیں ترکیب و ترتیب دی گئی تاکہ کائنات کی تشکیل ہو۔'' لیکن خدا نے انہیں صورت اور عدد میں ڈھالا اور انہیں ہیئت بدصورت اور بری اشیاء سے جہاں تک ممکن تھا حسین ترین اور بہترین صورت اور عدد میں تشکیل دی۔'' ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ دو قسم کی مثلثیں حسین ترین صورتیں ہیں اور اس لئے خدا نے عالم حسیات تشکیل دینے کے لئے استعمال کیا۔ان دو مثلثوں کے ذریعے چار یا پانچ باقاعدہ جسامتیں بنانا ممکن ہے اور عناصر اربع کا ہر جو ہر ایک باقاعدہ جسامت ہے۔خاک یعنی زمین کے جواہر مکعب چھ پہلو ہیں۔آگ کے مربع چار پہلو۔ہوا کے ہشت آٹھ پہلو اور پانی کے بیس پہلو۔(میں ابھی بارہ پہلو کی طرف آتا ہوں)

باقاعدہ جسامتوں کا نظریہ اقلیدیس کی تیرہویں کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔افلاطون کے زمانے میں نہ نظریہ حال میں دریافت ہوا تھا۔اس کی تکمیل تھیٹیٹس کے ہاتھوں ہوئی۔تھیٹیٹس کے نام کے مکالمے میں تھیٹیٹس ایک نوجوان کی حیثیت میں ظاہر ہوتا ہے روایت کے مطابق یہ وہ شخص تھا جس نے پہلے یہ ثابت کیا کہ باقاعدہ جسامتیں پانچ ہیں اور اس نے ہشت 8 پہلو اور بست 20 پہلو کو دریافت کیا۔چہار 7 پہلو ہشت 8 پہلو اور بست 20 پہلو باقاعدہ جسامتیں مثاوی الاضلاع شکل میں ہوتی ہیں بارہ پہلو جسامت میں باقاعدہ مخمس ہوتی ہیں۔اس لئے انہیں افلاطون کے دو مثلوں میں سے نہیں بنایا جاسکتا۔اس وجہ سے وہ اسے عناصر اربعہ کے حوالے سے استعمال نہیں کرتا ہے۔

بارہ پہلو جسامت کے سلسلے میں افلاطون کہتا ہے ''ایک پانچواں اتحاد بھی تھا جسے خدا نے کائنات کے اظہار کیلئے استعمال کیا۔'' یہ بات مبہم ہے اور اس سے خیال اس طرف جاتا ہے کہ کائنات کی تکوین بارہ پہلوں جسامتوں پر مشتمل ہے لیکن کسی اور جگہ اسے کرہ 5 کہا گیا ہے۔مخمس شکل جادو میں ہمیشہ اہم رہی ہے،اور بظاہر اس کی یہ صورت فیثاغورث کی مرہون منت ہے۔جس نے اسے ''صحت'' قرار دیا اور اسے جماعت کے ممبران کی شناخت کیلئے بطور علامت استعمال کیا۔5 یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی خصوصیات اس حقیقت سے مستعار لیں کہ بارہ پہلوں جسامت میں مخمس کی شکلیں ہوتی ہیں اور کسی مفہوم

Marfat.com

میں یہ کائنات کی علامت ہے۔ یہ موضع دلکش ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ جاننا کہ کیا صحیح ہے مشکل بات ہے۔

حسیات کی بحث کے بعد ٹائمیس انسان میں دو روحوں کی وضاحت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک روح غیر فانی ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسری فانی جسید یتاؤں نے بنایا ہے۔ فانی روح ''خوفناک اور نا قابل مزاحمت جذبات کے تابع ہے...... جن میں سب سے پہلے تعیش ہے جو بدی کی سب سے بڑی ترغیب ہے۔ اس کے بعد رنج جو نیکی سے دور بھاگتا ہے۔ علاوہ ازیں عجلت اور خوف جو احمق مشیر ہیں، غصہ جسے ٹھنڈا یا دھیما کرنا مشکل ہوتا ہے اور امید جو آسانی سے گمراہ کر دیتی ہے۔ ان جذبات کو دیوتاؤں نے غیر عقلی فہم اور بے خوف محبت کے ساتھ لازمی اصولوں کے مطابق خلط ملط کر دیا اور یوں انسانوں کو بنایا۔''

لافانی روح سر میں ہوتی ہے اور فانی سینے میں۔

جسمانی ساخت بھی عجیب وغریب ہے۔ جیسے آنتوں کا مقصد یہ ہے کہ خوراک کو خود میں رکھ کے بسیار خوری کو روکیں۔ اس کے بعد تناسخ کا ذکر ہے۔ بزدل یا برے لوگ اگلے جنم میں عورتیں ہوں گے۔ معصوم اور خوس دل لوگ جو سمجھتے ہیں کہ علم فلکیات علم ریاضی کے بغیر صرف ستاروں کو دیکھ کر حاصل کیا جاسکتا ہے وہ پرندے بن جائیں گے۔ جن لوگوں کا کوئی فلسفہ نہیں ہے وہ زمین پر وحشی جانور ہوں گے۔ احمق ترین لوگ مچھلیاں بن جائیں گے۔

مکالمے کا آخری پیراگراف یوں بحث سمیٹتا ہے۔

''اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت سے متعلق ہماری بحث کا ایک مقصد ہے۔ دنیا نے فانی اور غیر فانی جانور حاصل کیے ہیں۔ ان سے بھری ہوئی ہے اور ایک مرئی جانور بن گئی ہے جو مرئی کی حامل ہے...... دانا خدا جو تمثال ہے فکر، عظیم ترین، بہترین، حسین ترین، کامل ترین کی...... واحد رف جنا گیا آسمان''۔

یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ ''ٹیمئیس'' کے کس حصے کو سنجیدگی سے لیا جائے اور کس حصے کو محض خام

Marfat.com

خیالی سمجھا جائے۔میرا خیال ہے کہ تخلیق کے متعلق یہ بیان کہ اس کا مقصود ابتری سے ترتیب پیدا کرتا ہے، کو واقعی سنجیدگی سے لینا چاہیے۔اسی طرح عناصر اربعہ کے مابین تناسب اور باقعدہ جسامتوں اور ان کی اجزائی مثلثوں کے باہمی رشتے کو بھی سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

یہ واضح ہے کہ زمان ومکاں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ افلاطون کے اپنے اعتقادات ہیں۔اور یہی بات کہ دنیا کی تخلیق، ابدی اصل کی نقل ہے صادق آتی ہے۔دنیا میں جبر ومقصد کا اختلاط وہ اعتقاد ہے جو عملی طور پر عام یونانیوں کا تھا جو فلسفے کی ابتداء سے بہت پہلے موجود تھا۔افلاطون نے اسے قبول کر لیا اور یوں مسئلہ شر کا ٹال دیا جو مسیحیو یینات کو پریشان کرتا ہے۔میرے خیال میں اس کی حیوان نما دنیا بھی اس کے نزدیک سنجیدہ ہے۔لیکن تناسخ سے متعلق تفصیلات اور وہ حصہ جو دیوتاؤں سے منسوب ہے اور دیگر غیر ضروری باتیں تو، میرے خیال میں، صرف اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ ممکنہ طور پر انہیں محسوس ہونا بنایا جائے۔

جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ تمام مکالمے کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کا قدیم اور قرون سطی کی فکر پر گہرا اثر پڑا ہوا ہے اور یہ اثر اس حد تک نہیں رہا جو کہ کم سے کم وہم وگمان ہے۔

برٹرنڈرسل۔فلسفہ مغرب کی تاریخ: لندن

1- Islam & Western Civilization.
2- The Quran & Modernism.
3- Decline of the Muslim Ummah.
4- Terrorism in Action: Why blame Islam.?
5- Islam & Clash of Civilization.
6- Pakistan in crises from dictatorship to democracy.
7- The Muslim Delusion.
8- قرآن، فلسفہ حسن وحیات (اردو)
9- امت مسلمہ کا زوال
10- Islam & the Muslims an encounter between rationalism & fanaticism.

Marfat.com

قرآن حکیم

فلسفہ حُسن وحیات

اقبال سید حُسین

عظیموں کی دنیا میں عظمتوں کی تلاش

Marfat.com